TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_224057
UNIVERSAL LIBRARY

۷۸۶

ثمرۃ الادب

جلد (۱) نمبر (۱)

شعبان ۱۳۴۶ھ

Checked 1975

یعنی

انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم علیا کا ایک ماہوار علمی اور اخلاقی رسالہ

جو

زیر نگرانی مولانا مولوی محمد حمید الدین صاحب بی۔ اے صدر دارالعلوم علیا

زیر ادارت

مولوی محمد عبد الواسع صاحب صفا نائب شیخ الحدیث والتفسیر

حیدر آباد دکن سے شائع ہوتا ہے

باہتمام

محمد نصیر الدین عبد الباری معتمد انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم

مطبوعہ صدر المطابع سلطان شاہی حیدر آباد دکن

ا ف
1966
Checked 1969

قواعد رسالہ

۱۔ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے وسط میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ رسالہ میں علمی اور اخلاقی مضامین شائع کئے جائینگے۔

۳۔ رسالہ کی سالانہ قیمت (ے) مع محصول ڈاک فی پرچہ ۴ر

۴۔ تمام خط و کتابت بنام منیجر ہونی چاہیئے۔

۵۔ جواب کے لئے جوابی کارڈ آنا ضرور ہے۔

۶۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور چاہیئے۔

۷۔ شکایت عدم وصول دو ہفتہ کے اندر آنی چاہیئے ورنہ منیجر تلافی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۸۔ پرچہ صرف پیشگی قیمت وصول ہونے پر یا بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	حمد	مولوی احمد حسین صاحب امجد	۱
۲	نعت	نواب فصاحت جنگ بہادر	۱
۳	تمہید	ایڈیٹر	۲
۴	رسائل کے مقاصد و اغراض	؍؍	۲
۵	مقدمہ کلیات میر تقی میر	مولوی عبد الحق صاحب بی اے	۱۲
۶	تجربہ برق کی ابتدا	چودھری مولوی برکت علی صاحب بی ایس سی	۷

ثمرۃ الادب

حمد

(از مولوی سید احمد حسین صاحب امجد (دارالعلوم))

صنعت تری ہر خار دکھا دیتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یارب
پتہ پتہ تیرا پتا دیتا ہے

نعت

(از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل)

اللہ رے رسول عربی کا پایا
رتبہ یہ بشر نے نہ ملک نے پایا
گو سر پہ دو عالم کے رہے سایہ فگن
لیکن نہ کسی آنکھ نے دیکھا سایا

تمہید

تمام اہل ملک کو بخوبی معلوم ہے کہ دارالعلوم سرکار عالی مملکت آصفیہ میں سب سے پہلی درس گاہ ہے جو علوم شرقیہ کے تعلیم اور اشاعت کیلئے تقریباً آج سے ۷۴ سال قبل قایم ہوئی تھی اور جس نے ملک کے لئے ایسے ثمرات بہم پہنچائے جنہوں نے ناموری اور تدبیر سے اعلیٰ خدمات سلطنت انجام دیں بلکہ دارالعلوم اس بات پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے کہ تقریباً نصف صدی تک اسی گلستان علم کے نونہال مجلس وزراء کے اجزاء غالب تھے جن کی آخری یادگار وہ مقدس فرو فرید تھے جو ابھی کچھ روز ہوئے ملک اور اہل ملک کو مفارقت دائمی کا داغ دیکر وصال فرماگئے۔ دارالعلوم کے تین دور ہوئے ہیں پہلے دور میں یہاں درس نظامیہ رائج تھا اور بالکل قدیم اصول پر علوم نقلی وعقلی کی تعلیم ہوتی تھی اسی دور کے تعلیم یافتہ وہ حضرات ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہوا لیکن جب انگریزی تعلیم کے رائج ہو جانیکی وجہ سے دارالعلوم کی رونق کم ہونے لگی تو مدبران سلطنت نے اس کا بہترین علاج یہ تصور کیا کہ دارالعلوم کا نظام تعلیم بدلکر وہ پنجاب یونیورسٹی سے ملحق کردیا جائے یہ تدبیر وقتی کارگر ثابت ہوئی اور دارالعلوم کی رونق میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اُسی وقت سے اِس کا دور شروع ہوتا ہے اسی دور میں کار پردازان کالج نے طلبہ میں علمی ادبی تحریروں وتقریروں کا شوق

پیدا کرنے کے لئے ایک انجمن بنام "ثمرۃ الادب" قایم کی جو تقریباً
اس دور کے ختم تک اپنا کام کرتی رہی۔ جب کروڑ یونیورسٹی لی کے
بنا پر دارالعلوم پنجاب یونیورسٹی سے جدا ہوگیا اور اُسکے امتحانات
کا منجانب سرکار عالی یہاں بندوبست کیا گیا تو دارالعلوم کی رونق
پھر روز بروز گھٹنے لگی جس کا احساس بہت جلد ہؤا اور اہل حل وعقد
غور کر کے فوراً اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ ملکی یونیورسٹی قایم کئے
بغیر تنزل نہیں رُک سکتا جسکی ابتداء اس طرح ہونی چاہیئے کہ دارالعلوم
اُس یونیورسٹی کا مرکزی کالج قرار دیا جائے اور اُسکے ماتحت مدارس فوقانیہ
وشرقیہ ملک میں کھولے جائیں اور دارالعلوم کے موجودہ نصاب تعلیم کے
بجائے ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کیساتھ
علوم جدیدہ کی تعلیم بھی شریک کی جائے اس مقصد کی تکمیل کے لئے
مولوی شبلی مرحوم طلب کئے گئے اُن کے آنے کے بعد ایک کمیٹی انتخاب
کی گئی جس نے نصاب مرتب کیا جو بعد منظوری سرکار جاری کیا گیا اُسوقت
سے دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہؤا اس دور میں دارالعلوم نے میدان
ترقی کے طرف بڑہنا شروع کیا میدان ترقی میں اس کا پہلا قدم انجمن ثمرہ الادب
کا بیدار کرنا تھا جو زمانہ تنزل میں خواب خرگوش میں محو ہوگئی تھی اس
انجمن کی بیداری سے ملک کو اور کالج کو بہت فائدہ پہنچا اور طلبہ میں تقریر
و تحریر کے مشق کا شوق پیدا ہوگیا ترقی کا دوسرا قدم انجمن کے ماہواری
لکچروں کا انتظام ہے اِن لکچروں کے جلسوں میں لائق تر اشخاص
لکچر دیتے ہیں اور دارالعلوم کے طلبہ کے علاوہ عام اشخاص شریک
ہوکر اُن تقریروں سے مستفید ہوتے ہیں ترقی کا تیسرا قدم قیام

حلقۂ قرآن ہے ماہواری لکچروں کے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ قرآن مجید کے متعلق لوگوں کو جو شکوک ہوں اُن کے رفع کر دینے کیلئے کوئی ہفتہ وار مجلس قایم کیجائے اور یہ تجویز پاس ہوگئی جسکی بنا پر اس مجلس کا قیام ہفتہ وار دارالعلوم میں ہوتا ہے اور اہل شہر اس سے مستفید ہورہے ہیں۔ ترقی کا چوتھا قدم رسالہ ثمرۃ الادب کا اجراء ہے دو سال قبل انجمن کے سالانہ جلسہ میں جناب سید راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات سرکار عالی صدر نشین جلسہ نے یہ تحریک پیش فرمائی کہ اس انجمن سے ایک علمی رسالہ ماہوار شایع ہونا چاہیئے جس کیلئے جناب موصوف نے معقول رقم امداد کے طور پر عطا فرمائی۔ اراکین ثمرۃ الادب نے جن کے دلوں میں یہ شوق مدت سے گھر کئے ہوئے تھا صدق دل سے خیر مقدم کیا جو آپ لوگوں کے سامنے اس تمہید کے ذریعہ سے پیش کیا جاتا ہے اس رسالہ کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے لایق اساتذہ کے تحقیقاتوں کی اشاعت تاکہ اہل ملک اس سے فائدہ حاصل کرسکیں اور ان کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہماری تعلیمی مشین کس رفتار پر چل رہی ہے۔

۲۔ طلبہ کے خیالات کا ملک کے سامنے پیش کرتے رہنا تاکہ اولیاء کو اپنے اقربا کی تعلیمی ترقی کا وقتاً فوقتاً علم ہوتا رہے اور ہمارے اہل ملک پر ظاہر ہوتا رہے کہ ہماری یونیورسٹی طلبہ کو صرف کتابیں پڑھاکر اسناد ہی نہیں دیتی ہے بلکہ اُس کے ساتھ اُن کو علمی تلاش و تجسس کا بھی خوگر بناتی ہے۔

۳۔ ماہواری لکچروں کی اشاعت تاکہ جو لوگ اُن جلسوں میں شریک نہ ہو سکے ہوں وہ بھی اِن لکچروں سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

۴۔ حلقۂ قرآن کے سوالات وجوابات کا شایع کرنا تاکہ لوگوں کو اس حلقہ کی کارروائی سے واقفیت ہوتی رہی اور جو علماء ان سوالات وجوابات کے متعلق اظہار خیالات فرمانا چاہیں اُن کو اُس کا موقع ملسکے

اِن مقاصد کے معلوم ہو جانے کے بعد یہ کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ کہ ثمرۃ الادب ایک علمی رسالہ ہے جو ایک اعلیٰ علمی درس گاہ سے شایع ہو رہا ہے لہٰذا ذمہ داران اشاعت کی ہمیشہ یہ کوشش رہیگی کہ وہ بہترین معلومات کا ذخیرہ ہو اور علوم مشرقیہ اور مغربیہ کے بیش بہا جواہر قوم وملک کے سامنے پیش کرتا رہے گو اِس میں عوام کے لئے دل آویزی نہوگی جو ایک گلدستۂ عشق یا ناولانہ مضامین میں ہوتی ہے مگر وہ بہترین معلومات کا خزانہ ہوگا جس سے دماغ انسانی حقیقی فوائد حاصل کریں گے اور ہماری آئندہ علمی ترقیوں کے لئے سچے رہبر کا کام دیگا اسلئے قوی امید ہے کہ یہ رسالہ اپنے مالک کے دربار دُربار سے خلعت حاصل کریگا اور اہل ملک کے آنکھوں میں اپناگھر بنائیگا فقط

رسائل کے مقاصد و اغراض

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یورپ کے موجودہ روز افزوں تمدنی اقتصادی اور علمی ترقی میں رسائل اور جرائد کی اشاعت کو بڑا دخل ہے میدان ترقی میں قدم رکھنے کے لئے سب سے ضروری شرط وسعت نظر ہے اور وسعت نظر حاصل ہونے کے لئے دو امر لازمی ہیں اولاً تحصیل علوم کی تکمیل سے دماغی قوائے فکریہ کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ غور و خوض کی عادی ہو جائیں اور ہمیشہ ترتیب افکار کے ذریعہ سے صحیح نتائج حاصل کیا کریں۔ ثانیاً معلومات عامہ اور خیالات طبقات مختلف کا بیش بہا ذخیرہ جمع کیا جائے اور اس میں زمانہ کی رفتار کے موافق روز افزوں ترقی ہوتی رہے امر اول سے وسعت نظر کا اصول بالقوی اور امر دوم سے بالفعل ہوتا ہے لہذا اگر ہم امر اول کو وسعت نظر کا قالب قرار دیں تو امر دوم کو اس کی جان کہنا چاہیئے اور چونکہ جان مدار حیات ہے لہذا قومی ترقی کے لئے امر دوم زیادہ مہتم بالشان چیز ہے۔ اس بیان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جس قوم کے پاس عام معلومات اور ماہرین کے خیالات کا ذخیرہ نہ جمع ہو وہ شاہ راہ ترقی سے بہت دور ہے۔ اور جس قوم کے پاس اس قسم کا خزانہ تو ہو مگر اس میں اضافہ نہ ہوتا ہو وہ شاہ راہ ترقی پر حالت سکون میں کھڑی ہے۔ اور جس قوم کے پاس یہ دولت بھی ہے اور اس میں زیادتی بھی

ہوتی رہتی ہے وہ عروج کمال کی طرف دوڑ رہی ہے اگر علوم و خیالات میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا تو اُس پر عبور حاصل کرنے کیلئے صرف تعلیم اور مطالعہ کتب کافی تھا لیکن یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ معلومات کا سلسلہ کسی حد تک پہنچ کر نہیں رکتا اس لئے علوم کی تحصیل بھی انتہا کو نہیں پہنچ سکتی اور جس کو ایک وقت انتہائے کمال خیال کیا جاتا ہے کچھ ہی عرصہ میں کمالات علمی کا دائرہ اُس سے بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ نیز ایک زمانہ میں جو امور تحقیقات سے ثابت ہوتے ہیں وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور چونکہ انسان کی قوت نظری ناقص اور ناکمل ہے اس لئے کسی تحقیق کے متعلق یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ اب اس میں تغیر نہ ہوگا۔ ان وجوہ سے صرف تعلیم اور کتب بینی اس مقصد کا مکمل ذریعہ نہیں ہیں بلکہ اِن کے علاوہ جدید تحقیقوں اور تازہ انکشافوں پر وقوف حاصل ہوتے رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ نیز معیار ترقی پر پہنچنے کے لئے تبادلہ خیالات کی بھی بجد ضرورت ہے اور نئے اکتشافوں کی واقفیت اور تبادلہ خیالات کا بہترین ذریعہ اخبارات اور علمی رسائل ہیں اِس کے ذریعہ سے انسان ایک مقام پر رہکر تمام دنیا کے اقوام کے تحقیقات جدیدہ کا حال معلوم کرسکتا ہے اور ہر گوشہ عالم کے رہنے والوں سے تبادلہ خیالات کرسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آجکل جو قومیں میدان ترقی میں گوئے سبقت لے گئی ہیں اُن میں جرائد اور رسائل کی اشاعت بھی مسابقت کے تناسب سے روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ یورپ اور امریکہ

میں شاید کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جہاں سے جرائد ورسائل کی اشاعت
نہ ہوتی ہو۔ ابتداءً جرائد و رسائل کی اشاعت کا مقصد تقریباً متحد
تھا مگر تہذیب و تمدن میں جسقدر ترقی ہوتی گئی جرائد و سائل کے
مقاصد میں امتیاز پیدا ہوتا گیا بالآخر جرائد کا مقصد واقعات عالم
کے اشاعت اور رسائل کی غرض ادبی علمی اقتصادی سیاسی تحقیقات
کی اشاعت قرار پائی۔ ابتداء جو رسائل شایع ہوتے تھے اُن کا
تعلق کسی شعبہ فن سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر فن کے متعلق ہر
رسالہ میں مضامین شایع ہوسکتے تھے یہ رسائل اگرچہ جامعیت
کی حیثیت سے نہایت عمدہ ہوتے تھے اور خصوصاً ایسے لوگوں
کے لئے زیادہ مفید تھے جو ایک دو رسالوں سے زیادہ کا
بدل اشتراک نہیں ادا کرسکتے ہیں اِس لئے کہ ایک رسالہ کا
خریدار بن کر وہ ہرفن کے متعلق جدید معلومات اور نئے انکشافات
سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتے ہیں مگر اِس کے ساتھ ہی ان رسالوں پر
طلب الکل فوت الکل کی مثل صادق آتی تھی اور اِن میں
بڑا عیب یہ تھا کہ موضع کی تعمیم اور حجم کے محدود ہونیکی وجہ سے
کسی خاص شعبہ فن کے متعلق مکمل تحقیقات نہیں شایع ہوسکتی تھی
اور صرف اقتباسات کی اشاعت پر کفایت کرنی پڑتی تھی جس
سے مشتاقان علوم کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی اسلئے لامحالہ اشاعت
رسائل میں موضوع کی تعمیم چھوڑ دینا پڑی اور جو کام ایک رسالہ
سے لیا جاتا تھا وہ تین رسالوں سے لیا جانے لگا اور رسائل کے
تین قسمیں ہوگئے۔ ادبی۔ حکمی۔ تمدنی و اقتصادی اِس کے بعد

تحقیقات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا اور اکتشافات میں جتنی زیادتی ہوگئی اُس لحاظ سے رسائل کی کثرت اور اُنکے موضوع میں تخصیص ہوتی رہی حتیٰ کہ آجکل کوئی شعبۂ فن ایسا نہیں ہے جسکے متعلق امریکہ اور یورپ کی ہر سلطنت سے ماہوار اور ہفتہ وار رسالے نہ شایع ہوتے ہوں بلکہ امریکہ نے تو تنویع شعبہائے فنون کی انتہا کردی یہانتک کہ زراعت اور صنعت و حرفت کے ہر شعبہ کو ایک مستقل فن بنا دیا جن میں ہرایک کے متعلق متعدد ماہوار اور ہفتہ وار رسالے وہاں سے شایع ہوتے رہتے ہیں مثلاً شہد کی مکھیونکی داشت کے متعلق متعدد رسالے نکلتے ہیں ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے متعلق کئی رسالے شایع ہوتے ہیں بہرحال یورپ اور امریکہ کی ترقی اور رسائل کی اشاعت میں اس قسم کا ملازم ہو گیا ہے کہ ہرایک کا دوسرے سے انفکاک اگر محال عقلی نہیں تو عادتاً ضرور ناممکن ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ترقی میں تبادلہ خیالات کو بڑا دخل ہے۔ اور تبادلہ خیالات کا بہترین ذریعہ رسائل ہیں۔

بیانات سابقہ کو بغور پڑھنے سے ہر ذی فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ یورپ میں تعلیم اور اشاعت رسائل لازم و ملزوم ہیں اور اِن دونوں میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ تعلیم کی تکمیل مطالعہ رسائل کے بغیر تقریباً ناممکن خیال کیجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم جدید کا سیلاب یورپ سے چلکر ایشیا کے چند ملکوں میں گیا وہ اشاعت رسائل کی نسیم خوشگوار کو بھی وہاں اپنے ساتھ لیتا گیا امریکہ کا حال ہم بیان کرچکے جاپان کا بھی یہی حال ہے ہندوستان جب

۱۸۵۷ء کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوا اور انوار علوم جدیدہ سے کسب ضیاء کرنے لگا تو اشاعت جرائد و رسائل کی برقی رَو یہاں بھی کام کرنے لگی مگر چونکہ ہندوستان مختلف المذاہب اور مختلف اللسان اقوام کا مجموعہ ہے نیز علمی ترقی میں وہ ممالک متمدنہ سے بہت پیچھے ہے اس لئے یہاں رسائل کا شیوع موضوع کے اعتبار سے نافذ خواہ نہ ہو سکا بلکہ زبانوں کے اعتبار سے کیا گیا۔ ہندوستان کی کوئی مروجہ زبان ایسی نہیں ہے جس میں اخبار اور رسالے نہ شایع ہوتے ہوں۔ اور میں نے سُنا ہے کہ بنگالی زبان میں تو رسائل کی اشاعت ایسے اصول پر ہوتی ہے جیسے یورپ اور امریکہ میں ہے۔ ہندوستان کی سب سے وسیع زبان اُردو ہے اور اس لحاظ سے یہ ہونا چاہیئے تھا کہ رسائل کی کثرت اُردو میں ہو اور ایسا ہی ہے یہی اکناف ہند سے جتنے رسالے اردو زبان میں شایع ہوتے ہیں شاید کسی دوسری زبان میں نہیں شایع ہوتے لیکن چونکہ ملک میں ابھی علمی مذاق عام نہیں ہوا ہے اور ادبیت کی طرف عام رجحان ہے اس لئے علمی رسالوں کے بجائے ادبی رسالوں کی اشاعت بھی بکثرت ہے۔ اور وہی اکثر کامیاب بھی ہیں تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو میں علمی رسالوں کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ علمی رسالوں کے مقابلہ میں ادبی رسالے زائد ہیں مسلمانوں کے علوم جدیدہ کے قومی مرکز علیگڈھ سے جتنے رسالے نکلے وہ تقریباً علمی تھے جن میں سے بعض تو ابتک شایع ہوتے ہیں اور بعض کی اشاعت

کسی وجہ سے بند ہوگئی ہے بلکہ ہندوستان میں رسالوں کی اشاعت ایسی مقبول ہوئی کہ علوم قدیمہ کے دلدادہ مقدس بزرگوں نے بھی اشاعت علوم قدیمہ کے لئے اس کو بہترین ذریعہ خیال کرکے اختیار کرلیا۔ قاسم العلوم دیوبند۔ **الامداد۔ الندوہ** ۔ اہل حدیث معارف۔ وغیرہ ہمارے قول کے شاہد عدل ہیں۔

سلطنت آصفیہ میں علمی بیداری کے ساتھ ہی اخباروں اور رسالوں کی اشاعت شروع ہوئی۔ اخبارات میں بعض تو صرصر حوادث کے نذر ہوگئے اور بعض کو رجحان عام کی بنا پر ثبات اور استقلال نصیب ہوا جو ابتک جاری ہیں اور اُن کے بالاستقلال جاری رہنے کا تعین ہے۔ رسائل علمی ملک میں مذاق خاطر خواہ نہونیکی وجہ سے قبول عام نہ حاصل کرسکے اور اُن کو یا بند ہو جانا پڑا یا اپنا موضوع بدلکر اخبار میں جانا پڑا لیکن پھر بھی دو ایک رسالے ابتک بلدہ سے نہایت آب و تاب سے نکل رہے ہیں اور ان میں ثمرۃ الادب نے ایک کا اضافہ کردیا ہے۔

اور چونکہ ملک میدان ترقی میں گام زن ہے اس لئے قوی امید ہے کہ اہل ملک میں ترقی علمی کے خیالات جس قدر وسیع ہوتے جائینگے اُسی تناسب سے علمی رسائل کی اشاعت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہیگی۔

اڈیٹر

مُقدمہ

کلیات میر تقی میر

(از مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے ناظم سررشتہ تالیف و تراجم)

ذیل کا مضمون ہندوستان کے مایۂ ناز فرد مولوی عبدالحق صاحب کلیات میر تقی میر (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) کے لئے قلمبند فرمارہے تھے ہماری گذارش پر مولوی صاحب نے ہمیں عنایت فرمایا ہے اس عنایت کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مینیجر

جہان سے دیکھئے یک شعرِ شور انگیز نکلے ہے۔
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر تقی میر۔ سرتاج شعرائے اردو ہیں۔ اُن کا کلام اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کیجائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا پڑیگا۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے موزونی طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین کے لئے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اُردو کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا ان کا احسان اُردو زبان پر تا قیامت قایم رہیگا اور اُن کے کلام کا لطف کبھی

کم نہ ہوگا۔

میر صاحب جیسا کہ خود انہوں نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے "متوطن اکبرآباد است بسبب گردش لیل و نہار از چندے درشاہجہاں آباد است" علی ابراہیم کے تذکرہ گلزار ابراہیم جس کا ترجمہ میرزا علی لطف نے مسٹر جان گلاسٹ کی فرمائش سے اردو میں کیا ہے۔ یہ لکھا ہے "میر تخلص نام نامی اس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبرآباد کے۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتداء سن شعور سے پرورش انہوں نے دارالخلافہ شاہجہاں آباد میں پائی۔ اور خانِ مذکور کی صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اُٹھائی ہے۔ غرض یہ کہ اگرچہ میر صاحب اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور اُن کے لڑکپن کا زمانہ بھی وہیں گذرا۔ لیکن بعد میں وہ دہلی چلے آئے اور دلی ہی کو اپنا وطن بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن کو دلّی سے نہیں بلکہ دلّی کو ان کے توطن سے فخر ہے۔ پھر وہ دلّی ہی کے ہوگئے اور دلّی ہی کے کہلائے۔ اور ان کی زبان بھی جو اُس زمانہ میں مایۂ افتخار اور شرافت کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی دلّی ہی کی تھی۔ گو انہوں نے خان آرزو کی صحبت سے فیض پایا مگر اُن کے اور خان مذکور کے ذوق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ میر صاحب فطرتی طور پر شاعر واقع ہوئے تھے اور ذوق شعر ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

وہ کسی کی صحبت یا شاگردی سے مستغنی معلوم ہوتے ہیں۔

دلی کا مطلع اس وقت دھندلا ہورہا تھا ادبار و انحطاط کا سامان ہوچکا تھا اولوالعزم تیمور اور بابر کی بے حس اولاد انکے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح متمکن تھی اقبال جواب دے چکا تھا اور سیاہ روزوال انکے گرد وپیش منڈلا رہا تھا جہاں پادشاہ خود دست نگر اور امیر امرا مضمحل اور پریشان ہوں وہاں کمال کی قدر کون کرسکتا ہے باوجود اس کے اُس عہد کے تمام باکمال اور نامور شاعر جنکا نام اُردو زبان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیگا اِسی شہر دلی کے تھے اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ شہر ہی عجیب و غریب نظر آتا ہے زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا۔ کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راجدھانی کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافہ کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا۔ اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا۔ کبھی معرکہ جنگ و جدل و قتل عام ہے۔ اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے۔ کبھی مد نظر شاہان و مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی سنک سے خاما کھنڈر ہے کبھی مورد بلئیات وآفات ہے اور کبھی منزل برکات و حسنات۔ غرض یہ نگری یونہی اجڑتی اور بستی۔ بگڑتی اور بنتی رہی۔ مگر باوجود اُس کے حسن عالم افضا میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی اور ہر حادثہ کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن آخر زمانہ میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہوگئیں۔ تو

دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہوگیا۔ سب سے اول
نادر شاہی طوفان کا تھپیڑ ایسا لگا کہ اُس نے بٹھا ہی تو دیا
اِس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درّانی کی چڑھائی ہوئی
پھر مرہٹوں نے وہ اُدھم مچائے کہ رہا سہا سب خاک میں
ملا دیا۔ اب تک جو باکمال دلّی میں پڑے وضعداری نباہ رہے
تھے۔ اِن حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹِک سکے۔ سوائے
ایک میر دَرد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ گلشن ہند
کہتے ہیں۔

"جن ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا اور ہر ایک کوچہ
اُس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان
عدیم المثال سے رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت نعیم
تھا تو معمورے ہر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور اس
خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا جب کہ متواتر
نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود باغیات کے سبب
خراب ہؤا۔ اَور مصدر عقوبت و عذاب ہؤا تو ہر ایک درویش
گوشہ نشین نے اَور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے اَور ہر ایک
تونگر مالدار نے اَور ہر ایک امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت
جانا اُور بھاگے ادھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار
کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا۔ اُس قطب آسمان استقلال
نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا۔ متحمل بلاؤں کے اَور
حامل جفاؤں کے ہوئے اَور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ

اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹیک نکل جاتی ہے دہلی کے اجڑنے کے بعد لکھنو آباد نظر آتا تھا آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا اہل کمال کی قدر ہونے لگی پھر تو جو اٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خان آرزو پہنچے۔ اس کے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں دہلی سے کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دہلی سونی ہوگئی اور میر حسن۔ میر سوز جرأت سب لکھنؤ میں جا بسے اور دہلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی +

(باقی آئندہ)

طبیعیات

شعبۂ برق کی ابتدا

(از مولوی برکت علی صاحب بی۔ ایس۔ سی سابق پروفیسر علیگڈھ کالج حال مترجم علوم طبیعیات عثمانیہ یونیورسٹی)

انسانی فطرت کا یہ کسقدر عجیب راز ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ انسان کی عادت میں داخل ہو جاتی ہے یا جس قدر زیادہ کثرت سے اُسکی نگاہ کے سامنے رہتی ہے اُسی قدر انسان اُس کو زیادہ بے توجہی کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اُسکی حقیقت اکثر ایک سرِ مکتوم بنکر رہجاتی ہے اس کارخانۂ قدرت کے بے شمار حقائق ہیں جنکے کسی نہ کسی پہلو کی مہر روزنہ انسان کی نگاہ کے سامنے نمایش رہتی ہے اور انسان اُنھیں نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا انسان کے اس تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہن کے اسقدر ارتقاء پر بھی سیکڑوں حقیقتیں اُسکی نگاہ سے پوشیدہ رہجاتی ہیں اور وہ اُن کو کارخانۂ قدرت کا بھید سمجھ کر ٹال دیتا ہے۔

حرارت مظاہر قدرت میں سے ایک ایسا مظہر ہے کہ اس نے ابتدائے آفرینش ہی میں انسان کو اپنی ہستی کا ثبوت دیدیا ہوگا۔ لیکن آج بھی وہ لوگ کتنے ہیں جو اس

ہزار در ہزار بے توجہی کے عالم میں کبھی اپنے دل سے یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ آخر یہ چیز کیا ہے؟ آج ہم اس بات کا پتہ لگانا چاہیں کہ وہ چیز جسے ہم آگ کہتے ہیں اُن سے بنی نوعِ انسان کی نگاہیں پہلے پہل کب آشنا ہوئیں تو اس واقعہ کی ابتدا پر قدامت کے اتنے پردے پڑے ہیں کہ تحقیق تو ایک بڑی بات ہے وہاں تک توسنِ خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں لیکن اتنی مدت کی واقفیت کے بعد بھی انسان اُس کی اصلیت پر متوجہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ فن سائنس کا وہ شعبہ جو حرارت کے نام سے موسوم ہے اُسکی ابتدا ابھی کل کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آگ کی اصلیت کا مسئلہ یونانیوں یا ہندؤں کے وقت میں یا اس سے بھی کچھ پہلے پیدا ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں نے بحث کو اس انداز سے اُٹھایا کہ بحث کا وہ حصہ جو بدیہیات سے ہونا چاہیئے تھا وہ بھی تخیل کے ایچ پیچ اور الفاظ کی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا۔

انسان نے پہلے پہل جب کھانیکی چیزوں کو ہنڈیا کے اندر پانی میں ڈالکر پکانا سیکھا ہوگا تو اُس کے بعد بہت جلد یہ حقیقت بھی اُسکی نگاہ کے سامنے آگئی ہوگی کہ پانی سے پیدا ہونیوالی بھاپ ہنڈیا میں زور کرتی ہے تو ڈھکنے کو اچھال دیتی ہے۔ لیکن کتنی ہیں وہ ذی شعور ہستیاں جو اس واقعہ پر عالمانہ رنگ میں متوجہ ہوئیں اور استدلال کے زور سے اُس کے پس وپیش پر حاوی ہوگئیں۔ **دخانی کلوں** کے

کارنامے آج ہر کہ ومہ کی نگاہ میں ہیں۔ ان کلوں کے وجود نے دنیا کے کاروبار میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ دنیا کا وہ حصہ جو ان کلوں کا مالک تھا قوت اور شوکت کے آسمان پر پہنچ گیا اور جو ان کا مالک نہ ہوا اُسکا نام و نشان تک مٹ گیا یا غلامی کی زنجیروں میں پھنس کر رہ گیا لیکن اِس "دنیا کا نقشہ بدل دینے والے" ساز و سامان کی بنا کس اصول پر ہے؟ اِس کے لئے وہی ہنڈیا اور بھاپ کی مثال دیکھ لو۔ یہ واقعہ ہمیشہ انسان کے تغافل پر شاہد رہیگا کہ دُخانی انجن ابتداءً ایک سو بیس سال قبل مسیح ایجاد ہؤا اور اُسوقت سے لیکر اُس زمانہ تک کہ یورپ میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے دنیا کی کوئی قوم اور کسی قوم کا کوئی فردِ بشر اس حیرت انگیز ایجاد سے فائدہ اٹھانے پر متوجہ نہ ہؤا اس ایجاد کا شرف اسکندریہ کے ہیرو نامی ایک صاحبِ ہمت کا حصہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہیرو نے اپنے دستِ صنعت سے تیار کرکے جو کچھ دنیا کے سامنے رکھا وہ محض ایک کھلونا تھا لیکن پھر اس میں بھی تو شک نہیں کہ یہ کھلونا اپنے اصول کی شوکت دنیا کو صاف صاف دکھا رہا تھا اصول صاف ہوچکا تھا، اُسکی کارگزاری بھی نگاہ کے سامنے تھی صرف اس خیال کا پیدا ہونا باقی تھا کہ اس ایجاد سے کیا کام لیا جائے؟ اور کس طرح کام لیا جائے؟ لیکن صدیاں گزر گئیں اور یہہ خیال پیدا نہ ہو سکا۔

یہ خیال پیدا ہو جاتا تو پھر کوئی مشکل باقی نہ تھی وہ سادہ مشینیں جو فن حیل کی زبان میں "قوائے آلیہ" کے نام سے مشہور ہیں، اُنکے اصول بھی اسی تغافل کے زمانہ میں حل ہو چکے تھے اور یہی "قوائے آلیہ" ہر انجن کی جان ہیں پھر دنیا میں جدت طراز مہندسوں کی بھی کمی نہ تھی یہ واقعات نگاہ میں ہوں تو یہ فیصلہ بیجا نہیں کہ دُخانی انجن کا اصول طے ہو چکا تھا پھر انجن کو ترتیب دینے اور اس اصول سے فائدہ اٹھانے کیلئے جو سروسامان درکار ہے وہ بھی موجود تھا صرف انسانی دماغ میں ایک خیال کا پیدا ہونا باقی تھا اور افسوس کہ خیال کا پیدا ہونا آسان نہیں ہے

اسی طرح ایک مسئلۂ **نور** بھی ہے اور سچ پوچھو تو نور اور حرارت کے مظہر قدیم سے توام ہیں ابتدائے آفرینش میں انساں نے آنکھ کھولی ہوگی تو **شب و روز** کے تماشے اُسکی نگاہ کے سامنے تھے اور آج تک اُسی دستور کی حکمرانی ہے لیکن کتنی ہیں وہ حقیقت شناس نگاہیں جو ان واقعات کی کنہ و حقیقت کو تلاش کرتی ہیں اور کم فہموں کیلئے دلیل راہ بنجاتی ہیں یہ حقیقت بھی ہزارہا سال تک انسانی توجہ کی منتظر رہی اور وہ انسان پیدا نہ ہوئے وہ جو اس فن کے مردِ میدان تھے آج فن نور کے نام سے معلومات کا جتنا ذخیرہ ہے وہ سب زمانۂ حال کا ساختہ پرداختہ ہے ہاں اسکا ایک حصہ البتہ زمانہ قدیم کی بھی یاد دلا دیتا ہے لیکن یہہ قدامت بھی کچھ ایسی قدامت نہیں کہ اس پر قدامت کا اطلاق صحیح سمجھا جائے یہہ حصہ فن مناظر کے نام سے مشہور

ہے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مناظر کی بحث یونانیوں کے وقت میں شروع ہوئی لیکن وہ زمانہ اسکی ابتدا کا زمانہ تھا اور سوءِ اتفاق سے افلاطون کے فلسفہ نے ارباب بصیرت کی نگاہوں کو ایسی غلط راہوں پر لگا دیا کہ بڑے بڑے عالی دماغ فلسفی بھی دھوکا کھا گئے اور تلاش حقیقت کی منزلیں صعب سے صعب تے ہوتی گئیں اس غلط روی کا اثر فن مناظر پر بھی پڑا اور صدیوں میں اسبات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ جس کیفیت کو ہم **رویت** کہتے ہیں اسکی اصلیت کیا ہے اور واقعہ یہہ ہے کہ علمائے اسلام کا ایک گروہ افلاطون کے مسلک سے ہٹ کر تلاش کی اصلی راہیں اختیار نہ کر لیتا تو فن نور کی ترقی بہت کچھ سست ہو جاتی مسلمانوں نے مناظر کو اس انداز سے اٹھایا کہ فن کی راہیں روشن ہو گئیں۔ چنانچہ **ابن ہیثم** اس دنیا کا سب سے پہلا شخص ہے جس نے آنکھ کی ساخت کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور اسکی تشریح سے اس بات کو ثابت کیا کہ **رویت** کی پیدایش کن اسباب کا نتیجہ ہے یہ اسکا پیدا کیا ہوا نتیجہ ہے کہ جس چیز کو ہم دیکھتے ہیں وہ منور بالذات ہے تو اسکے ذاتی نور کی شعاعیں اور اگر منور بالذات نہیں تو اسکے اکتسابی نور کی شعاعیں ہماری آنکھ میں داخل ہوتی ہیں اور ان ہی شعاعوں سے رویت کا احساس پیدا ہوتا ہے علاوہ بریں اسنے یہ بھی ثابت کیا کہ رویت شعاعِ واحد کا نتیجہ نہیں بلکہ شئے مرئی کے ہر نقطہ سے شعاعیں ایک مخروط کی شکل میں آتی ہیں اور اسی قسم کے مخروطوں سے رویت

حاصل ہوتی ہے غرض ابن ہیثم اور اُسکے متقدمین نے فن مناظر کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اُنکے وضع کئے ہوئے مسائل آجتک مسلم ہیں اور اس فن میں جو کچھ مزید ترقی ہوئی ہے اُسی فن ریاضی کے ارتقائے مزید کا نتیجہ سمجھنا چاہئے پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علمائے اسلام کے ذہن شعبہ نور کے بعض مہمات مسائل کیطرف بھی منتقل ہو چکے تھے تو تاریخ عالم کا ایک عجیب و غریب ورق نگاہ کے سامنے آجاتا ہے یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ جب تک فن نور کے کئی مرحلے طے نہ ہو جائیں ان مسائل کا نگاہ کے سامنے آنا نہایت مشکل ہے اور جب یہ مسائل نگاہ کے سامنے آجائیں تو پھر اس فن کے کئی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں چنانچہ اسی قسم کا ایک مسئلہ رفتار نور کا مسئلہ ہے اور یہ ثابت ہے کہ اس مسئلہ کو بغداد کی مغل گردی سے ایک مدت پہلے بغداد کا ہندس ہبتہ اللہ حل کر چکا تھا +

لیکن یہہ زمانہ بھی کچھ دور کا زمانہ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہہ ہے کہ یہی زمانہ فنون جدیدہ کی ابتدا کا زمانہ ہے اسی زمانہ میں اُس عمارت کی بنا قائم ہوئی جو آج اس رفعت و شان کی مالک ہے +

برق بھی اسی قسم کی ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے فاطرِ ہستی کی صنعتِ تخلیق کا یہہ زبردست مظہر بھی ابتدائے آفرینش سے انسان کی نگاہ کے سامنے ہے دنیا برق و خرمن کے ہزار ہا تماشے دیکھ چکی ہے لکوکھا انسانوں کی جانیں اس قہر الٰہی کی نظر ہو چکی ہیں وہ کون ہے جو آنکھیں رکھتا ہے اور اسکی چشمک سے

آگاہ نہیں اور وہ کون ہے جو کانوں کا مالک ہے اور اِسکی ہیبت ناک کڑک سے آشنا نہیں لیکن انسان نے اس کھلی ہوئی حقیقت پر عالمانہ رنگ میں کب توجہ کی ؟ اور اِسپر توجہ کیونکر ہوئی ؟ یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں انسان کی نگاہ نے ہزارہا سال تک اس ہیبت ناک منظر کو دیکھا اور اسکا دل ہزارہا سال تک ان حیرت انگیز نظاروں سے مرعوب ہوتا رہا لیکن کیا اُس نے کبھی اسباب پر بھی توجہ کی کہ کارگاہ عالم کا یہ طوفان عظیم کن اسباب کی فتنہ زائی ہے ؟ تاریخ سے اس بات کا تو پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کے ہیبت ناک عجائبات نے ہمیشہ انسان کی نگاہ کے سامنے ایک حیرت و استعجاب کا عالم کھڑا کردیا اور وہ مبہوت ہوکر رہ گیا لیکن قدما کی تاریخ اسبات کی بھی کوئی شہادت نہیں پیش کرسکتی ہے کہ حیرت کا پردہ چاک ہو جانے پر کسی عالی ہمت انسان کا دل اصلیت واقعہ کی تلاش پر بھی مائل ہؤا ؟ حقائق موجود تھے' ہمتیں بھی پست نہ تھیں پھر وہ مسالہ جو ان حقائق کے ابتدائی مسائل کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے وہ بھی فراہم ہوچکا تھا اور اسپر بھی انسان کی توجہ اِدھر ملتفت نہ ہوئی یہہ وہی راز ہے کہ خیال کا پیدا ہونا آسان نہیں ؞

لیکن آخر وہ زمانہ بھی آگیا کہ باقی حقائق کیطرح اس کھلی ہوئی حقیقت نے بھی انسان کو اپنی ذات پر متوجہ کرلیا۔ پھر اس توجہ نے اس فن کو اور اس فن نے انسانی کاروبار کو ترقی کے جس مقام پر پہنچا دیا وہ آج ہماری نگاہ کے سامنے ہے۔ وہی برق یعنی کارخانۂ قدرت کی ایک عظیم الشان قوت جو پہلے انسان کی نگاہ میں اس سے

زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی کہ ایک مایۂ حیرت اور برہم زنِ عافیت ہے
اب انسان کے ہاتھ میں اس طرح مقید ہو گئی کہ انسان زندگی کے
ہر شعبہ میں اُس سے کام لے رہا ہے اس مضمون میں ہم دکھانا
چاہتے ہیں کہ وہ علم جو آج اِس قدر کار آمد ہے اُسکی ابتدا کیونکر
ہوئی اور یہ ابتدا اپنی نوعیت کے اعتبار سے کس قدر سادہ تھی اس سے
یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ علم و حکمت کا مسالہ کن مصیبتوں سے تیار
ہوتا ہے اور انسان کا تخیل جب راہ راست پر آجاتا ہے تو پھر
سہولت کی راہیں کسطرح خود بخود کھلتی جاتی ہیں*

تاریخ میں بعض اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جنسے
گمان ہوتا ہے کہ جس زمانہ کو فن برق کی ابتدا سمجھا جاتا ہے اس
سے مدتوں پہلے ایشیا کے علما برق کے بعض کوائف سے واقف
ہو چکے تھے۔ چنانچہ یہ بات بہت غالب معلوم ہوتی ہے کہ اُس
زمانہ کے طلسم و نیرنج کی بنا بیشتر برق و مقناطیس کے واردات
پر تھی۔ چنانچہ بعض قدیم تحریروں میں اس قسم کے اشارے ملتے
ہیں کہ فلاں شخص طلسمات کے تماشے دکھارہا تھا کہ اس دوران
میں اُس پر بجلی گری اور اُسکے خرمنِ حیات کو فنا کر گئی۔ اس میں
شک نہیں کہ جن لوگوں نے اس قسم کے خیالوں کو قلمبند کیا ہے
واقعہ کا بیان اُن کا اصلی مقصود نہ تھا اُن کا مطلب صرف یہ ہے
کہ اس فعل کا ارتکاب جرم تھا اور بجلی کا گرنا اسکی آسمانی سزا
لیکن ہم اس قسم کے واقعات سے قیاس کر سکتے ہیں کہ متقدمین
نے جن لوگوں کو اس طرح آسمانی سزا کا مستوجب قرار دیا ہے

وہ غالباً برق سے کھیل رہے ہونگے اور برق کے تجربوں میں اس قسم کے صدموں کا شکار ہو جانا کچھ غیر متوقع نہیں چنانچہ وہ زمانہ بھی ہماری نگاہ میں ہے جو واقع میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا کا زمانہ تھا اور اس فن کے پیش رو برق کی اصلیت سمجھنے کیلئے رعد کی کڑک اور ابر و باراں کے طوفان میں بادلوں کی بجلی پر تجربے کر رہے تھے +

برق و مقناطیس کے مضمون ایک دوسرے کیساتھ اس طرح دست و گریبان ہیں کہ دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں بن گئی ہیں۔ اور آج ایک کو دوسرے سے الگ کر دینا ممکن نہیں ابتدا میں بلا شبہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا گانہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن جوں جوں ان کے مسائل نگاہ میں آتے گئے ان کا تعلق ظاہر ہوتا گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ فن برق کی ابتدا کو تلاش کریں مقناطیس کو بھی اس کے ساتھ رکھا جائے۔ اس شرط کا سہارا لیکر ہم مسیح سے چند سال پہلے تک اس مضمون کی ابتدا کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ چینیوں کی تحریروں سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ زمانۂ مذکور میں چینی قافلے سفر کے دوران میں ایک قسم کا پتھر اپنے ساتھ رکھتے تھے جس سے تاتار کے بیابانوں میں رستہ پہچاننے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن ان لوگوں نے اس پتھر کو **کب** دریافت کیا ؟ اور **کسطرح** دریافت کیا ؟ ان سوالوں کا جواب معین نہیں ہو سکتا۔ اور فن برق کی ابتدا کا نشان ان ہی سوالوں کے جواب پر موقوف ہے

بعض محققین کا دعوی ہے کہ یہہ پتھر جو بعد میں کہیں "رہنما پتھر" اور کہیں "قطب نما پتھر" یا "قبلہ نما پتھر" کے نام سے مشہور ہوا اسکے وجود اور خواص سے دنیا مسیح سے دو ہزار چھ سو برس پہلے بھی واقف تھی"

یہ پتھر حقیقت میں لوہے کی ایک کچی دھات ہے جسے غالباً زمین کے مقناطیسی اثر نے "مقناؔدیا" (مقناطیس کر دیا) ہے۔ یہ پتھر دنیا کے کئی حصوں میں ملتا ہے اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کے لوگوں نے اس واقعہ کو بھی دیکھ لیا ہوگا کہ قطب نما پتھر لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کھینچ لیتا ہے اور لوہے کے ٹکڑے اسکے ساتھ اس مضبوطی سے چمٹ جاتے ہیں کہ قدما کا اسکو ذی روح سمجھ لینا کچھ خلاف توقع نہیں۔ کیونکہ روح ایک ایسی چیز ہے کہ اس قسم کے واقعات کی توجہ کیلئے قدما کی نگاہیں اسی پر آسانی سے پڑ سکتی تھیں۔

یہ پتھر ان لوگوں کیلئے بلاشبہ ایک مایۂ استعجاب اور نمونۂ عجائبات ہوگا۔ اور بہت سے لوگ اس اعجوبۂ روزگار کو اپنے پاس رکھنے کے متمنی رہتے ہونگے یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو انسان کھلونا سمجھ کر ہاتھ میں لیتا ہے اُسے کھلونے ہی کیطرح استعمال کرتا ہے اور جہانتک اُسکی قوت اختراع کام دیتی ہے کھلونے سے کھیلنے کے نئے نئے طریقے وضع کرتا جاتا ہے پھر کیا یہ قرین قیاس

* مقنا یا مقناطیس بنا دینے کے معنی میں مصنف نے استعمال کیا ہے جو اگرچہ اردو میں ابتک مستعمل نہیں ہے لیکن اردو کو علمی زبان بنانے کیلئے لیے مصادر جعلی کے ایجاد کی ضرورت ہے اور یہ ایجاد اس معنی میں بہت موزون ہے (اڈیٹر)

نہیں کہ اسی کھیل کے دوران میں کسی جدت طراز نے اس پتھر کو آزادانہ لٹکا کر بھی دیکھ لیا ہو ؟ پتھر کو اس وضع میں رکھا ہوگا تو اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہوگی کہ لٹکتا ہوا پتھر جھول جھال کر آخر سکون میں آجاتا ہے اور ہر حال میں سکون کے وقت اسکی ایک ہی وضع ہوتی ہے پھر اسکے بعد مزید مشاہدو لیا نے یہ بات بھی ثابت کردی ہوگی کہ سنگ مذکور کا جو سرا سکون کیوقت شمال کیطرف رہتا ہے وہ ہمیشہ اسی سمت کا نشان دیتا ہے اور دوسرا سرا ہمیشہ جنوب نما رہتا ہے پتھر کو سمتوں کے پہچاننے میں استعمال کرنے سے پہلے ان مرحلوں کا طے ہوجانا ضروری تھا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ یہہ تمام مرحلے اپنی طبعی ترتیب سے طے ہوتے گئے ہونگے ٭

اسکے بعد جب یہ معلوم ہؤا ہوگا کہ سنگ مذکور لوہے کو چھوکر اسمیں بھی ویسی ہی خاصیت پیدا کردیتا ہے تو یہ بلا شبہ اس فن کی ترقی کا دوسرا قدم تھا۔ قدماء سنگ مذکور کی اس خاصیت سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سنگ مذکور کو سخت لوہے پر ایک خاص انداز سے رگڑا جائے تو لوہا بذات خود انھیں خواص کا مالک بنجاتا ہے اور سنگ مذکور کی طاقت میں اس عمل سے کوئی فرق نہیں آتا چنانچہ وہ لوگ لوہے کے اس قسم کے ٹکڑوں کو **مقناطیس** کہتے تھے۔ یہ اصطلاح یونانیوں کی وضع کی ہوئی ہے اور ملک شام کے اس مقام کی مناسبت سے اختیار کی گئی ہے جو یونانیوں کے وقت میں **مقنیسیا** کہلاتا

تھا۔ مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا پتھر اُس مقام پر بکثرت ملتا تھا۔

اسی زمانہ میں اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی مشاہدہ میں آیا۔ یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ کہربا[1] کے ٹکڑے کو رگڑا جائے تو اُس میں ہلکے ہلکے اجسام مثلاً چھوٹے چھوٹے تنکوں یا کاغذ کے پرزوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی خاصیت پیدا ہوجاتی ہے اس واقعہ کا ایک یونانی فلسفی نے ۶۰۰ قبل مسیح تک پتہ دیا ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب واقعہ مذکور قلمبند ہوگیا تھا اور یہ ضروری نہیں کہ ہر واقعہ مشاہدہ میں آتے ہی قلمبند ہو جائے۔ خصوصاً جب ہم اُس زمانہ کے کوائف پر غور کرتے ہیں تو یہ بات یقین کی سرحد میں آجاتی ہے کہ کہربا کی خاصیت غالباً زمانہ مذکور سے پہلے مشاہدہ میں آچکی تھی اس زمانہ میں بیسیوں حقائق تھے جو مدت تک زبان زدِ خلائق رہتے تھے اور قلمبند ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کہربا کی خاصیت بہ ظاہر قطب نما پتھر کی خاصیت سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ قطب نما پتھر صرف لوہے کو کھینچتا ہے اور رگڑا ہوا کہربا ہر قسم کے ہلکے اجسام کو جذب کرلیتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہیں برق و مقناطیس کے مسائل سے

---

[1] کہربا ایک قسم کا معدنی بیروزہ ہے جسے زمین کے نیچے دبے ہوئے صنوبر کے درختوں کا گوند سمجھنا چاہیئے قرنہا قرن تک مٹی میں دبے رہنے کے بعد اس نے معدنیات کی شکل اختیار کرلی ہے۔

آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ تھوڑی ہی سی ترقی کے بعد دونوں کے مباحث دست و گریبان ہو جاتے ہیں ؂

اسکے بعد تمام تاریخِ فن پر ایک خاموشی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین میں سے جو لوگ طبعیات کے مسائل پر غور کرنیکے عادی تھے اُنہوں نے ان واقعات کو التفات کے قابل نہیں سمجھا اور جو فن جو آگے چلکر عظیم الشان کارناموںکا مالک بننے والا تھا اُسکی ابتدا ایک کھیل ہوکر رہگئی۔ اسمیں شک نہیں کہ عرب کے مسلمانوں نے مقناطیس کے خواص پر توجہ کی اور اُس سے قطب نما (کمپاس) تیار کرکے جہاز رانی میں مدد لی لیکن عرب کی طبیعت، نظریات کی نسبت عملیات کی زیادہ شایق تھی وہ مقناطیس کے اصولوں کو اس حد تک ترقی نہ دے سکے کہ اسمیں فن کی حیثیت پیدا ہو جاتی پھر اسکے بعد سنہ۱۶۰۰ء تک ہزارہا انسانوں نے کہربا اور تنکوں کے تماشے دیکھے ہونگے اور مقناطیسی پتھر سے فائدہ اُٹھایا ہوگا لیکن اسبات کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ کسی صاحب دل کا قدم ترقی کیطرف بھی اٹھا ہو سنہ۱۶۰۰ء میں البتہ اس خاموشی کا پردہ چاک ہوا اور انگلستان کے ایک طبیب نے قطب نما پتھر اور رگڑے ہوئے کہربا کے خواص پر توجہ کی اسکی توجہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جذب کچھ کہربا ہی کا خاصہ نہیں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں کہربا کی طرح رگڑا جائے تو اُنمیں بھی یہی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس طبیب کی توجہ بھی بے وقت کی راگنی تھی جسپر اسکے سوا کوئی دوسرا متوجہ نہ ہوا اور کہربا کا مسئلہ تماشے کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اسکے بعد پھر ایک صدی اُسی خاموشی میں گذر گئی۔ تاہم اس طبیب کے انکشاف سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لوگوں کی نگاہیں کہربا کی خصوصیت سے ہٹکر مسئلہ کی عمومیت پر

نال ہوگئیں اور یہ بلا شبہ ایک بڑی کامیابی تھی جس نے فن کی اصلی ترقی کا دروازہ کھولدیا۔ پھر سترہویں صدی کے اختتام تک اس مضمون میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ کسی خاص چیز کا التزام باقی نہ رہا۔ اس زمانہ میں علما نے یہ بات معلوم کرلی کہ ضروری شرائط ملحوظ رہیں تو رگڑنے سے تمام اجسام میں وہی کہربا کے سے جذب کی سی خاصیت پیدا ہو سکتی ہے خشک خالی کاغذ کے ٹکڑے کو کپڑوں کے معمولی برش سے رگڑ دو تو کاغذ چھوٹے چھوٹے تنکوں کو کھینچنے لگیگا لاکھ کو کپڑے سے رگڑو تو اسمیں بھی یہی خاصیت پیدا ہوجائیگی گندھک کو رگڑ کر دیکھو تو اسمیں بھی یہی رنگ نظر آئیگا اس میں شک نہیں کہ بعض اجسام بعض سے زیادہ موثر ہیں لیکن یہ اصلیت کا اختلاف نہیں۔ محض مدارج کا اختلاف ہے +

غرض جب کہربا کی خصوصیت جاتی رہی تو خیال کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ اب لوگوں نے اسی تماشے کو بڑھانا شروع کیا اور اس کیساتھ ساتھ تماشے میں علمی رنگ بھی پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بجائے اب مشینیں بننے لگیں کہ امتحان کیلئے پیمانہ وسیع ہوجائے پہلے پہل یہ مشینیں گندھک کی بنائی جاتی تھیں گندھک کے گولے میں دھری ڈال کر گھماتے تھے اور گھومتے ہوئے گولے کو ہاتھ سے رگڑتے جاتے تھے پھر اس کے بعد ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ گندھک کی جگہ شیشہ نے لیلی اور گولوں کی بجائے شیشہ کے اسطوانے استعمال ہونے لگے ان ابتدائی مشینوں سے کامیابی کا رستہ یہاں تک صاف ہوگیا کہ ان کی مدد سے چھوٹے چھوٹے برقی شرارے پیدا ہو سکتے تھے +

انھیں ابتدائی تجربوں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ برقی ہیجان میں آئے ہوئے

شیشہ کے اُستوانہ کو کسی اور چیز سے چھو لیا جائے تو اسمیں بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اسیطرح دو چیزوں میں یہی کیفیت پیدا کر لیجائے تو وہ اپنی جگہ دوسری ہلکی ہلکی چیزوں کو تو بدستور جذب کرتی ہیں۔ لیکن اُن دونوں کو آپس میں ایک دوسرے کے قریب لاؤ تو دونوں میں ایک دوسرے سے دور ہٹ جانیکا تقاضہ نظر آتا ہے

اٹھارویں صدی کی ابتدا میں اسی سادہ سی مشین سے یہ بات معلوم ہوئی کہ روئی کے لمبے لمبے تاگوں کو ریشمی تاگوں کے ساتھ لٹکا کر اس مشین سے ملا دیا جائے تو برقی اثر ان تاگوں کے ساتھ ساتھ تین سو گز تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر چند سال بعد یہ امر مشاہدہ میں آیا کہ وہی تاگے بھیگے ہوئے ہوں تو تین سو گز کی بجائے چار سو گز تک کام دیسکتے ہیں۔ اب کھیل کی بجائے ان تجربوں میں علمی رنگ آرہا تھا اور لوگوں کی طبیعتیں نتائج کے ارتباط اور با اصول استدلال پر مائل ہوتی جاتی تھیں اب انہیں بالتدریج فن کی حیثیت پیدا ہوتی گئی۔ پھر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان سادہ مشینوں میں وقتاً فوقتاً اصلاح ہوتی جائے چنانچہ پہلا قدم جو اصلاح کیطرف اٹھا وہ یہ تھا کہ مشین کے ساتھ چمڑے کی گدی استعمال ہونے لگی۔ یہ گدی شیشہ کے استوانہ کیساتھ رگڑ کھاتی ہے تو شیشہ برقی ہیجان میں آجاتا ہے اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ تجربہ کرنیوالا رگڑنیکا کام اپنے ہاتھ سے لیا کرتا تھا اس اصلاح سے مشین مقابلۃً زیادہ کار آمد ہو گئیں پھر اسکے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ مشین سے جو برقی اثر حاصل ہوتا ہے اُسے جمع کر لینے کا انتظام کر لیا جائے اس مطلب کیلئے مشین کیساتھ "بتاور" کا اضافہ ہوا۔ اور "بتاور" کے وجود سے بڑے بڑے برقی شرارے پیدا کرنیکا انتظام ہو گیا پھر ان شراروں کی نوعیت دیکھکر اس بات کو سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ انسانی تک و دو کے حاصل میں بھی اُس ابر و باراں کے طوفانوں میں نمودار ہونیوالے خوفناک نائرۂ آتش کی سی خوبو ہے جسکی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے اور اسکی کڑک سے دل

ڈھل جاتے ہیں ✤ آجکل جو شینیں استعمال ہوتی ہیں اُنمیں رگڑ کی ضرورت نہیں۔ انمیں گندھک اور ربڑ کے امتزاج سے تیار کی ہوئی یا شیشہ کی بنی ہوئی دو گول تختیاں استعمال کرتے ہیں ان تختیوں پر دھات کی باریک باریک پتیاں سلسلہ وار چپکا دیتے ہیں تختیاں ایک دوسرے کے قریب رہتی ہیں اور متضاد سمتوں میں گھومتی ہیں۔ ان تختیوں کو برقی ہیجان میں لانے کیلئے اسطریقہ سے کام لیتے ہیں جو فن برق کی اصطلاح میں امالۂ برقی کے نام سے مشہور ہے تختیوں کی ایک جوڑی کی بجائے اسیطرح کی کئی جوڑیاں ایکساتھ استعمال کیجائیں تو وقت واحد میں بہت سا برقی اثر پیدا ہو سکتا ہے چنانچہ حال میں انگلستان کے ایک شوقین رئیس نے اپنے ذاتی محل میں اسیطرح کی ایک بہت بڑی برقی مشین تیار کر رکھی تھی اسمیں تین فٹ قطر کی ایکسو ساٹھ تختیاں تھیں اور اسکی کارگزاری کا یہ عالم تھا کہ استعمال کیوقت اس سے بجلی کے شرارے پیدا ہوتے تھے تو اس کڑک کیساتھ پیدا ہوتے تھے کہ آس پاس والونکے کان بہرے ہوجاتے تھے حالمیں بعض اس قسم کی برقی مشینیں بھی تیار ہوئی ہیں جنمیں صرف گندھک اور ربڑ کے امتزاج سے تیار کی ہوئی تختیونسے کام لیا ہے ان تختیوں پر دھاتی پتیوں کا استعمال ترک کردیا گیا ہے۔ یہ مشینیں نہایت عمدہ کام دیتی ہیں ✤ لیکن اس قسم کی تمام برقی مشینیں صرف علمی اور تاریخی دلچسپی کا سامان ہیں تجارتی کاروبار اور دیگر انسانی ضروریات کی بہم رسانی میں کچھ بکار آمد نہیں ان مشینوں سے برقی شرارے تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ایسے مسلسل برقی "رَو" حاصل کرلینا ممکن نہیں اور کاروبار میں کام لینے کیلئے برق کا مسلسل "رَو" میں ہونا ضروری ہے برقی قوت مہیا کرنیکا انحصار اسی قسم کی مشینوں پر رہتا تو اسمیں تک نہیں کہ عملیاتیں کوئی بیش قرار فائدہ مترتب نہ ہوتا۔ اس سے برقی تار میں کام لیا جا سکتا ہے نہ ٹیلیفون میں نہ اس سے برقی روشنی ہو سکتی ہے نہ برقی موٹر چل سکتے ہیں اس فن میں عملیات کیطرف جو پہلا قدم اٹھا اور جس نے آگے چلکر دنیا کے کاروبار میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا وہ برقی ہو جونکا اختراع ہے جن سے برقی قوت "رَو" کی شکل میں حاصل ہو سکتی ہے اس شعبہ کی ابتدا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ان واقعات کو ہم کبھی آئندہ بیان کرینگے - برکت علی (بی۔ یس۔ سی)

۷۸۶

ثمرۃ الادب

ہندوؤں کے قدیم دار الاقامہ جات

(از بابو امرت لال صاحب یم اے پروفیسر سائینس دار العلوم)

قدیم اہل ہند کے متعلق اگر کچھ دریافت کرنا ہو تو ویدوں اور پرانوں میں تلاش کرنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ وید صرف ہند ہی کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی سب سے پرانی کتاب ہے اس پر زمانۂ مابعد میں جو تتمے بطور تفسیر اضافہ کئے گئے ہیں وہ اُوپنشد کہلاتے ہیں۔ پرانوں میں تاریخ اور دینی و دنیوی نصائح ہیں۔ محققان یوروپ کا خیال ہے کہ وید صرف پانچ ہزار سال کی کتاب ہے لیکن علماء ہند دعوے سے کہتے ہیں کہ ہزارہا سال قبل وید موجود تھے کیونکہ وید کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کئی ہزار علما و زہاد کے کلام کا مجموعہ ہے جو کہ ویاس

نامی ایک عالم وزاہد نے سلسلہ وار جماکر چار حصّوں میں تقسیم کیا
مہرشی ویاس مہا بھارت کی لڑائی کے وقت موجود تھے اس لڑائی
کے تیرہ چودہ سال قبل مہاراجہ جودہشتر نے دہلی کو اندرپست
کے نام سے آباد کرکے اپنا سمبت یا سال جاری کیا تھا اور
اُسی سال ہندوؤں کے شمار کا کل یگ شروع ہوا اس سمبت
کا ۵۰۱۸ پانچ ہزار اٹھارواں سال ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء کو شروع
ہوتا ہے۔ اس لئے وید کو تقسیم ہوئے ٹھیک پانچ ہزار سال
ہوئے۔ کتاب کی عبارت ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا
کلام اس کتاب میں موجود ہے وہ زمانہ تالیف سے سینکڑوں
بلکہ ہزارہا سال قبل موجود تھے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۔۔۔۔۔
قبل عیسیٰ کے قریب آریہ ورت کے علما نہ صرف آفتاب وستاروں
کے حرکت سے واقف تھے بلکہ اس وقت آفتاب وستاروں کی
روزانہ حرکت کی پیمائش سے جنتری مرتب کرنا ایک خاص جماعت
کا کام تھا اس وقت راجہ پرچیتا کے عہد سلطنت میں کنڈورشی
نے دریافت کیا کہ نقطۂ اعتدال یعنی وہ نقطہ جس پر دائرۂ گردش
آفتاب خط استوا کو قطع کرتا ہے مستقل نہیں بلکہ ہرسال پیچھے
ہٹتا ہے۔ بیشک غلطی یہ کی کہ رشی موصوف کا قول ہے کہ یہ نقطہ سالانہ
۴۷.۵ ثانیہ پیچھے ہٹتا ہے اور یوروپ کے موجودہ ہیئت دان
دوربین اور دیگر نازک پیمائش کے آلات کی مدد سے بتلاتے ہیں کہ صرف
۵۰.۲ ثانیہ ہٹتا ہے لیکن یوروپ کے مورخوں کا بیان ہے کہ اس حرکت کا
علم پہلے نہ تھا۔ یوروپ کے مشہور ریاضی دان براڈلے نے ۱۷۴۷ء

میں دریافت کیا۔ چونکہ آفتاب کی حرکت اور اس نقطہ کے حرکت کی پیمائش منڈی سے نہیں ہوسکتی اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ سے بہت قبل اس علم کی تعلیم شروع ہوئی ہوگی۔

بہرحال جس زمانہ کا ذکر وید میں آیا ہے (خواہ یوروپ کی رائے صحیح ہو یا ہند کی) اُس زمانہ کی طرز تعلیم اور موجودہ زمانہ کی طرز تعلیم میں بہت اختلاف ہے۔ اُس زمانہ میں اکثر راجاؤں یا علماء کے جلسوں میں طلبہ کا امتحان لیا جاتا تھا اور جب وہ معلم بننے کے قابل ثابت ہوتے تو اُن کو آچاریہ یا پروفیسر کا درجہ دیا جاتا طالب علم بلا کامیابی معلمی کرنے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح انسان حیوان اور پرندوں کے علاج کرنے کے لئے بھی امتحان میں کامیابی کی قید تھی۔ اگر کوئی شخص بلا حصول کامیابی ان کاموں میں مشغول ہوتا تو قانوناً قابل سزا سمجھا جاتا۔ حاکم وقت کا فرض تھا کہ ایسے کامیاب شخص کے لئے ایک مدرسہ قایم کردے اور اس کی ذات و طلبہ کے اخراجات و پرورش کے لئے جاگیر مقرر کردے۔ طالب علم کو فیس ادا کرنے کا موقع نہ ہوتا تھا بلکہ کامیابی کی شہرت ہوتے ہی چاروں طرف سے دعوتیں آنے لگتیں۔ مدرسہ کے لئے اکثر دریا یا چشمہ کے کنارے زمین ملتی تھی۔ ایک بڑا دالان یا چھپر مکتب کے لئے ایک مکان معلم کے بیوی بچوں کے رہنے کے لئے اور متعدد کمرے یا کئی جھونپڑے طلبا کے لئے بنا دئے جاتے تھے۔ طالب علم کے خواہ وہ قریب کا رہنے والا ہو یا دور کا خواہ غریب زادہ ہو یا امیرزادہ

اوستاد کے مکان پر بطور مہمان بود و باش کرنا لازمی تھا۔ طلبہ کے والدین کی خانگی مالی حالت کا بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ طلبا استاد ھی کے لڑکے بن جاتے تھے اور استاد کا دیا ہوا کھانا اور اس کے دیئے ہوئے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ جب لڑکے کی عمر تحصیل علم کے لائق ہوتی تو اُسے جنیو یعنی زنار پہنا کر اُستاد کے سپرد کر دیتے تھے۔ زنار طالب علمی کی علامت ہے اُسے مذہب سے کوئی تعلق نہیں زنار سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ زنار دار یا تو طالب علم ہے یا طالب علمی کر چکا ہے یعنی لکھا پڑھا ہے طلبہ کو اپنے اُستاد کی خانگی خدمت بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً مدرسہ کے احاطہ میں کچھ پھولوں کے کچھ میووں کے درخت کچھ ترکاری سبزی کی کاشت ضرور ہوتی تھی۔ معلم و طلبا کے لئے چند گائے ضرور پالے جاتے تھے۔ معلم صاحب کی سواری کو گھوڑا نہ ہوتا تو ٹٹو تو ضرور ہوتا۔ ان کی داشت کا کل کام طلبا پر تقسیم ہو جاتا تھا۔ اور وہ بہ خوشی اسے ادا کرتے تھے کسی قسم کی ذلت یا ہتک نہیں سمجھتے تھے۔ طالب علم قبل از طلوع آفتاب ضروریات سے فارغ ہوکر پہلے عبادت کرتا بعد اس کے خانگی کاموں میں سے جو کچھ اس کے سپرد ہوتا اسے انجام دیتا پھر مکتب کے بڑے دالاں میں استاد کے پاس سبق کیلئے حاضر ہوتا۔ جب معلم کی شہرت زیادہ ہوتی اور دور دراز سے طلبا جمع ہوتے تو اکثر اُس کی جاگیر میں اضافہ ہو جاتا اس طرح شہرت کے ساتھ معلموں کو خوش حالی بھی مل جاتی۔ اگر کسی قسم کی

کمی ہوتی تو معلم راجاؤں اور امراء سے مدد مانگتا لیکن طلبا کے والدین سے ہرگز کسی قسم کی مدد نہ لیتا بلکہ اس قسم کی مدد لیتا یا اجرت تعلیم طلب کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا بیشک ختم تعلیم پر کچھ نذر دینے کا طریقہ جاری تھا غریب طلبا تو تعلیم ختم کرکے استاد سے دعا لیتا اور ایک پھول نذر کرتا لیکن امرا یا راجاؤں کے لڑکے اکثر ایک گائے یا گھوڑا نذر کرتے یا اُن کے بیوی بچوں کی اگر کوئی فرمائش ہوتی تو اُسے پورا کرتے۔ یہ فرمائشیں بھی ادنیٰ چیزوں کی ہوتی تھیں۔ مہا بھارت میں ایک استاد کا ذکر آیا ہے کہ اُن کی بیوی ایک راجہ کی لڑکی تھی۔ ایک دوسرے راجہ کے لڑکے سے ختم تعلیم پر استاد کی بیوی نے ایک چارپائی کی فرمائش کی اُستاد سُنکر بہت بگڑے اور کہا غریب برہمن کی بیوی کو چارپائی کی ضرورت نہیں ہوسکتی اگر آپ کو ایسی ہی آرام طلبی کی خواہش ہو تو آپ کو اجازت ہے آپ بخوشی اپنے دولتمند والدین کے پاس چلے جائیے۔ اُس کے بعد بیوی نے چارپائی لینے سے انکار کیا۔ قبل از اختتام تعلیم نذر دینا یا لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر طلبا کے لئے حسب ذیل چیزیں ممنوع تھیں (۱) زمانۂ تعلیم میں شادی کرنا یا سوا چند قریب کے رشتہ داروں کے عام طور پر عورتوں سے ہم کلام ہونا (۲) لذیذ غذا شہد مٹھائی وغیرہ کھانا (۳) شہوت دلانے والی چیزیں کھانا مثلاً گوشت پان وغیرہ۔ عشق کے اشعار پڑھنا۔ گانا بجانا ناچ دیکھنا وغیرہ (۴) نشہ کی چیزیں (۵) آرام طلبی کے سامان۔ شوخ پوشاک جوتا۔ چھاتا وغیرہ۔

(۶) - بدزبانی کرنا - فحش کلمات زبان پر لانا - خواہ سچ ہو یا جھوٹ دوسرے کی عیب جوئی کرنا (۷) بے رحمی یا سخت دلی کا کام کرنا جو طالب علم ان قواعد کی پابندی کرتا اُسے برہم چاری کہتے تھے اور مدرسہ کو آشرم - آشرم میں معلم کے یہاں کھانا پکتا تھا اور سب ملکر کھانا کھاتے تھے کوئی شکایت نہ کرتا بیشک استاد کا بھی فرض تھا کہ طلبا کی اپنے لڑکوں کی طرح پرورش کرے پاک صاف مقوی غذا کھلاوے بیماری میں علاج اور تیمار داری کرے - اُن کی دماغی وجسمانی تعلیم کی نگرانی کرے - کتابی سبق کا یاد کرنا تو قوت حافظہ اور ذہن پر منحصر ہے اور ان پر معلم کا قابو نہیں لیکن معلم اُن خاصیتوں کے پیدا کرنے کی کوشش کرتا جس سے انسان اشرف المخلوق کہلانے کے قابل ہوتا ہے -

ایسے معلم اکثر ایک فنی ہوتے تھے - جب طالب علم اس فن سے فارغ ہو جاتا تو کسی دوسرے معلم کے پاس دوسرے فن کی تعلیم کے لئے جاتا - بعض زیادہ معاش والے معلم دو چار فن میں بھی تعلیم دیتے تھے - ان مدرسوں پر راجہ یا سرکار کی نگرانی نہ ہوتی تھی - معلم حسب ضرورت اپنا بندوبست کرلیتا *

ان مدرسوں کے علاوہ ایک اور قسم کے مدرسہ کا ذکر آیا ہے جن کو راجہ کا مدرسہ یا سرکاری مدرسہ کہتے تھے راجہ کے مدرسہ کا انتظام خود راجہ کرتا تھا - معلم بھی طلبا کی طرح راجہ کے مہمان بنکر مدرسہ میں بود وباش کرتے تھے -

اُپنشد میں ایک جگہ آیا ہے کہ کاشی (بنارس) کا راجہ اجات شترو پروردگار سے دعا مانگتا ہے کہ جس ذوق سے طلبا متھلا کے راجہ جنگ کے مدرسہ میں رجوع ہوتے ہیں اُسی ذوق سے میرے مدرسہ میں رجوع ہوں صوبہ بہار میں متھلا ایک مقام موجودہ دربھنگہ کے قریب ہے۔ اس کی علمی شہرت کچھ دنوں سے کم ہو گئی ہے لیکن زمانۂ قدیم کے متھلا کے علما جو ہر فن پر کتابیں چھوڑ گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ سب سے زیادہ سرسبز تھا۔ ان مدارس میں جو علما مقرر کئے جاتے تھے وہ صرف طلبا کو تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے تھے متھلا کے یگ بلک کی کتابیں اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں اس زمانہ کے اس قسم کے سرکاری مدارس کے مالک چند راجاؤں کے نام آتے ہیں جو نہ صرف مدرسہ کے قیام اور ترقی کی کوشش کرتے تھے بلکہ بذات خود معلمی کی لیاقت رکھتے تھے اور فرصت سے سبق بھی دیتے تھے۔ اُن میں ایسے عالم بھی گذرے ہیں جنکو بڑے بڑے عالم بھی اُستاد مانتے تھے ؀

وید کے زمانہ میں تعلیم صرف سنسکرت زبان میں دی جاتی تھی اور طلبا بھی صرف اعلیٰ اقوام کے ہوتے تھے۔ اس قاعدہ کی نشانی اب بھی چلی آتی ہے یعنے زنار پہننے کا حق صرف اعلیٰ اقوام کو ہے جو اقوام کہ آریہ خاندان کے نہیں ہیں وہ زنار نہیں پہن سکتے یعنی اُن مدارس میں شریک نہیں ہوسکتے

لیکن مہاتما بدھ کے پیدا ہونے کے بعد جب اُن کے مذہب کی اشاعت شروع ہوئی تو طرز تعلیم میں بھی انقلاب واقع ہوا - مہاتما بدھ نے تو حکم ہی دے رکھا تھا کہ اُن کے مذہب کی کتابیں سنسکرت میں نہ لکھی جائیں بلکہ پراکرت یعنی عام لوگوں کی زبان میں لکھی جائیں تاکہ عام فہم ہوں اس زبان میں پراکرت کی وہی حالت تھی جو اس وقت اردو کی ہے ہندوستان میں ہمیشہ مختلف ملک کے باشندے مختلف زبانوں کے بولنے والے آباد رہے - اس لیے ہمیشہ ایک عام فہم زبان کی ضرورت محسوس ہوتی رہی جس میں علمی زبان کے الفاظ شریک ہوں اور ہر زبان کے الفاظ تھوڑے بہت شریک ہوں علاوہ ازیں مذہب بودھ میں ذات اور چھوت کا کچھ جھگڑا ہی نہیں ہے اسلیے سوسائیٹی کے ہر طریقہ کے آدمی ایک ہی قسم کی تعلیم ایک ہی مدرسہ میں پانے لگے اُن کی حالت زیست میں چھوٹے چھوٹے مدارس تو ہزاروں سے زیادہ قایم ہو گئے تھے لیکن ایک مدرسہ اُن کے انتقال کے دس پندرہ سال بعد ایسا قایم ہوا کہ زمانۂ ما بعد میں آفتاب کی طرح چمکا اور مہذب دنیا کے سب ملکوں کے طلبا یہاں سے فیض حاصل کر گئے ٭

صوبۂ بہار میں پٹنہ سے کچھ فاصلہ پر بڑے گانو ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک وسیع کھنڈر آج کل نظر آتا ہے یہاں قریب ۵۰۰ء قبل ع میں ایک مدرسہ بنام نالندہ قایم ہوا تھا۔ وہاں کے ایک چھوٹے راجہ یا زمیندار راجہ ششکرادت نے اسے

قایم کیا تھا اور اپنی سالم جائداد اس کے خرچ کے لئے وقف کردیا تھا اس کے بعد دوسرے راجاؤں کے عطیہ سے مدرسہ کی آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا ہیون شانگ وغیرہ چینی سیاح جنھوں نے اپنے سفر کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے اس مدرسہ میں کچھ دنوں تعلیم پاتے رہے اُنھوں نے مدرسہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس مدرسہ میں صرف ہندی طلبا نہیں بلکہ سنگھال ۔چینی ۔ جاپانی ۔ کوریا ۔ برما ۔ سیام ترکستان تبت کے طلبا بھی تعلیم پاتے تھے کبھی کبھی شام و مصر کے طلبا بھی آجاتے تھے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسٰی بھی اس مدرسہ میں کچھ دنوں تعلیم پا گئے ہیں لکھتے ہیں کہ بارہ سال کی عمر تک وہ اپنے وطن میں رہے پھر تیئس سال عمر تک کا کوئی حال نہیں ملتا ۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ ہندوستان کے مختلف مدارس کی سیر کرتے رہے آخر مذہبی اصول پر یہاں کے معلموں سے اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی رائے کی اشاعت ہندوستان ہی سے شروع کردی تھی ۔ لیکن اس بیان کی صحت کے لئے جس قدر تحقیقات کی ضرورت ہے

لہ یہ بیان ایک غلط فہمی کی بنا پر بعض تاریخی کتابوں میں درج ہوگیا ہے جو بالکل بے اصل ہے حقیقی امر یہ ہے کہ بوزیف تلومر ایک شخص کسی راجہ کا بیٹا تھا ۔ اور اس نے بودہ مذہب کے مدارس میں تعلیم پائی تھی اور ختم تعلیم کے بعد ترک دنیا کرکے روحانیات کی تعلیم میں مصروف ہوگیا ان ہندو مورخوں نے اسی شخص کو حضرت عیسٰی علیہ السلام خیال کرلیا ہے ۔ جو بالکل غلط ہے اڈیٹر

وہ نہیں ہوئی - نالندہ ایک مدرسہ کیوں اچھا شہر تھا جسمیں
کم از کم دس ہزار طلبا ہر وقت موجود رہتے تھے - شہر میں
سوا طلبا معلمین ملازمین یا ایسے اہل غرض کے جوان مدارس میں
فتویٰ وغیرہ کے لئے آتے تھے اور کوئی بود و باش نہ کرتا تھا
اس شہر کی آبادی میں خصوصیت یہ تھی کہ شہر بھر میں ایک
بھی عورت نہ تھی صرف مردوں ہی کی آبادی تھی مختلف مقاموں
پر عالی شان دالان یا مدارس مختلف مضامین پر سبق دینے یا
تقریر کرنے کے لئے بنادئے گئے تھے - طلوع آفتاب سے
آدھی رات تک تقریریں ہوتی رہتی تھیں - طلبا کے قیام کے
زمانہ کی قید نہ تھی سینکڑوں علما ایسے تھے جنھوں نے
اسی شہر یا مدرسہ میں زندگی بسر کردی - سب کے لئے کھانا
کپڑے کا معقول بندوبست تھا اور کچھ وظیفہ بھی مقرر ہوجاتا
تھا - ایک جانب وسیع کتب خانہ میں لاکھوں کتابیں بھری
ہوی تھیں - خوش خط کاتبوں کا دفتر نقل کرنے میں مشغول
رہتا تھا ہزار سال سے زاید تک اس مدرسہ کی ترقی ہوتی رہی -
آخر ۸۰۰ء کے قریب جب برہمنی مذہب نے پھر سر اٹھایا اُس
وقت اس کا زوال شروع ہوا - اس زمانہ کے بودھ بھی بہت
ابتر حالت میں تھے اُنھوں نے مہاتما بدھ کے کلمات کے
معنی حسب دلخواہ لگا لئے اور نفس کشی کے بجاے اول درجہ
کے عیاش بن گئے برہمنوں کے ظلم سے اُن کی تعداد گھٹتے
گھٹتے اس قدر کم رہ گئی تھی کہ کل ہندوستان میں دو چار لاکھ

بو دہ بھی نظر نہیں آتے تھے جب؎ یہ حالت تھی اس وقت ۱۱۹۸ء میں افغان حملہ اور بختیار خلجی نے صوبہ بہار فتح کیا اور مدرسہ کے کل سنّیاسیون کو قتل کرڈالا۔ اس کے بعد کتابیں منگائی گئیں لیکن فاتحوں سے اُن کی کتابیں پڑھی نہیں گئیں ایسے فضول چیزوں کی نگرانی بھی فضول سمجھ کر سب کتابیں جلادی گئیں۔ اس طرح اس مشہور مدرسہ کا خاتمہ ہوگیا اب صرف تاریخ میں نام درج اور کھنڈروں میں دبے ہوئے اینٹ پتھر رہ گئے ہیں آج کل اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ

؎ یہ واقعہ بالکل عجیب ہے ہندوستان کی کسی اسلامی معتبر تاریخ میں اسکا ذکر نظر سے نہیں گذرا اور بارھویں صدی عیسوی کے بعد کوئی ہندی معتبر تاریخ نہیں لکھی گئی نہیں معلوم مضمون نگار صاحب نے یہ واقعہ کہاں سے نقل کیا مسلمانوں کا اصول مذہب اور اصول تمدن دونوں اس واقعہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اسلام میں گوشہ نشیں فقراء سے گو وہ کسی مذہب کے ہوں تعرض کرنا قطعاً ممنوع ہے اس کے علاوہ مسلمان حکمرانوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ ان کی حکومت رعایا کے تالیف قلوب کے ذریعہ ہو پھر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ وہ اتنے بڑے مذہبی گروہ کو بلا وجہ قتل کرکے رعایا کے تمام گروہ کو بددل کرلیتے۔ نیز کتابوں کے ضایع کرنے کی جو وجہ لکھی گئی ہے وہ ناقابل لحاظ ہے جس قوم نے خاص اہتمام سے سنسکرت اور یونانی زبانوں کا تمام سرمایہ علوم عربی میں ترجمہ کیا ہو وہی قوم انھیں علوم کی کتابوں کو اس بیدردی سے ضایع کردے اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب برہمنوں کو بودھوں پر دوبارہ تسلط ہوا ہے تو انہیں نے رشک رقابت میں اس مدرسہ کے کتب خانہ اور علماء کے ساتھ

بورڈنگ کی تعلیم خصوصاً مدرسہ میں معلم و طلبا کا ساتھ قیام اور تعلیم کا طریقہ خاص یوروپ کی ایجاد ہے۔ اُن کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان چاہے کسقدر دوسرے ملک کی رہنمائی کا محتاج ہو زمانۂ قدیم میں ہندوستان دوسرے ممالک کا رہنما تھا۔ اور ہندوستان میں سوا اس طرز کے اور کوئی طرز ہی نہیں تھا۔ راجاوں کے لڑکے بھی معلم کے مکان پر تعلیم پاتے تھے چنانچہ راماین کے راجہ رامچندر بھی معلم کے مکان پر رہتے تھے۔ صرف مہابھارت کے شہزادوں کے لئے ایک معلم دردن اچاریہ مقرر ہوا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ شہزادوں کی تعداد ۱۰۶ یا ۱۰۷ تھی اور یہ معلم شہزادوں کے دادا کے ساتھ پڑھا ہوا تھا۔ تباہی کی حالت میں آیا ہوا تھا اُس کی پرورش بھی منظور تھی اس لئے ایک خاص مدرسہ شہزادوں کے لئے قایم کردیا گیا تھا۔ شاید یہ عام

بقیہ نوٹ از صفحہ (۱۱) یہ برتاؤ کیا اور برہمنوں کے ساتھ یہ عالیشان درسگاہ کم عدم میں چلی گئی اور ان کے بعد کے ہندوں نے خود کو الزام سے بچانے کے لئے سارا بوجھ مسلمان فاتحوں پر ڈال دیا جیسے کہ بودھ مذہب کے معابد کی خرابی برہمنوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور ملزم مسلمان فاتح قرار پاتے ہیں اگر مسلمان ایسا کرتے تو برہمن اور بودھ دونو مذہبوں کے معابد اور مدارس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے حالانکہ کسی برہمن یا بودھ مذہب کے متعلق مسلمانوں پر اس قسم کا الزام کہ انھوں نے برہمنوں کے سی ایسے معبد کے ساتھ جسکو سیاست سے تعلق ہوا ایسا برتاؤ کیا ہو پایۂ ثبوت کو نہیں پھونچا اس سے بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ برہمنوں کے پیروں نے اپنے پیشواوں کے سر سے الزام رفع کرنے کیلئے مسلمانوں کو متہم کیا ہے۔ اڈیٹر

قاعدہ نہیں تھا اس لئے مصنف نے اس قسم کے مدرسہ کے قیام کی وجہ اس تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس طرز تعلیم کی کچھ ٹوٹی پھوٹی نقل اب بھی صوبۂ بنگال میں موجود ہے کلکتہ اور ندیا کے گرد نواح میں شاید ہی کوئی ایسا بدبخت موضع ہوگا جس میں اعلیٰ اقوام کی آبادی ہو اور ایک بھی برہمن اس شرط پر کچھ زمین پر قابض نہ ہو کہ اس زمین کی آمدنی سے ایک مدرسہ قایم کرے اور کم از کم اتنے طلبا کو کھانا کپڑا اور تعلیم دے گو دن بدن انگریزی تعلیم کے ساتھ اس قسم کی مذہبی اور سنسکرت کی تعلیم گھٹتی جاتی ہے تاہم جو کچھ ہے وہ اس طرز اور اصول کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے*

رباعیات

جناب محمد عبدالرب صاحب کوکب مولوی فاضل (دارالعلوم) اڈیٹر رسالہ اتالیق

اے صاحب دل نگاہ می باید کرد
ہر شام وپگاہ آہ می باید کرد۔
خواہی کہ چو کوہ سربلندی یابی
خود را کاہیدہ کاہ می باید کرد

ولہ

چون بر سر طور چشم را وا کردم
لمعان تجلیش تماشا کردم
ہر چند نداشتم سر طاقت ہوش
ہر موئے تنم دیدۂ بینا کردم

ولہ

یار آمد و روز عید یاران آمد
گل آمد و موسم بہاران آمد
می گیر قدح گیر و سبوئے زرگیر
ابر آمد و برق آمد و باران آمد

مقدمہ

کلیات میر تقی میر

(از مولوی عبدالحق صاحب بی - اے ناظم سررشتہ تالیف وتراجم)

لوگ اس شوق میں آتے تھے کہ میر صاحب کی زبان مبارک سے اُن کا کلام سنیں۔ اور اپنے اپنے شہروں کو اُن کے اشعار بطور سوغات کے لیجائیں - یہ قبولیت اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی اس وقت سے اب تک میر صاحب کے کمال کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور بڑے بڑے شاعروں نے انہیں استاد مانا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں *

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق کا ایک شعر ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اور انہیں اس پر ناز تھا۔ اور اس کا اظہار انھوں نے جابجا اس

طور سے کیا ہے کہ دوسرے کی مجال نہیں چنانچہ چند اشعار اس مضمون کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں *

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہئے اہل سخن میر کو استاد کریں۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

جہاں سے دیکھئے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ھنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

جانے کا نہیں شور سخن کا میرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ میری زباں ہے

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمین تمام لیا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا

پڑھتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس آخر شعر میں تعلّی کی انتہا ہوگئی ہے کوئی دوسرا شخص زمانے کا الفاظ اپنے لئے اس طور سے نہیں کہہ سکتا یہ میر صاحب ہی کو زیبا تھا۔

میر صاحب کی شاعری اپنی بعض مخصوص حیثیتوں کی وجہ سے اردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کردیتی ہے اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہوجاتا ہے۔ میر صاحب کے کلام میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لطف سے خالی نہیں ہوتی ان کی زبان فصاحت اور سادگی سوز و گداز مضامین کی جدّت اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی صفائی اور خوبی سے ادا کرجاتے ہیں جن پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے۔ مگر ان کا کلام حسرت

وناکامی حرماں و مایوسی سے بھرا ہوا ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں دل میں اتر جاتی ہے غرض یہ کہ ان کا کلام بلحاظ فصاحت وروانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کلام تجزیہ کرکے الگ الگ اسکی خوبیوں کو گنوانا ناممکن ہے کیونکہ اس سے کلام کی اصلی خوبی کا کامل اندازہ تو ہوتا نہیں البتہ اس کی نسبت غلط فہمی پیدا کر دینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے میری رائے میں کسی شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اور اگر اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو اس کا رتبہ اردو شعراء میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے ان کے اشعار سوز وگداز اور درد کی تصویر ہیں۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں ۔

میر صاحب کی عمر کوئی سو برس کی تھی اور ان کو وفات پائے بھی سو برس سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اب تک یہ حال ہے کہ لوگ ان کے کلام کو پڑھ پڑھ کر مزا لیتے ہیں اور سر دھنتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ گھٹ رہا تھا ۔ اور ہر طرف مایوسی وناکامی نظر آتی تھی اور ممکن نہ تھا کہ میر صاحب کی سی اثر قبول طبیعت اس سے متاثر نہ ہوتی ۔ دوسری ان کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی پڑی تھی کہ اس کا میلان مایوسی وناکامی کی طرف تھا یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کے کلام کی فصاحت و

شستگی سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے مگر پڑھنے والے کے دل پر مایوسانہ اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتا۔ شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہیں تھی۔ وہ سراپا یاس وحرمان تھے اور یہی حال ان کے کلام کا ہے گویا اُن کا کلام اُنکی طبیعت وسیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت وحقیقت سے خالی نہیں۔ وہ دور از کار استعارات بعید از قیاس مبالغہ اور خلاف عادت امور سے پاک ہے بھونڈے اور بیجا تکلف اور تصنع اور فضول لفاظی کا نام نہیں وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ سشتہ اور صاف زبان میں ظاہر کرتے ہیں میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہے ورنہ اُنکی ضخیم کلیات میں رطب ویابس سب کچھ بھرا پڑا ہے مولانا آزاد نے اُن کے کلام کی نسبت اپنے تذکرہ میں صحیح لکھا ہے کہ "پستش بغایت پست و بلندیش بغایت بلند است" اس مقام پر مولانا حالی کی عام رائے کا نقل کردینا جو اُنھوں نے شعراء کی نسبت لکھی ہے لطف سے خالی نہ ہوگا" یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اوستاد مانے گئے ہیں یا جن کو اوستاد ماننا چاہیئے اُن میں ایک بھی ایسا نہ نکلیگا جس کا تمام کلام اول سے آخر تک حسن لطافت کے اعلی درجہ پر واقع ہوا ہو۔ کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہوسکتی ہے۔ شاعر کی موج کمال یہ ہے کہ اس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو

اور کھیں کھیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے
جس سے شاعر کا کلام خاص وعام کے دلوں پر نقش ہوجائے
البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے عام اشعار بھی خاص خاص
اشخاص کے دل پر تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اس کا خاص
کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات
اُس شاعر کے کلام میں پائی جاسکتی ہے۔ جس کا کلام سادہ
اور نیچرل ہو"

میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر
آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں
معمولی اور بے شور وشر نظر آتی ہے لیکن اسکے نیچے ہزاروں
لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں۔ اسیطرح
اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملایم دھیمے سلیس اور سادہ
ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا
ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر
دھوکہ دیتی ہے وہ اُن پر سے بے خبر گذر جاتے ہیں اور یہ
نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب
میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں۔ میر صاحب کا کلام اس بارے
میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔
بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے قدیم الفاظ یا
محاورے یا متروک ترکیب کو دیکھکر شعر کو چھوڑ دیتے ہیں اور
یہ نہیں دیکھتے کہ انہیں الفاظ یا ترکیب نے جسے وہ متروک سمجھتے ہیں

خاص لطف پیدا کر دیا ہے - یا کم سے کم وہ شعر کے حسن میں حارج نہیں
میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں - جس سے
اُن کے کلام کی حسن وخوبی اور اُنکے خاص انداز کا اندازہ ہوسکتا ہے

ہمارے آگے تیرا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہمنے تھام تھام لیا
میر سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائے گا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا۔
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دعا نے کام کیا۔
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔
عہد جوانی رورو کاٹا - پیری میں لی آنکھیں موند۔
یعنے رات بہت تھے جاگے - صبح ہی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی۔
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل۔
ایک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

کیونکر گلی سے اس کی میں اوٹھ کے چلا جاتا۔
یہاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا۔
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منھ۔
کل میر کھڑا تھا یہاں سچ ہے کہ دوانا تھا

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ایک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ ہی پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی۔

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر ایک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

جب نام تیرا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

متصل روتے رہیے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

شام سے کچھ بجھا سے رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط
اس کے ڈر جانے کی حسرت بھی ہے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس آخری شعر کے متعلق مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ دیوان میں ایک بہت ہی پرُ لطف لطیفہ لکھا ہے جس سے نہ صرف اس شعر کی خوبی بلکہ میر صاحب کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مولانا آرزو کے مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے میر کا یہ شعر پڑھا گیا۔ شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندہ کر دکھائے سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوے مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا نے کہا قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔

مولانا حالی نے اسی شعر کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے

"ظاہر ہے کہ جوشِ جنوں میں گریباں یا دامن یا دونوں چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانہ سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں ایسے چیتھڑے ہوئے مضمون کو میر نے باوجود غایت درجہ کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے نرالے اور دل‌کش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں

بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے پھیکا ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے ۔

یہی خوبی میر کے تمام منتخب کلام میں پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ چند اشعار جو نمونے کے طور پر لکھے گئے ہیں انکے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست وفصاحت کے ساتھ پیرایہ بیان کسقدر دلکش نرالا اور پُرتاثیر ہے ۔

یوں میر صاحب کے تمام نامور ہمعصروں کے کلام میں سادگی ، صفائی روزمرہ کی پابندی پائی جاتی ہے لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی جبتک کہ بیان میں تازگی ادائے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی اور جدت نہ ہو میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں ایک جا جمع ہیں اور پھر اس پہ درد اور تاثیر خداداد معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز اور اردو شاعروں میں خاص درجہ کرا لیتے ہیں اور اُن کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے ۔ البتہ خواجہ میر درد ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سلاست وفصاحت زبان کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے بیاں میں جدت اور تازگی کہیں پائی جاتی ہے وہ میر صاحب کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں ۔ لیکن بیان میں وہ گھلاوٹ نہیں جو میر صاحب کے ہاں ہے ۔ اور نہ غایت درجہ سلاست اور سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے ۔ اور خصوصاً بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں ایک خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آتا میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں ہے ✤

تعلیم میں قوت متخیلہ کی نشو و نما

محمد زاہد کریم صاحب بی۔اے۔ایل۔ٹی۔ایم۔آر۔اے۔ای۔سی۔
سینیر سائنس اسسٹنٹ دارالعلوم (فوقانیہ) حیدرآباد دکن۔

حافظہ اور تخیل کا مقابلہ — عام اصطلاح میں حافظہ سے مراد کسی تصور ذہنی یا واقعہ کا استحضار ہے جو کسی لفظ یا جملہ کے اشارہ پر بذریعۂ تسلسل دیگر اشیاء و دیگر تصورات ذہنی (جن سے بوقت حصول یہ تصور یا واقعہ مربوط رہ چکا ہے) عمل میں آئے۔ تخیل بھی مثل حافظہ کے تصورات ذہنی سے متعلق ہے مگر یہ تصورات فعل نفسی سے مرتب یا مبدل یا منقول ہوجاتے ہیں۔ اُن میں کمی بیشی بھی عمل میں آسکتی ہے۔ بعض تصور متروک ہوسکتے ہیں اور بعض میں ازدیاد بھی ممکن ہے۔ اس طور پر ہمارے علم میں جو بذریعہ مشاہدہ حاصل ہوا ہے اور بذریعۂ حافظہ اُس کا تحفظ عمل میں آیا ہے توسیع ہوسکتی ہے۔ اُس قوت نفسی کا نام جس کے ذریعہ ہم اُن تصورات کو جو بذریعۂ حافظہ فراہم ہوے ہیں لیکر کسی اور طور پر مرتب کرتے ہیں تاکہ تجربہ اصلی سابقہ کے علاوہ اور نئی قسم کی واقفیت بھی حاصل ہو قوت متخیلہ ہے۔

بعض اسباق کے ذریعہ قوت متخیلہ کی توضیح۔ — فرض کرو کہ ایک طالب علم نے جو افضل گنج میں رھتا ہے اکثر پل چادر گھاٹ رزیڈنسی اور ملک پیٹھ کا معائنہ کیا ہے۔ صرف پل کا ذکر کسی وقت سننے پر اس کے دل میں صرف پل ھی کا نہیں بلکہ اس کے ایک جانب رزیڈنسی اور دوسری جانب ملک پیٹھ کا بھی تصور ہوتا ہے یہانتک

صرف حافظہ کا کام ہے مگر فرض کرو کہ بیٹر کے ایک طالب علم کو انہیں واقعات پر سبق دیا جا رہا ہے اُس کو بلدہ کے متوطن طالب علم کیطرح راست مشاہدہ کا موقع نہیں ملا ہے اس لئے قوت حافظہ کے پاس بغرض عمل سرمایہ نہیں ہے اب تحصیل علم کا کیا ذریعہ ہونا چاہئے اس لڑکے نے بنڈ سورا ندی کو دیکھا ہے اس کو ندی کی ہر دو جانب محلات و مشہور عمارات سے واقفیت ہے اور جب کبھی ان کا نام لیا جائے تو صیح تصور اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہے یہانتک اُس کا ذاتی تجربہ ہے اور ذخیرۂ واقفیت میں ابھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے مگر اب اپنے اُستاد کی حسب ہدایت وہ ندی کو خوب چوڑا سمجھتا ہے اُس پر ایک عالیشان پل خیال میں تعمیر کرتا ہے اس کے ایک جانب بجائے کاغذی دروازہ اور محلۂ دھونڈہ پوڑ کے وہ کوٹھی اور محلہ رزیڈنسی تصور کرتا ہے اور دوسری جانب بجائے پیٹھ کے ملک پیٹھ سمجھتا ہے۔ نقشوں تصاویر اور استاد کے بیان سے بھی مدد ملتی ہے اور جو واقفیت درحقیقت اُس کو سابق میں حاصل ہوئی تھی ان جدید معلومات کی بنا پر اُن میں ایک جدید تبدیلی عمل میں آتی ہے اسطور پر قوت حافظہ کے فراہم کردہ تصورات کی جو نئی ترتیب عمل میں آتی ہے وہ اُس قوت ذہنی کا فعل ہے جس کو قوت متخیلہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بچہ بہت سا علم اپنے ملک و نیز غیر ممالک کے جغرافیہ کا قوت متخیلہ کے ذریعہ حاصل کرتا ہے یہ قوت عقلیہ اُس مواد سے جو بذریعۂ مشاہدۂ اصلی اشیاء و معائنہ تصاویر و نمونجات و نقشہ جات وغیرہ سے حاصل

ہوتا ہے کام لیکر ایک نئی واقفیت فراہم کرلیتی ہے - جب ہم اُسکا خیال کرتے ہیں کہ جملہ وقفیت متعلق نمائش طبعی - شکل وشباہت ورسوم ورواجات باشندگان ممالک جنکا تجربۂ اصلی ہمارے احاطۂ قدرت سے باہر ہے صرف بوساطت قوت متخیلہ اس مواد کی تبدیلی وترکیب سے حاصل ہوتی ہے جو بذریعۂ مشاہدہ وغور فراہم ہوتا ہے اور ذہن میں محفوظ رہتا ہے تو دو اصول ہمارے ہاتھ لگتے ہیں اول تو یہ کہ جدید واقفیت کے حصول میں قوت متخیلہ کو کسقدر دخل اور اُس کی کتنی اہمیت ہے دوسرے یہ کہ مشاہدہ کے ذریعۂ سے کافی سرمایہ جمع کرنے کی کسقدر ضرورت ہے جسپر جدید واقفیت کی بنا قایم ہوسکتی ہے - طلبہ کی حالتوں میں بلحاظ واقفیت سابقہ بہت کچھ اختلاف ہوتا ہے جس مدرس کو ان طلبہ سے سابقہ پڑتا ہے جو بڑے شہروں کے درمیانی حصص میں رہتے ہیں اُس کو معلوم ہوگا کہ قدرتی واقعات کے متعلق ایسے طلبہ کی واقفیت بہت ہی محدود ہوتی ہے اس صورت میں تصاویر نمونہ جات اور وقتاً فوقتاً سیروسیاحت ؛ توفیر واقفیت کے لئے لازمی ہیں - مگر جو طلبہ پہاڑ وادی ندی چٹانوں وغیرہ کی قربت میں زندگی بسر کرتے ہیں اُن کو اس قسم کی توسیع واقفیت میں بہت کچھ امداد ملجاتی ہے ایسے طلبہ مختلف قدرتی اشیاء کا مشاہدہ راست طور پر کئے ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان باتوں کے متعلق اِن کے تصورات ذہنی صاف اور صحیح ہوتے ہیں اور اسی بنا پر اُن کی جدید ترکیب جو بذریعۂ قوت متخیلہ عمل میں آتی ہے واضح اور درست ہوتی ہے

دیہاتی طلبہ بہ نسبت شہری طلبہ کے اچھے متعلم جغرافیہ ثابت ہوتے ہیں۔ خود مدرس کے لئے جو تلامذہ کی قوت متخیلہ سے کام لینا چاہتا ہے لازمی ہے کہ خود اوس کے تصورات حتی الامکان بذریعۂ اصل مشاہدہ اشیاء قدرتی حاصل کئے گئے ہوں اور وسیع تجربہ ذاتی پر مبنی مصفا اور درست ہوں۔ ایک مدرس ہے کہ کسی جماعت میں ایک ضلع کا حال پڑھاتے وقت محض مطالعہ کتب درسی کی بنا پر بیان کر رہا ہے اور اسی قسم کی جماعت کو ایک اور مدرس تجربہ ذاتی کی بنا پر تعلیم دے رہا ہے۔ دونوں کی تعلیم کے اثر میں ایک بین فرق ہونا چاہیئے! صورت اولی میں سبق خالی از دلچسپی اور غیر محرک ہے اور واقعات بذریعۂ اعادہ او تکرار یاد کئے جاتے ہیں جو باعث بار دماغ ہے حالت ثانیہ میں کیفیت ملاحظہ کیجئے زبان سادہ ہے۔ ترتیب واقعات طبعی ہے۔ اوستاد کی زبان میں تحریک کا اثر ہے حرکات و سکنات سے بیان میں امداد مل رہی ہے اور بچوں کے تصورات کے لئے بطور رہبری کام دے رہی ہے اوستاد کے طریقہ تعلیم میں تاثیر موجود ہے جو عمل قوت متخیلہ کے لئے ضروریات سے ہے کل سلسلہ واقعات مدرس کے ذہن میں تازہ ہے بچوں کے حافظہ کی ترتیب ہو رہی ہے کیونکہ اوستاد کے الفاظ کے ذریعہ اون کے دلوں میں تصورات قایم ہو رہے ہیں اور موجودہ تصورات کی ایک نئی ترکیب عمل میں آ رہی ہے جو حصول تعلیم کی اصلی غرض اور خاص مدعا ہے فقط

حضرت علی مرتضیٰ

نصیر الدین صاحب ہاشمی معتمد انجمن ثمرۃ الادب دار العلوم کالج سرکار عالی

سید مرحوم کا قول ہے " وہ قوم بدنصیب ہے جس کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل ہو اور اُس کو یاد نہو " تمام دنیا کے متمدن ممالک اور مہذب اقوام میں اس امر کی شدید ضرورت تسلیم کی گئی ہے کہ ملک اور قوم کی تاریخ صحت سے اور نہ صرف صحت سے بلکہ اس طریقہ سے مرتب ہوتی رہے کہ قومی عظمت اور محبت قوم کے دل میں راسخ کریگی اسی خیال کو ملحوظ رکھکر یورپ اور امریکہ میں تاریخیں مرتب کیجاتی ہیں اور مشہور اشخاص کے حالات قلمبند کئے جاتے ہیں تاکہ قوم اپنے سامنے کے کارناموں سے واقف ہو اور سمجھے کہ ہمارے پیشروؤں نے کیا کیا ہے۔

اگرچہ زبان اردو میں بعض اشخاص کے حالات موجود ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی خلفا اور علما و حکما کے حالات مجملاً اس طور سے قلمبند کئے جائیں کہ اُن سے عام طلبہ جو بڑی بڑی کتابیں مطالعہ نہیں کرسکتے آسانی کیساتھ اپنے سلف کے صحیح حالات سے مختصراً واقف ہوجائیں بالفعل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حالات قلمبند کئے جاتے ہیں آئندہ ایک سلسلہ مضامین کا ایسا شروع کیا جائیگا جو ایک حدتک ہماری ضرورتوں کو پورا کرسکے۔

نام و نسب۔ آپکا اسم گرامی علی اور کنیت ابوالحسن اور ابوتراب تھی آپ آنحضرت صلعم کے سگے چچازاد بھائی اور داماد تھے آنحضرت نے آپکو زمانہ طفلی ہی سے اپنے زیرنگرانی پرورش و تربیت فرمائی تھی اور اب از روئے مواخات سے

مدینہ منورہ میں آنحضرت نے لوگوں میں برادری قائم فرمائی تھی جسمیں ہر ایک صحابی ایک کا بھائی مقرر کیا گیا تھا

رسول صلعم کے بھائی بھی تھے ✦
آپ نے بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول فرمایا چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ بعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم الاثنین واسلمت یوم الثلثاء۔ بوقت اسلام آپکی عمر آٹھ یا نو یا دس سال کی تھی آنحضرت جب ہجرت فرمائے مدینہ ہوئے تو آپ بحکم آنحضرت صلعم مکہ میں امانتیں اور وصیتیں لوگوں کو پہونچانے کے لئے رہ گئے اور اسکے بعد نبی صلعم کے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے۔ آپ آنحضرت کے ساتھ بدر۔ اُحد۔ اور دوسری تمام جنگوں میں شریک رہے سوائے جنگ تبوک کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مدینہ میں اپنا خلیفہ مقرر فرما گئے تھے اس کے علاوہ اکثر دفعہ جناب سرورِ کائنات نے لشکر کا علم آپکو عطا فرمایا ہے احد اور حنین کے جنگوں میں آپ نہایت ثابت قدم رہے جنگ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکو جھنڈا عطا فرماتے ہوئے یہ خبر دی کہ خیبر آپ کے ہی ہاتوں فتح ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

خلافت۔ | حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دوسرے دن جملہ اصحاب مدینہ نے بطوع خاطر آپکے ہاتھ پر بیعت فرمائی ✦

حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما مکہ تشریف لیگئے اور حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ کو ساتھ لیکر بصرہ گئے اور وہاں سے حضرت عثمان کے خونکا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؓ نے بہت کچھ چاہا کہ صلح ہوجائے مگر صلح نہوئی آخر بصرہ کے قریب جمادی الثانی ۳۶ھ میں جنگ جمل واقع ہوئی جس میں طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نہایت راحت وآرام وعزت واحترام سے مدینہ منورہ

روانہ فرمایا انتقال کے پیشتر حضرت طلحہ و زبیرؓ نے اپنے قصور پر ندامت ظاہر کی۔ اس عرصہ میں امیر معاویہؓ نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ملک شام کے گورنر تھے خروج کیا ۳۷ھ میں بمقام صفین صف آرائی ہوئی اور کئی روز کے جنگ و جدل کے بعد تحکیم کے فیصلہ پر صلح قرار پائی اور ایک سال کیلئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ تشریف فرما ہوئے اور امیر معاویہؓ نے شام کی راہ لی۔ اسی قضیہ میں آپکے ساتھیوں میں سے ایک جماعت آپ سے علٰحدہ ہوگئی جو خوارج کہلائے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت علی نے حکم خدا و رسول کے خلاف تحکیم [illegible] کئے ہیں حضرت ابن عباس نے منجانب حضرت علی ان کا مقابلہ کیا کچھ لوگ تو جنگ کے بعد توبہ کرکے حضرت علی کے ساتھ ہوگئے اور کچھ لوگ نہروان کی طرف چلے گئے +

دوسرے سال حسب قرار داد ماہ شعبان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ابو موسیٰ الاشعری اور امیر معاویہ کی طرف سے عمرو ابن العاص مقام اذرح میں جمع ہوئے اور دونوں اصحاب باہم اس امر پر متفق ہوئے تھے کہ حضرت علی اور امیر معاویہ معزول کئے جائیں اور کوئی دوسرا خلیفہ مقرر ہو چنانچہ موسیٰ الاشعریؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے معزول کرنے کا اعلان کیا لیکن عمر بن العاصؓ نے خلافت کیا اور معاویہ کو خلیفہ مقرر کردیا اس فیصلہ پر سخت اختلاف پیدا ہوگیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لوگوں نے بدستور خلیفہ قایم رکھا +

باقی آیندہ۔

ابو الاغلب تہا۔ راستہ مین اس نے رومیون سے بحری لڑائی لڑکے بہت سے جہاز غرق اور گرفتار کر لئے۔

اسی اثنا مین مسلمانون نے کوہ اٹنا کے اطراف کے کئی قلعہ اور فوجی مقامات کو فتح کئے اور دو مقامات پر شکست بھی کھائی۔ یہہ لڑائی یون ہی جاری تھی کہ سنہ ۲۲۳ھ کو سلطنت عباسیہ کا سعادت دستار زیادۃ اللہ والی افریقہ راہی ملک بقا ہوا اور محمد بن اغلب جانشین ہوا۔ اور فضل بن یعقوب نے سسلی مین خوب جوانمردی کے جوہر دکھائے اور شہر قسطانیہ۔ سرقوسہ۔ نوطس۔ اعوس کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس نے ایک رومی قیدی کی رہبری سے (عین اسوقت جبکہ جاڑے کا موسم تہا اور برف باری کثرت سے ہو رہی تھی) اپنے چہار باج کے ساتہہ شہر قصریانہ پر حملہ کرکے فتح کر لیا۔ وہ شہر جسکے فتح کرنے کے لئے بڑے بڑے لوگون نے ہمت ہار دی تہی فضل نے فتح کر لیا جب شہر فتح ہوگیا تو فی الفور ایک مسجد بنائی گئی اور جمعہ کے دن امیرالمومنین خلیفہ معتصم باللہ کے نام کا خطبہ پڑہا گیا فقط

ایک عرض

سرکار عالی کی درسگاہون سے شائع ہونے والا یہہ ہی پہلا رسالہ ہے۔ علم دوست اصحاب سے گذارش ہے کہ وہ توسیع اشاعت فرمائینگے۔ تاکہ طلبہ کی ہمت افزائی ہو۔

سلہ اٹنا سسلی مین ایک کوہ آتش فشان کا نام ہے جسے انگریزی مین (والکینو) کہتے ہین۔

ثمرۃ الادب

صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا

ایک دوسرے کو تھام رکھو اور آپس مین ملکر رہو۔

از مولوی ابو حامد سید محمود صاحب سبزواری

زبسم اللہ زینت بخش دیوان بنانم را آلٰہی آشنائے نام خود گردان زبانم را

قدرت کا منشاء

اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی مذہب کے پیرو رہین۔ اور تمام جہان مین ایک ہی مذہب رہے تو کیا اُس کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ بالکل آسان کام نہ تھا؟

جس قدرت نے قسم قسم کی مخلوق اور انواع واقسام کے مذاہب و ملل پیدا کردئے ہین۔ اُس کے لئے ایک ہی نوع کی چیزین اور ایک ہی قسم کے مذہب کا پیدا کرنا کونسا مشکل کام تھا؟ مگر نہین!

ایسا ہوتا تو تعریف کی بات ہی کیا تھی بلکہ اِس فعل سے اُس کی کمزوری اور بے بضاعتی ثابت ہوتی۔ اور بھلے بُرے کی تمیز نہ رہتی اور زندگی کا کچھہ مزا نہ آتا۔ دیکھو اگر سب مرد ہی مرد ہوتے یا سب عورتین ہی عورتین ہوتین یا تمام درخت ہی درخت ہوتے یا پتھر ہی پتھر یا اسپنے جسم پر آپ قیاس کیجیے کہ اگر

وكفه بالايادي الجم ممطرة | كمد جن صيب هام ومنهمر
خليله ابدا بالفوز مبتهج | عدوه دائما في الذل والخطر
اقوى الرسوم بهذي الدهر من رسل | وليس يبقى لهم في الوحي من اثر
اتى بنور من الظلمات اخرجهم | وفيهم ليس من هاد ومدكر
اللطف في قوله كالحلو في رطب | والخلق في ذاته كالطيب في الزهر
ان كان من بشر قد كان فاقسم | الا ترى ان ياقوتا من الحجر
وجوده اصل كل الخلق في ازل | فدونه ليس من عين ولا اثر
وكل نجم سليب عنه وجدته | حتى هلاله الى قصد عن الزور
ومن خوارقه تشقيقه قمرا | واسرا ثما الليل من اياته الكبر
وخير من رتل القرآن ليلته | امام من بسط السجاد في السحر
وخير من طاف حول البيت محرم | وخير من دلف منهم ومعتمر
وان يكن نفث الاعداء في عقد | ثما اتوه بشئ ليس في قدر
وان حب حبيب الله في خلدي | وهمتي مثل جذر غير منقعر
بل حبه بجميع القلب ممتزج | يسيل في روضتي كالماء في نهر
وكفه كهف عاف مجتد ضرم | وسيفه كافل للفتح والظفر
ما للمنافق ان يبطن كشاحته | وليس يعزب عنه كل مستتر
وصحبه سادة فيهم مهاجرة | مكرمون واهل الفوز والظفر
وبات في بيته ليث براثنه | مصقولة كغرار الصارم البتر
ضرغامة مكتهم اغلب هصر | تطير لحظاته بالغيظ كالشرر
اذا سعر الحرب في الاعداء قسورة | استنفروا منه في الهيجاء كالحمر
وكان من صحبه الاتقى فضائله | حوت على كل خلق كان في البشر

هم افضل الناس لاكن ليس احدهم — اولى به من ابى بكر و من عمر

وحل فى الثور ليلاً مع ابى بكر — كانه قرن الضحضاح بالقمر

وصحبه اذ تبغوا الماء من عطش — صبت اصابعه ماءً من الغمر

الخير منه مكان النور من نظر — والشر منه مكان الارض من قمر

وغالنى الدهر فى لهو وفى لعب — وساقنى بهجة الدنيا الى خطر

وان عمرى لعمرى زائل ابداً — كانه مثل ظل الشمس فى السفر

وليس آمن دهراً عند سطوته — وليس شيئ من الدنيا بمستمر

نفسى على الغى والخسران دائبة — والعقل اعمى وقلبى سيئ البصر

يا هادى الناس ارحمنى وخذ بيدى
ونجنى عن طريق الزيغ والعور

"تعلیمی نقطے سے عہد عثمانی کے برکات"

(از نصیر الدین ہاشمی متعلم عثمانیہ یونیورسٹی)

دنیا کے کسی مذہب اور کسی اصلاحی تحریک نے بنی نوع انسان کو حصول تعلیم کے لئے اس قدر شد و مد سے آمادہ نہیں کیا جتنا کہ اسلام نے اسلام اور علم توام ہیں اور ان کا انفکاک تقریباً محال ہے۔ دنیا کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ کسی مذہب اور کسی اصلاحی تحریک یا کسی قوم اور گروہ نے اسقدر جلد اتنی وسعت حاصل نہیں کی جس قدر کہ مذہب اسلام نے۔ اسلامی تاریخ کے صفحے آپکو بتا دینگے کہ

عرب جیسی جاہل بادیہ نشین قوم دفعتاً کتم جہالت سے ساحت علم مین جلوہ گر ہو کر میدان تمدن و تہذیب مین کس طرح گوئے سبقت لیگئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ عربون نے ایسی ترقی کی کہ گو جہان سے اون کی سلطنت اٹھ گئی۔ لیکن اونکا تمدن دنیا مین زندہ جاوید ہے۔ اور جب تک دنیا مین اسلام کے پیرو باقی رہین گے باقی رہیگا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے۔

"دنیا کی ہر ایک قوم نے اپنے زمانہ مین ترقی کی اور چلے گئے اور اون کے آثار کسی کے کچھ کھنڈر رہ گئے اور کسی کے تو یہ بھی نہین۔ عربون نے اپنے زمانہ مین ترقی کی اور چلے گئے۔ لیکن اون کا تمدن اون کا علم زندہ ہے۔ اور اپنے بانیون کی یاد تازہ کرتا ہے۔"

آنحضرت صلعم کا ارشاد طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة اس قدر جلد عربون کی ایسی ترقی کا باعث ہوا اور آپ کے ارشاد ہی کی تعمیل تھی کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عبرانی زبان چند دن مین حاصل کر لی۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کلام مبارک کی برکت تھی کہ مسلمان متعدد جلیل القدر اور عظیم الشان علوم کے موجد ہوئے۔ اور اوس وقت کے علوم متداولہ کو ترقی دے کر دنیا کے ہر ایک ملک مین پھیلا دیا۔ یہ اسلامی تعلیم ہی کی برکت تھی۔ کہ ہر جگہ وحشی سے وحشی قومون مین بھی مسلمانون کی بدولت اہل علم و کمال پیدا ہو گئے۔ جس زمانہ مین کہ سب قومین جہالت کے قعر عمیق مین تھین مسلمانون مین علم کا سمندر موجین مار رہا تھا۔

اسلام کی علمی فیض بخشی دور دراز ملکون مین بھی ہوئی۔ اور اہل یورپ بھی مسلمانون ہی کے علوم سے بہرہ یاب ہوئے۔ مسلمانون ہی کے وجہ سے یورپ مین علم اور فلسفہ پہونچا۔ اور اس استادی کے احسان سے یورپ کی

پشت ہمیشہ جھکی رہے گی۔ چنانچہ اڈگر سینڈس اپنی تاریخ دنیا مین لکھتاہی عُرب فاتحون نے حصول علوم و فنون مین بہت جلد اسی قدر ترقی کر لی کہ جتنی کہ اون کی فوجی قوت مین ترقی ہوئی تھی۔ عربون نے تہذیب خود حاصل کرکے بڑی سرگرمی کے ساتھ اس کو ہر جگہ پہیلا دیا۔ بڑے بڑے شہر انکی حکومت مین تعمیر ہونے لگے تجارت اور کارخانون نے بڑی ترقی حاصل کی مدارس اور کالج تمام اسلامی دنیا مین بن گئے۔ اور ان مین علوم فنون پڑہائے اور سکھائے جانے لگے۔ عربون مین علم و فضل اور شاعری اور تمام علوم و فنون کا رواج اوس وقت بھی بڑے عروج پر تھا جبکہ یورپ مین تہذیب اور علم و ہنر نہین پہیلے تھے۔ اور جو زمانہ کہ یورپ کی تاریخ مین بہت تاریک زمانہ کہلاتا ہے۔ مسلمانون کی وسیع سلطنت اس زمانہ مین نہایت روشن سلطنت تھی۔ اپنی تمام ممالکت مین عربون نے علم پہیلا دیا۔

بارہوین صدی کے آغاز مین اقلیدس۔ علم ہندسہ۔ ہیئت اور علوم طبعی یورپ مین عربون ہی کی وجہ سے پہنچے یعنی یہ سب علوم عربی زبان مین موجود تھے جو یورپ مین لائے گئے۔ اندلس کے مسلمانون مین تو علوم و فنون صنعت اور حرفت کا چرچا دسوین صدی کے آغاز ہی مین درجۂ کمال پر تھا۔ وہان مسلمانون کے مدرسے کتب خانے اور یونیورسٹیان موجود تھین۔ علماء اور فضلاء علم ادب منطق۔ فلسفہ۔ فصاحت۔ بلاغت۔ نجوم۔ حساب علم ریاضی کے سبق طالب علمون کو پڑہایا کرتے تھے۔ یونانیون کی فلسفہ کی کتابین سب سے پہلے عربون ہی نے اپنی زبان مین ترجمہ کر لی تھین۔ پھر یورپ والون نے عربی ترجمون سے لاطینی مین ترجمہ کیا اور اس طرح سے علم فلسفہ بذریعہ عربون کے یورپ مین پونچا۔ کیونکہ اس زمانہ کے یورپین

فضلا ء مین چند ہی قدیم یونانی زبان سمجھ سکتے تھے ۔ علم حیوانات ۔ علم نباتات علم کیمیا اور خاص کر علم طب اور حکمت کا مسلمانون کو بہت شوق تھا۔ اسپین کے مسلمانون کے ہم سب یورپ والے اس بات مین ممنون ہین کہ علم حساب اور عددون کا لکھنا یورپ والون کو مسلمانون کی وجہ سے آیا ہے۔

غرض دنیائے اسلام مین علوم وفنون کی روشنی چارون طرف پھیلی ہوئی تھی ۔ منگولیا ۔ تاتار ۔ ایران ۔ عراق ۔ شام ۔ مصر ۔ شمالی افریقہ مراکش فیض اور اندلس مین کثرت سے مدرسے اور درس گاہین موجود تھین ۔ عرب کے عظیم الشان سلطنت کے ایک کنارہ پر تو سمرقند کا مشہور مدرسہ اور رصدگاہ تھی ۔ اور دوسرے کنارہ پر اندلس کا شہرآفاق منارہ ترصد آسمان سے باتین کر رہا تھا ۔

ہندوستان مین گو کوئی ایسی عظیم الشان درس گاہ مثل نظامیہ بغداد اور مستنصریہ کے قایم نہین ہوئی ۔ لیکن بیدر کا مدرسہ محمودیہ یادگار ہے جس کے لئے محقق دوانی اور جامی جیسے نامور باکمال طلب ہوئے تھے ۔ اس کے علاوہ علمی عام فیاضیون سے ہندوستان بھرا پڑا ہے ۔ اکبر ۔ جہانگیر ۔ شاہ جہان ۔ عالمگیر کے خزانۂ شاہی سے عموماً ان لوگون کے لئے جاگیرین اور وظیفے مقرر تھے جو بطور خود درس تدریس کرتے تھے ۔ خاندان مغلیہ کی شاہی بیگیات کی جانب سے طالبعلمون کے لئے روزینے مقرر کئے جاتے تھے ۔

شیخ عبدالحق دہلوی ۔ ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ شاہ ولی اللہ صاحب بحرالعلوم وغیرہم کے اسمائے گرامی ہندوستان کی علمی ترقی ظاہر کرنے کے لئے جلی حرفون مین لکھے جا سکتے ہین اور بقول مولانا شبلی اُس وقت کے متمدن اقوام باوجود ایسے نامور مدارس کے نتیجہ مین ہندوستان

گذشتہ ترقی سے کم ہیں"۔

جب دہلی سونی ہو گئی تو دہلی کے اہل علم و فن لکھنو اور حیدر آباد میں آباد ہو گئے لکھنو کی تباہی کے بعد صرف حیدر آباد فرخندہ بنیاد ہی منبع علم و ہنر رہ گیا۔ اگر اسوقت کے علم دوست اور معارف پسند اشبیلیہ قرطبہ اور بغداد سمرقند و بخارا اور دہلی کو بحسرت یاد کرتے ہیں تو ان کے لئے حیدر آباد دکن مایۂ تسلی ہے کہ یہاں علمی معارف و فضائل کی روشنی از سرنو زندہ ہو رہی ہے۔

اعلیحضرت خلداللہ ملکہ کا سریر آرائے سلطنت ہونا ہی تھا کہ ایک عہد جدید کا آغاز ہو گیا۔ خداوند کریم نے اعلیحضرت معظم کی ذات ستودہ صفات میں ایسے ایسے کمالات جمع کر دیے ہیں کہ حضرت کی ذات نہ صرف سیاسی نظم و نسق کے لحاظ سے سرآمد روزگار ہے اور مہام سلطنت کی عقدہ کشائی ان کا ناخن تدبیر ہے۔ بلکہ علم پرستی اور دین پروری کے گراں مایہ اوصاف سے بھی حضور عالی مقام خاص طور سے متصف ہیں۔ اسی لئے نہ صرف رعایائے آصفیہ کا آپ پر فخر و ناز بجا ہے۔ بلکہ کل باشندگان ہند اور علی الخصوص مسلمانان ہند کو ایسے حامی علم و دین کے لئے ہر وقت دست بدعا رہنا زیبا ہے۔

جلالت مآب اعلیحضرت کے عہد میمنت مہد میں دکن نے علم و فن میں جو ترقی کی ہے اوس کی تفصیل ایک دفتر کی محتاج ہے۔ اور میرا مختصر سا مضمون اس کے لئے ہرگز کافی نہیں۔

تعلیمی ترقی ہر ایک ممکن ذریعہ سے عمل میں لائی جارہی ہے۔ ہر ہر گوشہ سے ارباب علم اصحاب تقوی چن چن کر تفکرات دنیوی سے فارغ البال کئے جارہے ہیں تاکہ ان کے فیوض و میامن سے دنیا منور ہو جائے۔ ان سبکا احصار خارج از حصر ہے۔

مولانا شبلی کے وظیفہ مین ترقی ہوئی تاکہ زبان اردو کو تاریخ کے موتیون سے مالا مال کر دیا جائے۔ شرر صاحب کو وظیفہ ملا تاکہ اردو تاریخ اور ادب کو رونق ہو۔ سید احمد صاحب دہلوی کو وظیفہ عطا ہوا تاکہ اردو لغت مرتب ہو۔ تصانیف امیر خسرو اور قانون مسعودی کے طبع کے لئے خاص امداد منظور ہوئی۔ مدرسہ دیوبند کی امداد مین اضافہ۔ اجمیر مین ایک عالیشان دینی مدرسہ کا قیام۔ بدایون۔ کولا پور۔ الہ آباد کے دینی مدارس کو واجبی امداد آپ کے دریائے احسان کے چند قطرے ہین۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس ہر روز کی فکر سے مستغنی اور مستقل طور سے کام انجام دے رہی ہے تو اسی دریا نوال شاہ کے زیر عاطفت مدارس کا عثمانیہ کالج۔ مجوزہ سلطانیہ کالج۔ سکندر آباد کا مدرسہ اسلامیہ اٹاوہ کا اسلامیہ ہائی اسکول۔ شبلی صاحب کا دار المصنفین حالی میموریل اسکول انجمن اسلامیہ بمبئی۔ دہلی کا طبیہ کالج یہ سب اعلیحضرت جلالت مآب کے بذل و ایثار سے کافی طور پر بہرہ انداز ہین۔

ہندوستان کے مادری زبان کی انجمن کو آج معراج ترقی نصیب ہوئی تو اسی سرکار کے فیاضی و دریا دلی کے باعث۔

اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل ایسے ہین جن کو سرکار کے فیاضی سے کافی حصہ ملا۔

اعلیحضرت بندگان عالی کے گران بہا عطیہ مسلم یونیورسٹی سے ہمارے کان ناآشنا نہین ہین۔

اعلیحضرت ظل سبحانی ہی کے عہد حکومت مین حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرس قایم ہوئی۔ اور ملک مین مدارس کی تعداد مین اضافہ ہونے لگا۔

ان تمام امور کے قطع نظر اعلیحضرت کا ایک جدید اور اہم ترین علمی کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے۔ جس کے ذریعہ نہ صرف حیدرآباد و بلکہ ہندوستان بھی علم و سائنس کی صف اول مین آجائیگا۔

انشاء اللہ وہ دن دور نہین ہے جبکہ اس یونیورسٹی سے جس کا اصلی عنصر مذہبی اور روحانی برکات ہونگے حیدرآباد تمام دنیا مین حکمت حقہ کا سب سے اہم اور عظیم الشان مرکز ہوگا۔

ہندوستان کے علمی حلقون کی یہ متفقہ امید ہے کہ " یہ دار الفنون اعلیحضرت کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پہ موجودہ اور آئندہ نسلین ہمیشہ فخر و ناز کیا کرینگی اور اس چشمہ سے ایسے ایسے دریا رواں ہونگے جو دین اور دنیا کے چمنون کو سیراب کردین گے" جو گران مایہ خدمت مامون رشید نے عربی زبان کی تھی یعنی علوم و فنون تراجم کے ذریعہ عربی زبان مین منتقل کرائے تھے وہی اعلیحضرت نے اردو کے لئے فرمائی ہے۔

مدرسہ دار العلوم کے (جو سرکاری عظیم الشان اور قدیم درس گاہ ہے) دن پھرلے اور اس کو عثمانیہ یونیورسٹی کا کالج منتخب کیا گیا۔ اور آج اوسی کی چاردیواری سے یہ پہلا علمی رسالہ جاری ہوا۔ تاکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لائق اساتذہ کی علمی تحقیقات کو باشندگان ملک اور قوم کے سامنے پیش کرے دنیا مین کوئی شہریار معارف دستگاہ ایسا نہ ملیگا کہ جو خیر و برکت کے خزانے بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے اس طرح بے دریغ لٹا رہا ہو خدا ایسے بادشاہ علم پرور کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے سرون پر قایم رکھے۔ اور اس کے سایہ مین دار العلوم کو دنیا مین علم و حکمت کا نامورترین مرکز بنائے۔ آمین ثم آمین۔

نصیر ہاشمی

سنہ فصلی کی تحقیق اور اوس کی بعض ضروری اصلاحین

مولوی محمد عبدالواسع صاحب پروفیسر دارالعلوم اڈیٹر رسالہ ہذا

تقریباً چار چھ مہینے ہوئے مین نے ایک رسالہ سنہ فصلی کی تحقیق مین لکھا تھا جو مجھ سے میرے لایق دوست مولوی عبدالحق صاحب ۔ بی ۔ اے معتمد انجمن ترقی اردو نے انجمن کی طرف سے طبع کرانے کے لئے لے لیا اور اُس کے طبع ہونے مین شاید فراہمی اشیار کے موجودہ دشواریون کے باعث تاخیر ہو رہی ہے اور سال فصلی قریب الختم ہے ۔ اس لئے اس مضمون مین اس کے ضروری اقتباسات شایع کئے جاتے ہین ۔ تاکہ ان پر توجہ فرمائی کا موقع مل سکے ۔

جنوبی ہند کا سال فصلی (۲) جنوبی ہند کا سنہ فصلی جو سنہ ۱۹۱۸ء مین سنہ ۱۳۳۷ھ و سنہ ۱۳۲۸ ف ہے سلطنت آصفیہ کے سرکاری دفاتر مین عموماً یہی سنہ رایج ہے ۔ ہمارا اصلی مقصد اسی سنہ کی تحقیقات اور اس کے نقایص کی اصلاح کی کوشش ہے یہ سنہ شمسی سال کے حساب سے ہے ۔ اور اس مین وہی فارسی مہینے مستعمل ہین ۔ جو سنہ جلالی یزدجردی وغیرہ مین مستعمل تھے ۔ لیکن اُن کے ایام کا شمار اس جدید ترتیب پر ہے جو سنہ الٰہی کے لئے بحکم اکبر اعظم ہوئے تھے ۔ اس سنہ کا مبدا ر کیا ہے اور اس کا رواج کب سے ہوا اور کیونکر ہوا ان باتون کا پتہ معتبر تاریخون مین کہین نہین چلتا اور نہ ہندوستان کے مرتبہ زیچون مین اس کا کہین ذکر ہے ۔ البتہ بعض معمولی کتابون مین جو اس کے متعلق لکھا ہے وہ درج ذیل ہے ۔

(۱) مولف غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ یہ فارسی سنہ شمسی ہے اور اس کا شمار ایام رومی سنہ کے شمار ایام کے برابر ہے پھر وہ اُس کا مبدار یزدجرد کے تخت نشینی سے بتاتا ہے اور سال کے ابتدار ماہ فروردی سے اور اختتام ماہ اسفندار پر قرار دیتا ہے۔

(۲) صاحب ملخص تسلیم نے لکھا ہے کہ یہ سنہ بھی اکبر کے زمانہ حکمرانی مین سنہ ۹۷۱ ہجری سے اُسی طرح رائج ہوا جیسا کہ شمالی ہند کا سنہ فصلی سنہ ۹۶۳ء سے رائج ہوا۔

(۳) ایک انگریزی صدسالہ جنتری مین لکھا ہے کہ شمالی ہند کے سنہ فصلی کے طرح یہ بھی کوئی مستقل سنہ نہین ہے بلکہ سنہ ۱۶۳۶ء مین جو سنہ قمری ہجری تھا وہی سنہ شمسی کر دیا گیا اور اس کا شمار بجائے عربی قمری مہینون کے فارسی شمسی مہینون سے ہونے لگا۔ اس لئے اتنے دنون مین سنہ ہجری اور سنہ فصلی مین نو سال کا فرق ہوگیا۔ اب ہم ان تینون قولون کی تنقید کرتے ہین۔ صاحب غیاث اللغات کا یہ بیان کہ یہ سنہ فارسی شمسی ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو کیونکہ اس سنہ مین مہینے وہی مستعمل ہین جو ایرانیون کے سنون مین مستعمل تھے۔ مگر اس کو سال یزدجردی قرار دینا بالکل غلط ہے اس لئے کہ یزدجرد تخت ایران پر سنہ ۶۳۲ یا سنہ ۶۳۳ء مین بیٹھا ہے۔ لہذا سنہ فصلی سنہ یزدجردی ہوتا تو اس کو بجائے سنہ ۱۲۸۶ کے سنہ ۱۲۲۶ یا سنہ ۱۲۸۵ ہونا چاہیئے تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سنہ یزدجردی نہین ہے بلکہ اگر پارسیون کا سنہ ہے تو انکا کوئی دوسرا سنہ ہے۔

صاحب ملخص تسلیم کا خیال بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے اور کسی حسابی یا تاریخی قیاس سے اس کی تائید نہین ہوتی بلکہ اون پر غور کرنے سے اس

قول کی غلطی عیان ہوجاتی ہے اولاً اس لئے کہ اس سنہ کا رواج صرف جنوبی ہند مین ہے۔ اور اکبر اعظم کے زمانہ مین ہندوستان کے یہ صوبے سلاطین مغلیہ کے زیر نگین نہ تھے بلکہ یہان مستقل سلطنتین قایم تھین پھر اکبر کے زمانہ مین ان ممالک مین دربار اکبری کا مرتبہ سال کیونکر رایج ہوسکتا تھا۔ ثانیاً اکبر کے عہد سلطنت مین سنہ فصلی کی بنیاد راجہ ٹوڈرمل نے قایم کی اور چونکہ وہ ہندو تھا اسلئے اُسنے اس کے مہینے ہندی رکھے۔ لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ سن بھی اکبر کے عہد مین رایج ہوا تو ضرور سالانہ حسابات کے اغراض کے لئے رایج ہوا ہوگا۔ اور راجہ ٹوڈرمل وزیر مالگذاری فینانس کے منشا سے رایج ہوا ہوگا۔ اس لئے اس کے مہینے بھی ہندی ہونا چاہئے تھے حالانکہ اس کے مہینے فارسی ہین۔ ثالثاً اگر یہ سنہ بھی شمالی ہند کے سال فصلی کی طرح سلطنت مغلیہ کے عام جمع خرچ کے تاریخون اور سالون مین اتحاد قایم رکھنے کے لئے رایج ہوا ہوتا تو اس کی ابتدا بھی شمالی ہند کے سال فصلی کے طرح اکبر اعظم کے تخت نشینی کے زمانہ یعنے سنہ ۹۶۳ ہجری سے ہونا چاہیئے تھی سنہ ۹۷۱ ہجری سے اس کی ابتدا کے اسباب کچھ نہین ہوسکتے رابعاً اگر ان سب باتون سے قطع نظر بھی کر لیجائے تو سنہ ۹۷۱ ہجری مطابق سنہ ۱۵۶۳ع سے سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق سنہ ۱۹۱۸ تک بحساب قمری ۳۶۵ اور بحساب شمسی ۳۵۵ سال ہوتے ہین لہٰذا سنہ رواں مین سنہ ۱۳۳۲ف ہونا چاہیئے تھا نہ سنہ ۱۳۲۷ و سنہ ۱۳۲۸ف۔

تیسرا بیان بلحاظ قواعد حسابی صحیح ہے اس لئے کہ سنہ ۱۶۳۶ع مین سنہ ۱۳۳۶ ہوا تھا جس کو سنہ ۱۳۳۶ ہجری مین یہ سنہ ۱۳۲۷ف دراصل یہی ہونا چاہئے۔ اور سنہ ۱۳۲۷ف ہی مگر صاحب جنتری نے اس کی توثیق کسی تاریخی حوالے سے نہین کی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی سال فصلی پر قیاس کر کے ہشت سالہ فرق کے
ذریعہ سے صاحب جنتری نے اختلاف ایام سنین قمری و شمسی کے بنا پر
حساب کر کے اس سنہ فصلی کی ابتدا ۱۰۴۶ سنہ ہجری سے بتائی ہے
تاہم ہمکو نہایت احتیاط سے تاریخی واقعات پر غور کرنا چاہیئے کہ اُن سے
اس کی تائید ہوتی ہے یا تردید۔ تاریخون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) ۱۰۳۷ سنہ ہجری مطابق ۱۶۲۷ سنہ ع مین شاہجہان سریر آرائے سلطنت ہوا۔

(۲) شاہجہان نے اپنے پہلے سال جلوس ہی مین دفاتر سرکاری سے
سنہ الہی کو خارج کر دیا جو اکبر اور جہانگیر کے عہد فرمانروائی مین جاری
سنہ رہا تھا۔ اور جس کا مبدا اُس کے دادا اکبر اعظم کے تخت نشینی کا
سال تھا۔ اور اُس کے بجائے سنہ ہجری کو از سر نو سلطنت کا دفتری
سال قرار دیا۔

(۳) شاہجہان پابند مذہب بادشاہ تھا۔ اسی بنا پر اس نے تخت نشین
ہوتے ہی پابوسی کی رسم موقوف کر کے بجائے اوس کے تسلیم
بجالانے کا طریقہ مقرر کیا تھا۔

(۴) شاہجہان کے عہد مین ۱۰۳۹ سنہ ہجری مین تسخیر صوبہ جات دکن کے لئے
فوجین روانہ کیگئین اور دکن کے ممالک کے فتوحات کا سلسلہ اسی سال
سے شروع ہو گیا جو اوس کے آخر دور حکومت یعنے ۱۰۶۸ سنہ تک برابر جاری رہا
اور ممالک دکن کے کامل تسخیر اورنگ زیب کے زمانہ اورنگ آرائی مین

(۵) ممالک دکن کی تسخیر کے لئے جو عساکر روانہ کئے گئے تھے اون کے
سپہ سالار اعظم شاہجہان کے بیٹے شہزادہ مراد اور شہزادہ اورنگ زیب تھے

(۶) مملکت آصفیہ کا اکثر حصہ اورنگ زیب کے ماتحت فوجوں نے فتح کیا

یہہ شہزادہ پورا مذہبی آدمی تھا۔

(۷) شاہجہان کے زمانہ فرمان روائی مین راجہ جے سنگھ نے ستارونکی رصد کرکے ایک زیچ مرتب کی جس کا نام زیچ شاہجہانی ہے۔

(۸) شاہجہان کے وقت تک شمالی ہند کے سنہ فصلی اور سنہ ہجری مین دو سال کا فرق ہوگیا تھا جس سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ سنہ قمری کو سنہ شمسی بنانیکا اصول غلط ہے۔

(۹) ۱۰۴۶ھ مین کوئی ایسا واقعہ نہین ہوا جس کی بنا پر جنوبی سنہ فصلی کی ابتدا اسوقت سے شمار کیجائے۔

دوسرے اور تیسرے واقعہ کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی علمار کے مخالفت پر شاہجہان نے اپنے دادا کے جاری کردہ سنہ الہی کو موقوف کرکے سنہ ہجری کے رواج کو تازہ کیا تھا۔ اور جب اسنے سنہ الہی جس کی بنیاد ریاضی کے صحیح اصولون پر تھی وفاتر سے خارج کردیا تو یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے زمانۂ حکمرانی سے ایک نیا سنہ شمسی جاری کیا ہوگا جس کی بنیاد ایسی غلط اصول پر ہو کہ کچھ صدیان گذرنے کے بعد اس کے مبدار کا صحیح نشان بھی نہ مل سکے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ سنہ فصلی اکبری کے تقلید مین ایسا کرتا بھی تو اس سنہ کے ابتدا شاہجہان کے سال جلوس یعنی ۱۰۳۷ھ ہجری سے ہونا چاہیئے اور وہ سنہ تمام سلطنت مین رائج ہونا چاہیئے تھا نہ صرف ممالک دکن مین۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلین کہ یہ سنہ صرف ممالک دکن کے لیئے ایجاد ہوا تھا تو یہ ضرور تسلیم کرنا ہوگا کہ شہزادہ اورنگ زیب کے تحریک سے ایسا کیا گیا ہوگا لیکن اورنگ زیب کا مذہبی تقدس ہمکو اس بات کے باور

کرنے کی اجازت نہین دیتا کہ اس سے سنہ ہجری مین اس قسم کے تحریف کی استدعا کی ہو اور اگر بفرض محال اس کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سنہ ابتدار فتوحات دکن کی ابتدار یعنی سنہ ۱۰۴۶ ہجری سے ہونا چاہیئے تھی نہ کہ سنہ ۱۰۴۶ ہجری سے۔ اگر ان سب باتون سے قطع نظر کرکے یہ باور کرلیا جائے کہ یہ سنہ شاہجہان کے زمانہ مین سرکاری حسابات کے لئے سنہ ۱۰۴۶ ہجری مین جاری کیا گیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا سرکاری سنہ قرار پایا تھا تو یہ ناممکن ہے کہ اس سنہ کا تذکرہ ذیچ شاہجہانی مین نہ ہوتا ذیچ شاہجہانی حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ مین موجود ہے۔ ہم نے اس مین سنون کا باب پڑھا۔ جس مین اُس نے بعض ایسے سنون کا بھی ذکر کیا ہے جن کا اب نام ہی نام باقی ہے اور کہین رائج نہین مگر اس سنہ فصلی کا اس مین کہین ذکر نہین ہے لہذا صاف ظاہر ہے کہ تیسرا قول بھی قابل تسلیم نہین ہے۔ ان تینون باتوں کی تردید کے بعد سنہ فصلی کی تحقیق کے متعلق کوئی نقلی مواد نہین باقی رہا اس لئے ہماری آیندہ تحقیقات قیاسات پر مبنی ہوگی۔

سنہ فصلی کی تحقیق۔ سنہ فصلی کی تحقیق مین جن قیاسون سے کام لیا جائیگا وہ واقعات ذیل سے مستنبط ہونگے۔

(۱) سنہ فصلی کے مہینے فارسی ہین (۲) سنہ فصلی کے مہینونکے ایام کی تعداد وہی ہے جو اکبر کے عہد مین سنہ آلہی کے مہینون کے لیئے مقرر کیئے گئے تھے۔ (۳) شاہجہان کے زمانہ تک امیر فتح اللہ کے مرتبہ فارسی مہینے پادشاہوں کے سنہ جلوس مین رائج تھے شاہجہان کے بعد اورنگزیب نے اپنے سنہ جلوس مین پھر عربی مہینے استعمال کئے (۴) ممالک دکن شاہجہان اور اورنگزیب کے دور حکومت مین فتح ہوئے (۵) شاہجہان تیموریہ نسل کا

مسلمان فرمان روا تھا۔ (۶) دربار شاہجہان کے اکثر امرا تورانی تھے یا ایرانی (۷) اس زمانہ مین ایران مین سنہ جلالی رائج تھا جس کے مہینے فارسی تھے (۸) جنوبی ہند کے ساحلی شہرون مین پارسی قوم بھی رہتی تھی جو اب تک موجود ہے۔ (۹) شاہجہان اورنگ زیب کے معتبر تاریخون مین جنوبی ہند کے سنہ فصلی کا ذکر کہین نہین ہے۔ (۱۰) وثیقہ شاہجہانی مین بھی اس سنہ فصلی کا تذکرہ نہین ہے۔ ان دس واقعون مین سے اول دوم پنجم بدیہی ہین۔ دہم وثیقہ شاہجہانی کے معائنہ سے واضح ہے کہ ان کے علاوہ باقی واقعات شاہجہان نامہ عالمگیر نامہ منتخب اللباب وغیرہ مین مندرج اور ان کے معائنہ سے ثابت ہین اس لئے ان واقعات کے ملنے سے جو قیاس مستنبط ہوگا اس مین غلطی کا احتمال نہ ہوگا۔

امر دوم کے معائنہ سے یہ بات واضح ہے کہ سنہ فصلی کا رواج جنوبی ہند مین ۱۰۹۲ ہجری کے بعد ہوا اس لئے کہ ان مہینون کے ترتیب جدید ۱۰۹۲ ہجری مین بحکم اکبر اعظم ہوئی ہے اور چونکہ جہانگیر کے عہد مین ممالک دکن سلاطین مغلیہ کے قلمرو سے خارج تھے اور ان مہینون کی ترتیب جدید دربار سلاطین مغلیہ مین ہوئی تھی - لہذا امر دوم وچہارم کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سنہ شاہجہان یا اورنگ زیب کے عہد فرمان روائی مین رائج ہوا۔ امر سوم بھی اس کے ساتھ ملا لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے فارسی مہینے خود اپنے سنہ جلوس سے نکالڈالے تھے اس لئے یہ باور نہین کیا جاسکتا کہ اس نے کسی مستقل سنہ مین یہ مہینے رائج کئے ہون۔ ان وجوہ سے قطعاً ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ اس سنہ کا رواج ممالک دکن مین عہد شاہجہانی مین ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ آیا یہ سنہ شاہجہان کا نومرتب سنہ ہے یا کوئی قدیم سنہ جس کو اُس نے رائج کیا ہو۔ امر پنجم کے ملاحظہ سے واضح ہے کہ اگر یہ کوئی جدید سنہ ہوتا تو شاہجہان اُس کا مبدا اپنے مذہب کے لحاظ سے اسلام کے کسی اہم واقعہ کو قرار دیتا جس کو ابتک شمسی تیرہ صدیان گذر چکے ہون ایسے واقعات صرف دو ہین (۱) سرور کائنات مفخر موجودات کے ولادت باسعادت جو ۲۰ مارچ سنہ ۵۷۱ء کو ہوئی اس لحاظ سے سنہ ۱۳۲۶ مین سنہ ۱۳۴۷ ہونا چاہیئے تھا (۲) آپکی نبوت جو سنہ ۶۱۱ء مین ہوئی۔ اسلئے سنہ ۱۳۲۶ مین یہ سنہ ۱۳۰۷ ہونا چاہیئے تھا مگر سنہ فصلی کے اعداد بتاتے ہین کہ یہ دونون مبارک واقعے اس سنہ کے مبدا نہین ہین یا شاہجہان اپنے خاندان کے لحاظ سے امیر تیمور صاحبقران کے سال جلوس کو اس کا مبدا قرار دیتا جو سنہ ۷۷۱ مین ہوا تھا لیکن ایسا بھی نہین ہے نیز اگر اس سنہ کی ترتیب شاہجہان کے عہد حکمرانی مین ہوئی ہوتی تو ضرور فرمان شاہجہانی اور شاہجہان نامہ وغیرہ مین اس کا تذکرہ ہوتا خافی خان نے منتخب اللباب مین سنہ ۱ جلوس شاہجہان کے واقعات کے ضمن مین بیان کیا ہے کہ شاہجہان نے سنہ الٰہی کو دفاتر سرکاری سے بیدخل کر دیا پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اگر شاہجہان اس سنہ کو مرتب یا رائج کرتا تو یہ مورخ اس کا تذکرہ اس کے حالات مین نہ کرتا۔ پس امر پنجم نہم اور دہم کے معائنہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ ہمارا سنہ فصلی شاہجہان کا مرتب کردہ سنہ نہین ہے بلکہ کوئی قدیم سنہ شمسی ہے۔ اور اُسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کا رواج عہد شاہجہانی مین فرمان شاہی کے ذریعہ سے بطور سرکاری سنہ کے نہین ہوا ہے

ورنہ یہ سارے ہندوستان مین جاری ہوتا۔ اور اوس کا تذکرہ تاریخون مین ضرور ہوتا۔ اس حد تک پہونچنے کے بعد کہ یہ سنہ کوئی قدیم سنہ ہے یہ امر تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ یہ کس قوم کا مقرر کردہ سنہ ہے۔ اور اسکا مبدء کیا ہے۔ اُس کا سراغ ہمکو اس سنہ کے مہینون کے نامون سے ملسکتا ہے۔ چونکہ اس سنہ کے مہینے وہی فارسی مہینے ہین جو پارسیون کے زمانۂ حکمرانی سے ممالک ایران مین رائج تھے۔ اور اسلامی حکومتون کے زمانہ مین بھی یہی مہینے ایران و توران مین برابر رائج رہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہین کہ جب یہ کوئی اسلامی سنہ نہین ہے تو ضرور ساسانیون کا جاری کردہ سنہ ہے ہم اپنے رسالہ مین بیان کر چکے ہین کہ ہر ساسانی پادشاہ اپنے سال جلوس سے ایک نیا سنہ جاری کیا کرتا تہا۔ جس کی حیات اس کے دور حکمرانی کے انقطاع کے ساتھ ہی منقطع ہو جاتی تھی چنانچہ پارسیون کا موجودہ سنہ یزدجردی اون کے آخری فرمان روا یزدجرد کے سال جلوس کی یادگار رہی جو ان مین ابتک اس وجہ سے رائج ہے کہ یزدجرد کے بعد اس قوم کا کوئی فرمان روا نہین ہوا۔ لہذا ہمارا سنہ فصلی بھی کسی ساسانی پادشاہ کے سال جلوس سے شروع ہوتا ہے وہ پادشاہ کون ہے اس کے لئے ہمین ایران کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۵۸۹ء مین ہرمز فرمان روائے ایران سے بہت سے امرا باغی ہوگئے تھے۔ جن کا سرگروہ بہرام چوبین تھا۔ اس بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ سنہ ۵۹۰ء مین فوج نے ہرمز کے بجائے اوس کے فرزند خسرو پرویز کو تخت نشین کر لیا۔ مگر بہرام چوبین نے اوس کے سامنے بھی سر اطاعت نہین جھکایا بلکہ خسرو پرویز سے لڑکر اس کو فاش شکست دی جس کے بعد خسرو پرویز

شاہ قسطنطنیہ کے پاس جاکر پناہ گزین ہوا۔ اور بہرام چوبین سر پر تاج پہن کر شاہ ایران بن گیا۔ بہرام چوبین کو چھہ ماہ سے زیادہ سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا تھا کہ خسرو پرویز ۵۹۱ء میں رومیون کا امدادی لشکر لے کر ایران پر حملہ آور ہوا۔ مقام زاب مین عظیم الشان لڑائی ہوئی جسمین بہرام چوبین کو کامل شکست ہوگئی اور خسرو پرویز دوبارہ تخت و تاج ایران کا مالک ہوگیا۔ اسی سال خسرو پرویز نے اس فتح اور اپنے جلوس کا بڑی دھوم دہام سے جشن کیا۔ جس مین ایرانی امرا کے علاوہ رومی عہدہ داران فوج بھی شریک ہوئے۔ اس لئے سنہ ۵۹۱ء سے اسکا سنہ جلوس جاری ہوا ہوگا۔ جس کو سنہ ۱۹۱۸ء تک ۱۳۲۷ سال شمسی ہوتی ہین۔ اور چونکہ ہمارا سنہ فصلی ۱۳۲۷ ہے۔ اس لئے قطعاً یہ سنہ پرویزی ہے جو خسرو پرویز کے سال جلوس سے جاری ہوا تھا اور اوس کے بعد مردہ ہوگیا تھا پھر دوبارہ کسی زمانہ مین زندہ ہوا۔ ہمارے اس رائے کی تائید صاحب غیاث اللغات کی تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ اُس نے اُس کو فارسی سال قرار دیا ہے۔ مگر اس کے زمانہ مین چونکہ پارسیون مین یزدجردی سال رائج تھا اس لئے اس نے غلطی سے یزدجردی لکھدیا حالانکہ یہ سنہ پرویزی ہے مگر یہان یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساسانیون کے سنہ عموماً نوروز یعنی یکم فروردی سے شروع ہوا کرتے تھے۔ لہذا اگر سنہ فصلی پرویزی ہوتا تو یہ بھی یکم فروردی سے شروع ہوتا۔ حالانکہ اوس کی ابتدا یکم آذر سے ہوتی ہے مگر اُن تغیرات کے معلوم ہوجانے کے بعد جو اس سنہ کی ابتدا کے متعلق خود سلطنت آصفیہ مین ہوئی ہے یہ اعتراض دفعہ ہوجاتا ہے ممالک آصفیہ مین سنہ فصلی کی ابتدا پہلے یکم امرداد سے ہوتی تھی پھر یکم مہر سال فصلی کا پہلا دن

قرار دیا گیا۔ اس کے بعد یکم آذر سال کا روز اول قرار پایا۔ لہذا کہا جاسکتا ہے
کہ اسی قسم کے تغیرات اس سے پہلے بھی ہوئے ہونگے جن کی وجہ سے اس
سال کا روز قدیم فروردی نہیں باقی رہا۔ یہ تمام مراحل طے ہو نیکے بعد
صرف اسقدر تحقیق باقی رہ گئی کہ ممالک دکن مین اس سنہ کا رواج
کب سے اور کن اسباب کی بنا پر ہوا۔ جس کے متعلق ہمارا یہ خیال ہے
کہ شاہجہان کے زمانہ مین جب صوبجات دکن فتح ہوئے تو اون کے
محاصل مالگذاری داخل کرنے کے اوقات متعین کرنے کے لئے افسران
صوبہ کو کسی سنہ شمسی کے اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی سنہ الہی سے
یہ کام اسوجہ سے نہین لیا جاسکتا تھا۔ اس سنہ کا رواج فرمان شاہی کے
ذریعہ سے ممنوع قرار پاچکا تھا۔ اورنگ زیب کے ہمراہی عہدہ دارون مین
اکثر تورانی و ایرانی امرا کی اولاد شریک تھی جو ممالک مفتوحہ کے صوبون اور
ضلعون کے افسر مقرر کئے گئے تھے۔ اس لئے ان کا رجحان بالطبع
یہ تھا کہ جو سنہ فصلی تعین فصول و وصول مالگذاری کے لئے مقرر
کیا جائے وہ اُن کے وطن کے مروجہ شمسی سنون مین سے کوئی ہو بلکہ
اُن کی دلی خواہش تو یہ تھی کہ اگر سنہ الہی نکالدیا گیا ہے تو بجائے اُسکے
سنہ جلالی جاری کیا جائے۔ مگر سنہ جلالی کے جاری کرنے مین
اورنگ زیب کی مخالفت کا خوف تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب مسلمان
پادشاہون کے طرف سنہ شمسی کا انتساب ناپسند کرتا تھا۔ اور اسی
وجہ سے اس نے اپنے سنہ جلوس کا حساب قمری مہینون سے رکھا۔
اس لئے انہون نے اس معاملہ مین اُن پارسیون سے مشورہ کیا جو
جوان ممالک مین ساسانی سلطنت کی بربادی کے بعد آکر آباد ہوگئے تھے۔

حسن اتفاق سے اوس زمانہ مین سنہ پرویزی اور سنہ ہجری دونونکے اعداد برابر تھے اور یہ ایسی قوی وجہ تھی جس نے سنہ پرویزی کو سنہ یزدجردی پر ترجیح دیدی۔ اور تعین اوقات مالگذاری کے لئے سنہ پرویزی رائج کردیا گیا۔ مگر اس کے مہینون مین چونکہ بین غلطی تھی اسلئے اس کے مہینون کے شمار ایام مین وہ تغیر کردیا گیا جو سنہ الٰہی کے مہینون مین ہوا تھا۔ یا یون کہا جائے کہ اس مین سنہ الٰہی کے مہینے رائج کئے گئے۔ اور اسی لئے یہ مہینے ماہ ہائے الٰہی کہلاتے ہین۔ اور چونکہ یہ سال تعین فصول کے لئے رائج ہوا تھا اس لئے اوس کا نام بجائے پرویزی کے فصلی مشہور ہوگیا۔ اور اس کی ابتدا بجائے یکم فروردی کے یکم تیر سے قرار پائی جب آفتاب نقطہ انقلاب صیفی پر پہونچتا تھا اور ممالک دکن مین زراعتی سال شروع ہوتا تھا یہ اسباب تھے جن کی بنا پر عہدہ داران دکن کی کوششون سے سنہ پرویزی نے دوبارہ سنہ فصلی کے نام سے جنم لیا۔ اور چونکہ اس سنہ کے رائج کرنے مین عہدہ داران مقامی نے اپنے اختیارات ذاتی سے کام لیا تھا اور شاہی منظوری حاصل نہین کی تھی۔ اس لئے اس سنہ کا تذکرہ سلاطین تیموریہ کے تاریخون مین نہین ہے۔

اگر اس سنہ کے مہینون مین کبیسہ کا استعمال باقاعدہ طور پر ہوتا رہتا تو آفتاب ہمیشہ نقطہ انقلاب صیفی پر یکم تیر کو آتا۔ لیکن آفتاب آج کل نقطہ انقلاب صیفی پر بجائے یکم تیر کے ۱۳ امرداد کو آتا ہے اور بالکل قرین قیاس ہی جب کہ رفتہ رفتہ ۴۲ سال مین یہ نوبت پہونچی کہ آفتاب بجائے یکم تیر کے یکم امرداد کو نقطہ انقلاب صیفی پر آنے لگا تو زراعتی سنہ ہونے کی

وجہ سے سنہ فصلی کی ابتدا بجائے یکم تیر کے یکم امرداد کر دی گئی ہو۔ اسکے بعد سنہ فصلی کی ابتداء سال مین جو تبدیلیان ہوئین وہ سلطنت آصفیہ مین ہوئین جو ممکن ہے کہ ملکی اغراض پر مبنی ہون مگر یقیناً حسابات فلکی پر مبنی نہ تھین۔

سنہ فصلی کے نقائص۔ (۱) ہم اپنے رسالہ کے شروع مین یہ بیان کر چکے ہین کہ فلک البروج کے چھہ معینہ نقطون مین سے کسی نقطہ پر جب آفتاب پہونچتا ہے تو سال شمسی کی ابتدا کیجاتی ہے۔ سال عیسوی کی ابتدا یکم جنوری سے ہوتی ہے۔ جب آفتاب اوج شمسی پر ہوتا ہے سنہ محمّدی کی ابتدا یکم حمل سے ہوتی ہے۔ جب آفتاب اعتدال ربیعی پر ہوتا ہے اور سنہ یزدجردی کی ابتدا بھی اُسی وقت سے ہوتی ہے —— ہمارا سنہ فصلی بھی جو حقیقتاً سنہ پرویزی ہے ابتداءً نوروز یعنی آفتاب کے اعتدال ربیعی پر پہونچنے کے وقت سے شروع ہوتا تھا۔ اور جب وہ دوبارہ رائج کیا گیا تو اس کے سالون کی ابتدا آفتاب کے نقطۂ انقلاب صیفی پر پہونچنے کے وقت سے ہونے لگی۔ لیکن کچھہ روز تک اس مین کبیسہ کا استعمال نہ ہونے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ ابتدا سال مین تو درکنار کسی مہینہ کی پہلی تاریخ کو بھی آفتاب ان چھ نقطون سے کسی پر نہین ہوتا کیونکہ آفتاب اعتدال ربیعی پر ۷ ار اردی بہشت کو انقلاب صیفی پر ۷ ار امرداد کو اعتدال خریفی پر ۸ ار آبان کو انقلاب شتوی پر ۹ ار بہمن کو اوج شمسی پر ۲۹ بہمن کو ذنب شمسی پر ۲۶ امرداد کو آتا ہے یہ خرابی ایسا بدنما دہبہ ہے جسکو مٹانا ہر مہذب اور ہر متمدن گورنمنٹ کا ضروری فریضہ ہے۔ خصوصاً دولت آصفیہ کا جس کا فرمان روا دولت علم و ہنر سے مالا مال اور فضل و کمال مین

عدیم المثال اور جن کا دربار دربار مجمع ارباب کمال ہے ۔

(۲) یہ بھی ہمنے اپنے رسالہ مین بتادیا ہے کہ آفتاب دائرۃ البروج کے چارون برابر ٹکڑون کو جو فصول اربعہ کے نام سے موسوم ہین مختلف زمانونمین قطع کرتا ہے اسی سے ہر فصل کے دنون کی تعداد مختلف ہوتی ہے یعنے ۔

(۱) فصل ربیع ۹۲ء۹ دن (۲) موسم گرما ۹۳ء۷۶ دن (۳) فصل خریف ۸۹ء۸ دن (۴) موسم سرما ۸۹ء۰۰ دن - اس لئے ایسے سال شمسی مین جسکی ابتدا اعتدالین یا انقلابین سے ہو اس امر کا لحاظ رہنا چاہیئے کہ اوس کے ہر ثلثہ کے ایام اُس فصل کے ایام کے برابر ہون ۔ اسی بنا پر جب سنہ الہی کے مہینون کے دنون کا تعین از سر نو کیا گیا تھا تو اس مین اس امر کا لحاظ رکھا گیا اور چونکہ ہمارے سال فصلی مین بھی وہی مہینے مستعمل ہوتے تھے ۔ اس لئے سنہ فصلی کے پہلے سہ ماہی یکم تیر سے آخر شہریور تک فصل گرما پر دوسری سہ ماہی یکم مہر سے یکم آذر تک فصل خریف پر تیسری سہ ماہی یکم دے سے آخر اسفندار تک فصل سرما پر اور آخر سہ ماہی یکم فروردی سے آخر خورداد تک فصل ربیع منطبق تھین لیکن ۱۰۰ سال تک اس سنہ مین کبیسہ نہ برتنے کی وجہ سے یہ انطباق مفقود ہوگیا - شاید سلطنت کے ارباب حل و عقد نے فصول کے معنی جغرافیوی مقامی موسم جاڑی گرمی برسات سمجھ لئے ۔ اور چونکہ حیدرآباد کے عرض البلد کے لحاظ سے اُن موسمون کی ابتدا و انتہا موجودہ مہینون کی ابتدا اور انتہا کے مطابق ہے یکم آذر سے موسم سرما شروع ہوکر آخر اسفندار کو ختم ہوتا ہے اور یکم فروردی سے گرمیاں شروع ہوتی ہین پھر یکم امرداد سے آخر تک برسات رہتی ہے ۔ اس لئے ان نقصانات کی طرف نہ توجہ کی گئی اور نہ اونکی اصلاح کی کوشش ۔ حالانکہ اس کی اصلاح بھی ضروری امر ہے ۔

طریقہ اصلاح۔ ہماری رائے مین ان دونون خرابیون کی اصلاح اسی طریقہ سے ہوسکتی ہے کہ جو سترہوین صدی عیسوی کے شروع مین پوپ گرے گری نے سنہ عیسوی کے لئے اختیار کیا تھا اور دس دن کا فرق نکالنے کے لئے ۵ ر دسمبر ۱۵ ر دسمبر کردی گئی تھی سنہ فصلی مین یہ طریقہ اصلاح دو طور پر برتا جا سکتا ہے۔ (۱) ۱۸ ر آبان یکم آبان قرار دیدیا جائے اور سال فصلی کی ابتدا بجائے یکم آذر یکم آبان سے ہو۔ اور آبان۔ آذر۔ دی تیس تیس دنکے مہینے رکھے جائین۔ بہمن ۲۹ ر دن کا اسفندار فروردی تیس تیس دن کے اور بقیہ ۶ مہینے اکتیس اکتیس دن کے اور امرداد مین عمل کبیسہ کیا جائے یعنی معمولی برسون مین وہ اکتیس روز کا رہے۔ اور سال کبیسہ مین ۳۲ دن کا اگر ایسا کیا گیا تو آفتاب ہمیشہ اعتدال خریفی پر یکم آبان کو انقلاب شتوی پر یکم بہمن کو اعتدال ربیعی پر یکم اردی بہشت کو انقلاب صیفی پر یکم امرداد کو آیا کریگا اور تقریباً ایک مہینے مین ایک برج کو قطع کرتا رہیگا۔

(۲) سال کی ابتدا بدستور یکم آذر سے رہے اور ۱۸ ر آبان یکم آذر کردیجائے آذر۔ دی۔ بہمن۔ تیس تیس روز کے مہینے مقرر کئے جائین۔ اسفندار ۲۹ دنکا فروردی اردی بہشت تیس تیس روز کے اور بقیہ چھ مہینے اکتیس اکتیس روز کے رکھے جائین۔ اور کبیسہ کا عمل شہریور مین ہو یعنی شہریور سال کبیسہ مین ۳۲ روز کا ہو معمولی سالون مین ۳۱ دن کا۔ اس صورت مین آفتاب ہمیشہ اعتدال خریفی پر یکم آذر کو انقلاب شتوی پر یکم اسفندار کو اعتدال ربیعی پر یکم خورداد کو انقلاب صیفی پر یکم شہریور کو آئیگا

ان دونون ترمیمون پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ کبیسہ کا عمل امرداد یا شہریور مین کرکے مہینون کے ایام ۲۹ سے ۳۲ تک کیون بڑہا دئے گئے

حالانکہ اگر بجائے امرداد و بہمن یا شہریور اسفندار مین یہ عمل کیا جاتا تو
مہینون کے دنون مین ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ کا تناسب قایم رہ سکتا تھا۔ لیکن
جو لوگ علم ہیئت کے دشوار گزار حسابی راستون کو طے کر چکے ہین وہ سمجھ سکتے
ہین کہ اعتراض صحیح نہین ہے اس لئے کہ نقطۂ راس شمسی دائرۃ البروج
کے حصہ شتوی مین اور ذنب شمسی حصہ صیفی مین واقع ہے۔ لہذا جب
آفتاب ماہ بہمن یا اسفندار مین نقطۂ راس سے قریب برج جدی مین
ہوگا تو اس کی رفتار بہت تیز نظر آئے گے اور وہ برج جدی کو کبھی ۲۹ دن
سے زیادہ مین نہ طے کریگا۔ اس لئے ماہ بہمن یا اسفندار کو ہمیشہ ۲۹ دن کا
رہنا چاہئے اور جب آفتاب ماہ امرداد یا شہریور مین نقطۂ ذنب کے قریب برج سرطان مین ہوگا تو اسکی
رفتار بہت سست ہوگی اور وہ برج سرطان کو طے کرتے کرتے اکتیس روز کا ہونگی۔ اور سال کبیسہ مین
۳۲ دن۔ اگر ایسا کیا گیا تو آفتاب ہمیشہ اعتدال خریفی پر یکم آبان کو انقلاب
شتوی پر یکم بہمن کو اعتدال ربیعی پر یکم اردی بہشت کو انقلاب صیفی پر
یکم امرداد کو آیا کرے گا۔ اور تقریباً ایک مہینے مین ایک برج کو قطع کرتا رہیگا
(۲) سال کی ابتدا بدستور یکم آذر سے رہے۔ اور ۸ / آبان یکم آذر کر دیجائے
اور آذر۔ دی۔ بہمن۔ تیس تیس روز کے مہینے مقرر کئے جائین۔ اسفندار
۲۹ روز کا۔ فروردی۔ اردی بہشت تیس تیس روز کے اور بقیہ چھے مہینے
اکتیس اکتیس روز کے رکھے جائین اور کبیسہ کا عمل شہریور مین ہو یعنی شہریور
سال کبیسہ مین ۳۲ روز کا ہو۔ معمولی سالون مین ۳۱ دن کا۔ اس صورت
مین آفتاب ہمیشہ اعتدال خریفی پر یکم آذر کو انقلاب شتوی پر یکم اسفندار کو
اعتدال ربیعی پر یکم خورداد کو انقلاب صیفی پر یکم شہریور کو آئے گا۔ اور اسکی
رفتار بہت سست دکھائی پڑے گی۔ اور وہ برج سرطان کو ۳۱۔ اور ۳۲ دن مین طے

درمیانی زمانہ مین قطع کرے گا - اسوجہ سے ماہ امرداد یا شہریور - کبھی ۳۱ اور کبھی ۳۲ دن کا ہوگا اور عمل کبیسہ اسی مہینے مین ہونا چاہیئے -

ان دونون ترمیمون مین اگر پہلی ترمیم پر عمل ہوا تو ماہ ہائے سنہ الہی و جلالی اور ماہ ہائے سنہ فصلی مین صرف ایک مہینہ کا فرق رہے گا - اور سنہ فصلی کی یکم اردی بہشت سنہ الہی وجلالی کی یکم فروردی یعنی نوروز ہوگا - اور صرف ۷ روز کی زیادتی سے حساب سنوی درست ہوجائیگا - لیکن سال کا پہلا مہینہ بجائے آذر کے آبان ہوجائے گا - اور اگر دوسری ترمیم پر عمل کیا گیا تو سنہ الہی وجلالی اور سنہ فصلی کے مہینون مین دو مہینون کا تفاوت ہوگا - اور سنہ فصلی کی یکم خورداد کو سنہ الہی وجلالی کی یکم فروردی ہوگی - اور ۲۳ روز کی کمی سے حساب سنوی کی اصلاح ہوجائیگی - لیکن سال کی ابتدا بدستور آذر سے رہے گی ان وجوہ سے ہم ان دونون ترمیمون مین پہلی ترمیم زیادہ بہتر خیال کرتے ہین -

سب سے بہتر ترمیم - یہ دونون ترمیمین پیش کرتے ہوئے ترمیم اول کو مین نے صرف اسوجہ سے ترجیح دی ہے کہ ابتدائے سنہ فصلی مین کوئی زیادہ تغیر نہ کرنا پڑے - اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو سب سے بہتر ترمیم یہ ہے کہ اٹھاروین آبان یکم آبان قرار دیکر مہینون مین وہ تغیر کرلیا جائے جو ترمیم اول کے ضمن مین بیان ہوا - اور سال فصلی کی ابتدا حسب سابق یکم امرداد یعنی آفتاب کے اعتدال خریفی پر پہونچنے کے وقت سے کیجائے - اس ترمیم مین سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دفاتر سرکاری کے تمام سال حسابی - دفتری زراعتی - تعلیمی ابتدا سنہ فصلی سے شروع ہوکر آخر سنہ پر ختم ہوا کرینگے اور موجودہ اختلاف رفع ہوجائیگا -

امید ہے کہ حضرت ناصر الاسلام والمسلمین اعلیحضرت بندگان عالی متعالی اور اعلیٰ عہدہ داران سلطنت میرے اس ناچیز مضمون پر غور فرماکر اصلاحات مندرجہ کی طرف متوجہ ہونگے۔

اڈیٹر

یعقوب ابن لیث الصفار

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس مقام پر اس امر پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ یعقوب کے پاس اتنی فوج کہاں سے آتی تھی کہ جس سے اتنی لڑائیاں لڑ سکتا تھا۔ اور تمام مفتوحہ علاقہ جات کو بھی قابو مین رکھتا تھا۔ باقاعدہ فوجی بھرتی سے کچھ زیادہ آدمی وصول نہ ہوسکتے تھے۔ شاید اس زمانہ کے دستور کے مطابق اُس نے ترکی غلامون کو بھی پالنے اور تربیت دینے کے بعد فوج مین داخل کیا ہو۔ مگر اس طریقہ سے بھی کوئی معتدبہ تعداد نہ حاصل ہوسکتی تھی۔ اصل یہ ہے کہ اسکی فوج کا ایک بڑا حصہ تنخواہ دار سپاہیون پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک رضاکار فوج مین داخل ہوتے ہی اپنا تمام مال و متاع یعقوب کے حوالہ کر دیتا تھا۔ جس کو وہ فروخت کرکے اس کے نام پر جمع رکھتا۔ اور میعاد ملازمت کے ختم ہونے کے بعد اس کو واپس کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ اگر میعاد کے ختم ہونے سے

پہلے رضاکار فوج سے علیحدہ ہوتا تو یہ رقم ضبط کر لی جاتی۔ اس طرح یہ رقم ایک قسم کی ضمانت تھی۔ مگر بہر حال فوج کی تنخواہ اور بہم رسانی رصد کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ تنخواہ ہمیشہ وقت پر ملتی تھی۔ مگر اس تمام خرچ کا بوجھ بالآخر مفتوحہ علاقہ جات ہی کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اور یعقوب کے خزانے پر کوئی بار عاید نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اکثر کتابوں میں اس کے اور اس کے جانشینوں کے بھرپور خزانوں کا ذکر آتا ہی اس کی تمام فوج مختلف اقوام کی ایک عجیب مخلوط فوج تھی۔ تمام فوج گھوڑوں پر سوار ہوتی تھی۔ فوجی انتظام میں وہ انتہا درجے کی سختی برتتا تھا۔ ایک افسر کے متعلق حکایت بیان کی جاتی ہے کہ وضو کرنے کے دوران میں اسے کوچ کا حکم ملا۔ اسی وقت بغیر ہتھیار لگائے اور کپڑے پہنے وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ مگر اس قدر سختی کے باوجود وہ اپنے سپاہیوں سے ہمیشہ نہایت فراخ دلی اور سخاوت سے پیش آتا تھا۔ بہر حال اس میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی کہ سپاہیوں کو اپنا گرویدہ کر لے۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگرچہ وہ سپاہیانہ قابلیت میں اس قدر ممتاز تھا۔ مگر پھر بھی تعلیم و تہذیب سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام اور عہد سے بھی ناواقف تھا۔ مزید براں اس کے تہور اور بہادری نے بھی ضرور اس کے سپاہیوں کے دل میں اس کی وقعت اور محبت بٹھا دی ہو گی۔ تمام فوج میں سے اس نے دو رسالے چنے تھے۔ جن میں سے ایک قواعد کے دن سنہری گرزوں سے اور دوسرا روپہلی گرزوں سے مسلح ہوتا تھا۔

۸۷۵ء کے موسم گرما کے درمیان میں یعقوب پارس میں داخل ہوا

محمد ابن واصل اسکو روکنے کے لئے سوس سے روانہ ہوا۔ اور شروع مین نامہ وپیام کے ذریعہ سے اپنا اصلی ارادہ اس سے مخفی رکھنا چاہا۔ اور اسی دوران جلدی جلدی کوچ کرتا ہوا۔ اس کی طرف بڑہا۔ مگر یعقوب کو لمحہ لمحہ کی خبرین مل رہی تھین۔ اور عین اس وقت جب محمد ابن واصل کی فوج پیاس اور گرمی سے بیدم ہو رہی تھی اس نے اسپر حملہ کر دیا۔ اور شکست فاش دی اس واقعہ سے ایک بڑا خزانہ اس کے ہاتھ لگا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس موقعہ کے بعد یہ تمام علاقہ اس کے قبضہ مین آگیا۔ مگر یان اتنا ضرور ہوا کہ وہ پارس کا خود مختار بادشاہ ہو گیا۔ اور لگے ہاتھون کردون کے ایک قبیلہ کو جس نے محمد ابن واصل کا ساتھ دیا تھا سزا بھی دے دی۔ مگر یہان وہ زیادہ نہ ٹھرا بلکہ بہت جلد سوس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اکتوبر مین وہ مہر مین دریائے دجلہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس حالت مین بغداد مین افراتفری مچ گئی۔ کیونکہ اول تو یعقوب بذات خود ایک نہایت ہی خطرناک دشمن تھا اور دوسرے وہ باغی حبشی غلامون کو بھی وہان سے بآسانی مدد دیسکتا تھا جنہون نے کہ اسوقت خلیفہ کی حکومت کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ چنانچہ یعقوب کے دوستون کو جو اسوقت بغداد مین قید تھے فوراً رہا کر دیا گیا۔ اور ایک معزز قاصد صلح کی شرایط لیکر اس کے پاس بھیجا۔ اور اس لئے کہ ان باتونکا ... حسب دلخواہ ہو۔ موفق نے جو اسوقت نائب السلطنت تھا بغداد کے تمام سوداگرون کو جمع کیا۔ اور ان کے سامنے یعقوب کو خراسان۔ طبرستان جرجان۔ رے اور پارس کا گورنر مقرر کیا۔ اور اس کے علاوہ اس کو خود بغداد کا بھی فوجی محافظ مقرر کیا۔ مگر ان تمام باتون نے یعقوب پر کوئی اثر نہ کیا کیونکہ اس کو خلیفہ کی کمزوری اور حالت کا پورا اندازہ تھا۔ اسوقت اسنے

دربار خلافت کا بھی پاس ادب نہ کیا اور خود خلیفہ سے بھی جنگ چھیڑنے پر آمادہ ہوگیا۔
اس نے خلیفہ کے قاصد سے صاف کہدیا کہ اب وہ خود بغداد مین آکر
صلح کی شرائط پیش کریگا۔ چند عربی اشعار اس سے اس مضمون کے منقول
ہین کہ خراسان اور پارس کا پادشاہ ہونے کے بعد کیون عراق پر بھی قبضہ
نہ کرلون۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے۔ کیونکہ یعقوب
قافیہ تو کجا عربی زبان ہی سے بالکل نابلد تھا۔ لیکن یہ اشعار اس کے خیالات پر
روشنی ضرور ڈالتے ہین۔ اس حالت مین بھی وہ برابر خلیفہ کو اپنا بادشاہ
تسلیم کرتا رہا۔ کیونکہ چند سال بعد اس کے ایک نائب نے باغی حبشیوں مین
جمعہ کے دن پہلے خلیفہ اور پھر الصفار کا نام خطبہ مین لے کر ان کو حیران و
پریشان کردیا تھا۔ یعقوب کی فتح کی حالت مین معتمد تو ضرور خلافت پر برقرار رہتا
مگر موفق ضرور اپنی بہادری اور قابلیت کی پاداش مین قتل کردیا جاتا۔
خلیفہ کے ترک جنرلون کا خیال تھا کہ موفق در پردہ یعقوب کا ساتھ دیتا ہے۔
اور اسی وجہ سے وہ الموفق کے برخلاف ہوگئے تھے۔ مگر یہ بات قابل اعتبار
نہین۔ اس مختصر سے نامہ و پیام کے بعد یعقوب نے برابر اپنا کوچ جاری رکھا
اور راستہ مین واسط پر قبضہ کرکے سیدھا بغداد کا رخ کیا۔ یہ دیکھکر معتمد نے اسکے
برخلاف جہاد کا اعلان کردیا۔ اور ایک بڑی فوج کے ساتھ بغداد سے روانہ
ہوا۔ مقابلہ کے وقت خود تو پیچھے رہا اور موفق نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ
مین لی۔ بغداد سے پچاس میل کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا۔ یعقوب کی فوج اول تو
تعداد مین خلیفہ کی فوج سے کم تھی۔ اور اس کے علاوہ مصنوعی سیلاب نے بھی
اس کی نقل و حرکت کو مسدود کردیا تھا۔ آخر خلیفہ کی فوجی کمک اور خود اسکے
کمپ کے لٹنے نے یعقوب کے پیر اکھاڑ دیے۔ اور وہ زخمی ہونے کے بعد

میدان سے پھرا۔ فاتحون کو بڑا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ مگر یعقوب کے لئے سب سے زیادہ بے عزتی کی بات یہ ہوئی کہ طاہر یہ خاندان کا آخری تاجدار جو اس کے ہاتھ مین قید تھا۔ موقع پاکر بھاگ نکلا۔ خلیفہ نے وہین میدان جنگ ہی مین اس کو بغداد کا محافظ مقرر کر دیا۔ یہ پہلی شکست تھی جو الصفار کو اٹھانی پڑی۔ کیونکہ اس سے قبل طبرستان مین اسے شکست نہین ہوئی تھی۔ بلکہ وہ قدرتی رکاوٹون کی وجہ سے واپس ہٹ آیا تھا۔ باین ہمہ فاتحون کو اس پر بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا تعاقب کرتے۔ وہان سے ہٹ کر یعقوب جندے نیشاپور چلا گیا۔ اس وقت اس کی تمام سلطنت نہایت ہی نازک حالت مین تھی۔ خراسان ہمیشہ ہی مصیبتون اور تکلیفون مین پھنسا رہا۔ یہ تکلیفات بعض تو خلیفہ کی پیدا کی ہوئی تھین۔ اور بعض خود وہان کے افسرون کے افعال کا نتیجہ تھین۔ اصل یہ ہے کہ خراسان کی حالت اس وقت اور بعد مین بھی بہت ہی نازک تھی۔ خلیفہ کے حکم سے محمد ابن واصل نے پارس کو یعقوب سے چھین لیا تھا۔ مگر بہت جلد اس نے یعقوب کے جنرل کے ہاتھون شکست کھائی اور گرفتار ہو کر بام کرمان کے قلعہ مین قید کر دیا گیا۔

اس عرصہ مین ایک مرتبہ یعقوب پھر پارس آیا۔ اور اس کے نام کے سکے بھی وہان مضروب ہوئے۔ مگر زیادہ تر وہ سوسنیا مین رہا۔ جس کے بعض حصص پر وہ خود حکومت کرتا تھا اور بعض پر اس کے نائب۔ اور کرد کے اور بادشاہ بھی اس کے زیر فرمان تھے۔ اس کے علاوہ اس نے دریائے کرغا کے پہاڑون مین بھی ایک فوج بھیجی۔ جس نے وہان کے ایک بادشاہ کو قید کر لیا۔ سوسنیا کا باقی حصہ خلیفہ یا حبشی غلامون کی فوج جن کے قبضہ مین تھا۔ موخر الذکر کے سردار نے ایک مرتبہ یعقوب سے عہد نامہ بھی کرنا چاہا تھا

مگر یعقوب نے کفار سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس مین شک نہین کہ ایسا عہدنامہ خلافت کے لئے نہایت ہی خطرناک ثابت ہوتا مگر باوجود اس بات کے ان دونون کو جلدہی یہ معلوم ہو گیا کہ کم ازکم ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ اسی وجہ سے چھیڑ چھاڑ بند ہو گئے۔ ستمبر ۸۷۸ء مین خلیفہ کا ایک جنرل مولد نام بغداد سے بھاگ کر یعقوب سے آملا۔ مگر اسوقت بھی یعقوب بغداد پر حملہ کرنے سے کتراتا رہا۔ کیونکہ موفق کی فوجی قابلیت اور طاقت کا پورا اندازہ کر چکا تھا۔ مگر موفق نے اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ برخلاف اس کے اس نے ایک مرتبہ پھر اس سے صلح کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کا قاصد یعقوب کے پاس پہنچا تو وہ بیمار پڑا ہوا تھا اپنے آقا کی تجاویز کے جواب مین اس سے صرف یہ کہا گیا کہ موفق کو اس بات کی اطلاع دیدے کہ یعقوب بیمار ہے۔ اور اگر مر گیا تو وہ اس کی مصیبت سے آزاد ہو جائیگا۔ ورنہ تلوار ان کے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اور یا تو وہ اپنی شکست کا بدلہ لیگا۔ اور یا اپنی تمام سلطنت کھوکر پھر پہلے کی طرح فقیر ہو جائیگا۔ بیماری نے روز پکڑا اور طرہ یہ ہوا کہ یعقوب نے طبیبون کے کہنے پر عمل کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ آخر کار بروز چہار شنبہ ۵ رجون ۸۷۹ء کو جندے شاپور کے مقام پر اس نے انتقال کیا۔ اور وہین پر دفن بھی ہوا۔ شہر کی بربادی کے ساتھ اسکی قبر کا بھی نام ونشان مٹ گیا ہے

محمد جمیل الرحمن ایم اے (باقی آئندہ)

ثمرۃ الادب

رسائن ۔ کیمیا ۔ کمسٹری

از جناب بابو امرت لال صاحب یم ۔ اے ۔ پروفیسر
سائنس دار العلوم

آجکل انگریزی لفظ کمسٹری کے لئے عربی لفظ کیمیا یا سنسکرت رسائن عموماً استعمال کرتے ہین ۔ لیکن ایک باریک بین کے نظر مین یورپ کی کمسٹری عرب کی الکیمیا اور ہندؤنکی رسائن اگر بالکل مختلف علوم نہ بھی ہون تاہم اون مین بہت زیادہ فرق ضرور ہے گو یہہ صحیح ہے کہ یورپ کی کمسٹری کی ابتدا قدیم زمانہ کے کیمیا سے ہوئی ۔

ہندؤن کے علمی ترقی کا زمانہ ساتوین صدی عیسوی مین ختم ہوچکا تہا ۔ اسکے بعد کسی فن مین بھی ہند مین ایسے محققین پیدا نہین ہوئے جنہون نے کوئی نئی چیز ایجاد یا دریافت کی ہو عرب مین اشاعت اسلام کے ساتہہ ہی ہر قسم کے علوم و فنون کی ترقی کا زمانہ شروع ہوگیا ۔ لیکن جسوقت یورپ مین ترقی کا زمانہ شروع ہوا اوسوقت عربون کی ترقی کا زمانہ بھی ختم ہوچکا تہا اور ہندوستان اور عرب مین وہ زمانہ تھا جس زمانہ کے لوگ اپنے اپنے ملک کے قابل قدر متقدمین کے نام فخر سے لیتے تھے ۔ لیکن اُس فخر کے قایم رکہنے کے لئے موجودہ زمانہ مین بھی

اسی قسم کے علما کے وجود کی ضرورت کے قائل نہ تھے نتیجہ یہہ ہوا کہ ان دونون ملکون کے لوگ اسی حالت پر قائم رہنا درکنار بہت کچھہ بھول گئے اور یوروپ کی ترقی ابھی تک دن دونی رات چوگنی چلی جاتی ہے۔

اہل یوروپ کی اس ترقی کی وجہ اون کی جان فشان محنت اور کوشش کے علاوہ یہہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب ایشیائی عالم کوئی نئی چیز دریافت یا ایجاد کر لیتا تھا تو اس علم کو حتی الامکان راز مین رکھتا تھا بلکہ اب بھی رکھتا ہے اپنے دو ایک شاگرد رشید کے سوا عوام پر راز فاش کرنا سخت عیب سمجھتا ہے اور شاگرد رشید کو بھی تبلانے کے لئے اپنے آخری وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اوس کو یہہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو اوس کا شاگرد علم مین اُس سے بڑھ جائے یا برابر ہو جائے۔ برسون کی خوشامد اور خدمت کے بعد اکثر شاگردون کو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اُستاد کے پاس دینے کے لائق کچھہ تھا ہی نہین۔ اگر اخیر وقت پر حضرت عزرائیل نے معقول وقت کا نوٹس نہ دیا تو یہہ موقع بھی ہاتھہ سے نکل جاتا ہے چونکہ یہہ موقع ہر شخص کو یکسان نہین ملتا اس لئے اکثر سینہ بہ سینہ چند پشت چلنے کے بعد بھی اکثر علوم عالمون کے ساتھہ سپرد خاک ہو جاتے ہین اور ہو بھی گئے۔ لیکن یوروپ مین اس کے برعکس عمل ہوتا ہے۔ جب کوئی عالم کوئی نئی چیز ایجاد یا دریافت کرتا ہے تو سب سے پہلے اُسے اشاعت کی فکر ہوتی ہے۔ مختلف ممالک مین علمی انجمنیں قایم ہین خوش قسمت ایجاد کنندہ عالم ان انجمنون مین عوام کو اپنی کامیابیون کی تفصیل سناتا ہے۔ لوگ اُسکی معقول عزت کرتے ہین کتابون مین اُسکا نام لکھا جاتا ہے بلکہ اکثر نو ایجاد چیز کا نام اُسی کے نام پر رکھہ دیا جاتا ہے انجمنون کے رسالون کے ذریعہ سے تمام دنیا مین ہزارہا بلکہ لاکھون آدمیون کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ ان لاکھون رسالہ خوانون مین ہزارون عالم بھی ہوتے ہین۔ جب ہزارون عالم مختلف پہلو سے اُس پر غور و فکر کرنے لگتے ہین تو کسی نہ کسی کی عقل لڑ جاتی ہے اور علم اور ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے صدیون کی ترقی مہینون بلکہ دنون مین حاصل ہو جاتی ہے۔

مصر۔ یونان۔ شمالی عرب اور ایشیا کوچک مین ایک زمانہ سے کیمیا کا رواج تھا لیکن علما لفظ کیمیا سے وہ علم سمجھتے تھے جس سے تانبا رانگ وغیرہ ادنی دہاتون سے سونا چاندی وغیرہ اعلی اور قیمتی دہات بن سکے۔ علاوہ ازین انسان کے جسم پر مختلف مرکبون کی طبی تاثیر کی تحقیقات بھی کرتے تھے۔ ان کی کوشش یہہ تھی کہ کوئی ایسی اکسیری دوا یا مرکب ہاتہہ آجائے جس کے استعمال سے انسان کے جملہ مرض دفع ہوجائین اور وہ تا بہ زیست ضعیف نہو اور جوانی کی قوت قایم رہے۔ ہندوستان مین لفظ رسائن تو صرف دوا کے لئے استعمال کرتے تھے۔ سنسکرت زبان مین چرک کی تصانیف علم طب مین سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہین۔ چرک نے رسائن کی تعریف یون کی ہے "رسائن وہ دوا ہے جو خواہ نباتات سے ہو یا معدنیات سے مفرد ہو یا مرکب جس کے استعمال سے مریض کو صحت اور صحت والے کو جوش پیدا ہو"۔ شارنگ دھر ایک دوسرا معتبر طبیب اور مصنف یون تعریف کرتا ہے۔ "جو چیز[سنہ۹] ضعف اور مرض کی دافع ہے وہی رسائن ہے"۔ مثلاً تر پہلا[۹۲] رسائن ہے یا لوہے کا کشتہ رسائن ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ رسائن مقوی دوا کو کہتے ہین اسکو کیمسری سے کوئی تعلق نہین۔ ایک زمانہ کے بعد وہ علم جس سے رسائن بنانیکی ترکیب معلوم ہو رسائن کہلانے لگا یعنی اب لفظ سے مراد علم طب ہوگیا۔ تنتر [illegible] شاستر مین اس علم کے لئے لفظ رَسْ رسدؔ ہی [illegible] آیا ہے۔ صرف رُودر جامل تنتر مین علم معدنیات کے لئے رسائن استعمال کیا گیا ہے۔

یونان مین جیسے دیگر علوم مین بڑے بڑے محققین پیدا ہوئے اسیطرح اس علم کے بھی عالم پیدا ہوئے۔ مصر شاید یونان سے بھی قدیم مہذب ملک ہے مصریون کے چھہ ہزار سال قبل کی

سنہ۹ رسائنچ نجّ نگے ام بجوتر اویا دہی ناشنم (شارنگ دھر)

۹۲۔ تر پہلا = تر پھل۔ تین پھل۔ یعنے ھڑ۔ بہیڑہ۔ انولہ۔ ان تینون کے مجموعہ کو آج کل یونانی طبیب اطریفل کہتے ہین۔

عمارتین اب بہی اوس قدیم تہذیب اور علم وفن کی گواہی دے رہی ہین اُس زمانہ مین شاید مصریون اور ایران کے آریون مین مقابلہ ہوا کرتا تہا دونون کی تہذیب اور علم وفضل قابل قدر تھے - انہین ایرانی آریون کی ایک شاخ ہند مین آکر آباد ہوئی اور اپنے ساتہہ اپنے آبا و اجداد کے علم وفضل کے قصّے لائی ہندؤن کے ویدون اور پرانون سے جو تاریخی مواد ملتا ہے وہ اکثر ہند مین آنیکے بعد کے زمانہ کا ہے لیکن بہت کچہہ اوس زمانہ کا بہی ہے جب ایرانی اور ہندی یکجا بود و باش کرتے تھے - یونانی علم کا مرکز تو بیشک ملک یونان تہا لیکن مصر ایشیائے کوچک اور شمالی عرب مین یونانی تعلیم کا اثر پہیلا ہوا تہا - اور اسی یونانی علم کو عرب نے بعد اشاعت اسلام نقل کیا - جب عرب کی سلطنت پہیل کر ہسپانیہ تک پہنچ گئی تو کورڈوا مین ایک دار العلوم قایم ہوا اور یورپ کے مختلف ممالک سے طلاب تحصیل علم کے لئے جمع ہونے لگے - اس دار العلوم مین اُنہین اصولون کی تعلیم دیجاتی تھی جو کہ اہل عرب نے یونان سے لے کر معرب کر لئے تہے -

یوروپ کے دیگر ممالک مین رہت یونان سے فلسفہ اور علوم پہیلے - یہہ علماء عرب کے خیالات سے متاثر نہین ہوئے اِن مین سے Paracelsus (۱۴۹۳ء تا ۱۵۴۱ء) نے صاف کہدیا کہ کیمیا کا مقصد سونا چاندی بنانا نہین ہے بلکہ عمدہ دوا بنانا ہے -

اُس زمانہ کے لوگ خاک آب باد و آتش چار عناصر کے قائل تھے - ہند کے بعض علمانے پانچوان عنصر آکاش یا بیوم اور بڑہا دیا - چین کی تہذیب اور علم بہی بہت قدیم زمانہ کا ہے - وہ تو قریب سنہ ۲۰۰۰ ق ع سے خاک - آب - باد - آتش - دہات - اور لکڑی - یہہ پانچ عناصر کے قائل ہین - ان کا قول ہے کہ مادہ ان چارون یا پانچون عناصر کا مجموعہ ہے -

یوروپ مین کیمیا کو سیاہ علم یا شیطانی علم کہتے تھے اور کیمیادان کو شیطان کا شاگرد یا جادوگر کہتے تھے - عوام کا عقیدہ تہا کہ بیماری وبا وغیرہ یہی جادوگر پہیلایا کرتے ہین جب کوئی بیماری زیادہ پہیلتی تھی تو ملک کے لوگ ان جادوگرون کو پکڑ کر زندہ جلا دیتے تہے یا مذہبی عدالت مین

برائے نام تحقیقات کے بعد جان سے مار دئے جاتے تھے لہٰذا خواہمخواہ ان کی تعلیم و تحقیقات
راز مین ہوتی تھی۔

اُس زمانہ مین سونا چاندی لوہا وغیرہ معدنیات مرکب سمجھے جاتے تھے۔ لوگون کا عقیدہ
تھا کہ جسطرح انسان کا جسم خاک۔ آب۔ باد۔ و آتش کا مجموعہ ہے اور اس کے مرنے کے بعد
اگر نعش جلادی جائے تو جسم سے آب۔ باد۔ آتش۔ خارج ہوکر ہوا مین مل جاتے ہین صرف
خاک پڑی رہتی ہے اسیطرح خالص لوہا تو زندہ رہاتا ہے۔ اور ان چار عناصر سے مرکب ہے
جب اُسے عرصہ تک ہوا مین گرم کرتے ہین یا جلاتے ہین تو لوہے سے بھی آب۔ باد۔ آتش خارج
ہوکر ہوا مین مل جاتے ہین۔ صرف خاک رہجاتی ہے اور اسی مناسبت سے ہوا مین لوہا گرم
کرنے کے بعد جو چیز بنتی ہے اُسے لوہے کا کشتہ یا مردہ کہتے ہین۔ اس قسم کے عقیدہ کی وجہ یہہ
ہوئی کہ لوہا تو پانی سے وزنی ہے کیونکہ پانی مین ڈوب جاتا ہے لیکن اسکا کشتہ پانی مین تیرتا ہے
اس لئے دہوکہ یہہ ہوا کہ لوہے مین حرارت پہنچانے سے کوئی حصہ ضرور نکل گیا ہوگا تب تو ہلکا پڑگیا
سنسکرت کی کتابون مین بھی لوہے کے مردہ یا کشتہ کی تعریف یہہ کی گئی ہے کہ پانی پہ ہنس کیطرح تیرتا ہے ۵۱

اس زمانہ کے یورپ کے علما مین یہہ سوال پیدا ہوا کہ لکڑی تیل وغیرہ چیزین تو
جلتی ہین لیکن اینٹ پتھر وغیرہ نہین جلتے اسکی وجہ کیا ہے۔ اُس زمانہ کے علم کیمیا سے جواب ملا
کہ بعض چیزون مین ایک بہت ہی لطیف مادہ جس کا نام فلاجسطان
رکھا گیا تھا موجود ہے اس کے وجود سے چیزین جلتی ہین۔ جن مین یہہ مادہ نہین ہوتا وہ نہین جلتی
عرب کے کیمیا دانون کا قول ہے کہ ہر مادہ مین نمک گندھک اور پارہ کی خاصیت کی چیزین
یا اجزا موجود ہین لیکن ان اجزا کی مقدار مختلف چیزون مین مختلف و کم و بیش ہوتی ہے۔ انہین سے

۵۱ مِرتم لوہم تَدّ دِہ شٹم ریکھا پورنا ہی دہاتَت۔ ہنس وت تیر سیتے داری نیُو تمّ
پریکیرتی تم۔

نمک کی خاصیت مٹی کی ہوتی ہے یعنی خاک - گندہک جلنے والا حصہ یعنی باد اور پارہ حرارت
پیدا کرنیوالا لطیف جزو یعنی آتش ہے - جن چیزون مین گندہک کا مادہ زیادہ ہے وہ جلتی
ہین اور جن چیزون مین نمک کا مادہ زیادہ ہو وہ نہین جلتین - یہہ بھی یقین کرتے تہے کہ ہر
دہات مین پارہ کا حصہ کچہہ نہ کچہہ ضرور ہوتا ہے -

اسٹال Stahl وغیرہ یوروپ کے کیمیادانون کا قول ہے کہ دہات
دراصل فلاجسطان اور دہات کے کشتہ کا مرکب ہے - حرارت سے فلاجسطان خارج ہوجاتا ہے
کشتہ رہ جاتا ہے - یوروپ کا اصول فلاجسطان اور عرب کا اصول نمک گندہک اور
پارہ اگر غور سے دیکہا جائے تو دونون ایک ہی قسم کے اصول پر مبنی ہین - اور ہندؤن کے
اصول سے عربون کے اصول بہت کچہہ مشابہت رکہتے ہین -

Priestley سنہ ۱۷۳۳ع تا ۱۸۰۴ع ایک حکیم انگلستان مین گذرا ہے
اوس نے سیسا اور پارہ کے کشتہ پر آتشی کانچ سے آفتاب کی حرارت ڈالکر دیکہا کہ ایک قسم کی
ایسی ہوا اوس مین سے خارج ہوتی ہے جس مین انگار بہڑک اٹہتی ہے اور دہات
کشتہ سے پہر زندہ ہوجاتی ہے لیکن اصول Phlogiston دماغ مین ایسا
جما ہوا تہا کہ اس مشاہدہ کے دیکہنے پر بہی وہ پرانے خیال پر قایم رہا -
نے اتنے مختلف قسم کے باد (ہوا یا گیس) کی تحقیقات کی کہ اگر اوسے بادی یا ہوائی کا لقب
دین تو بیجا نہ ہوگا -

Priestley یوروپ کا یہہ زمانہ بہی مبارک زمانہ تہا جب انگلستان مین
اپنے تحقیقاتون مین مصروف تہا اوسی وقت نوروے norway کے
دار السلطنت کے اسٹاک ہوم Stockholm کا ایک غریب دوا فروش
Scheele اپنے دوکان مین بیٹہا ہوا ایک کانچ کے شیشہ مین شورہ بہرکر
گرم کر رہا تہا اور اوس مین سے جو گیس نکلتی تہی اوسے موم جامہ کے تہیلے مین جمع کرکے اوسکی

خاصیت کی تحقیقات کرتا تہا گو اوس نے بھی آکسیجن جلا کر جدا کرلی تھی لیکن Pries
tley کیطرح اصول Phologiston کے خلاف رائے قایم نکر سکا۔ اوس زمانہ مین
مطبع یا ٹیپہ یا رسائل نہ تھے اس لئے ایک کو دوسرے کی کامیابیون کی خبر نہ تہی۔ اگر اون کو
باہمی مدد ملتی تو نہ معلوم دونون کی عقلون کے لڑنے سے کیا کیا عجیب و غریب چیزین پیدا
ہوکر عوام کو متعجب کرتین Priestley نے اسطرح آکسیجن تو جدا کرلی تہی گو اوس کا
نام ابہی تک نہین رکہا گیا تہا لیکن خود اس امر کا قائل نہ ہوا کہ کشتہ دراصل دہات اور
آکسیجن کا مرکب ہے اور دہات مفرد۔ اسکے قریب پچیس سال بعد فرانس کے حکیم
کے سر پہ اس ایجاد کا سہرا بندہا۔ بلکہ آج تک اہل فرانس فخر کیساتھ
کہا کرتے ہین کہ علم کمسٹری کا بانی ایک فرنچ شخص تہا اس لئے علم کمسٹری خاص فرانس کا ایجاد
کیا ہوا علم ہے اور اس مین کسی دوسرے کو دخل نہین وہ Priestley اور
Lavoisier Scheele کے تحقیقات کو قبول ہی نہین کرتے
نے ثابت کر دکہایا کہ جب لوہے کا کشتہ بنایا جاتا ہی تو گو مادہ پہیلکر وزن متناسب مین ہلکا پڑ جاتا ہی اور پانی پہ تیرنے
لگتا ہی لیکن اسکی مجموعی وزن مین کمی نہین بلکہ بیشی ہوتی ہی یعنی اگر ایک تولہ لوہا ہوا مین گرم کیا جائے تو قریب ڈیڑہ
تولہ سرخ سفوف کشتہ فولاد بنتا ہے۔ جبکہ مجموعی وزن مین اضافہ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اوس سے کوئی
جزو خارج ہونے کے بجائے اوس مین کوئی چیز ضرور داخل ہوگئی ہوگی۔ یہہ داخل ہونیوالی
چیز وہی گیس ہے جسے Priestley نے آتشی کانچ کے ذریعہ آفتاب کی حرارت
کی مدد سے کشتہ سے خارج کیا تہا اور جس کا نام آخر آکسیجن رکھا گیا اس زمانہ سے کیمیائی مشاہدون مین
ترازو و کانٹے کا استعمال عام طور پہ بلکہ لازمی طور پہ رائج ہوا۔ پرانے اصول بہی بدل گئے
علم کا مقصد سونا چاندی یا اکسیری دوا بنانا نہ رہا بلکہ کائنات کے کل چیزون کے اجزا کی تحلیل و
ترکیب اور اون کی خاصیت دریافت کرنا ہی مقصد ہوگیا۔ کیمیا کے بجائے کمسٹری عنصر کے
بجائے عنصر مستعمل ہونے لگا اور ثابت ہوگیا کہ مٹی دراصل عنصر یا مفرد نہین بلکہ سیکڑون قسم کے

مرکبات کا مجموعہ ہے آب یعنی پانی بھی عنصر نہین بلکہ دو مفرد گیسون کا مرکب ہے ۔ عُلما نے پانی کو تحلیل کر کے یہہ دونون مفرد گیسین جدا کر دین ۔ اور پھر حرارت پہنچا کر ان دونون مفردون سے مرکب پانی بنا دیا ۔ اور ثابت ہو گیا کہ ہوا بھی مفرد نہین ہے بلکہ دو مفرد گیسین اس مین مخلوط ہین نیز ان دو مفرد گیسون کے علاوہ پانی کا نجار کاربانک ایسڈ گیس اور امونیا ہوا مین ہر وقت کچھہ نہ کچھہ مقدار مین بطور غلاظت موجود ہوتے ہین اور چند نایاب گیس یعنی Crypton. اور xeon. neon. argon. بہت ہی کم مقدار مین کرۂ باد مین موجود ہین ۔

انگلستان کے مشہور عالم ڈالٹن Dalton. نے ایسے اصول قائم کئے جو آج تک مقبول عام ہین اُن کا قول ہے کہ مفرد در اصل آٹم Atom. (جزو لایتجزیٰ) کا مجموعہ ہے اور ان اٹم atom کے حصّے نہین ہو سکتے ایک مفرد سے دوسرا مفرد نہین بن سکتا ۔ بیشک متعدد مفردون سے مرکب بن کر اُسکی صورت و شکل تبدیل ہو سکتی ہے مادہ نہ پیدا ہو سکتا ہے نہ معدوم ۔ صرف ترکیب یا تحلیل سے اوسکی صورت و خاصیت بدلتی رہتی ہے وغیرہ ۔ علم کسٹری کے عُلما کے لئے یہہ کلام بالکل نئے تھے لیکن اہل ہند اور عرب کے لئے پُرانے فلسفہ اس سے بہرے پڑے تھے [1] ۔ سنسکرت کے فلسفہ مین کپل مُنی کا کلام ہے " اگر پہلے کسی مادہ کا وجود نہ ہو تو بذات خود کوئی مادہ پیدا نہین ہوتا " کناد مُنی کا کلام ہے کہ " خاک آب باد و آتش ان چار قسم کے مادون کا وجود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ان کے ملنے سے جو مختلف صورت و شکلین پیدا ہوتی ہین وہ چند روزہ اور عارضی ہین " کسی ہندو پنڈت سے اگر پوچھا جائے تو وہ تبلائیگا کہ کپل اور کناد مُنی کم از کم دس ہزار سال قبل موجود تھے ۔ لیکن یوروپ کے محققین کے تحقیقات سے اس کلام مین مبالغہ ثابت ہوا ۔ لیکن اس مین کلام نہین کہ کپل منی رامائن کے زمانہ سے قبل یا رامچندرجی کے زمانہ مین موجود تھے ۔ کیونکہ رامائن مین ان کا نام آیا ہے اور

[1] ج ۔ نا وستونو وستو سِد ہی ۔

رامائن کے مصنف والمیک نے رامچندرجی کی بیوی کو رامائن دی تھی اسلئے یہہ انکا ہمعصر تھا
یورپ کے علما کا بیان ہے کہ مہابھارت کی لڑائی قریب ۱۴۵۰ سال قبل مسیح ہوئی
گوبندون کا بیان ہے کہ اس لڑائی کے بعد مہاراج یدہشٹر کے تخت نشینی کا سنہ جلوس گذشتہ
۱۴ اپریل سنہ ۱۹۱۸ عیسوی سے ۵۰۱۹ وان سال چل رہا ہے مہابھارت کی لڑائی مین جو لوگ
شریک تھے اون سے ۵ تا ۶ پشت پہلے کے لوگ رامائن کے زمانہ مین زندہ تھے
اس حساب سے رامائن کا زمانہ مہابھارت کے زمانہ سے کم از کم ۱۵۰ سال قبل مہابھارت
تھا یعنی رامائن کے زمانہ کو اسوقت ۱۵۰ + ۱۴۵۰ + ۱۹۱۸ = ۳۵۱۸ سال ہوئے
اگر اُس وقت کپل منی زندہ ہون تو بھی اُن کے زمانہ کو عنقریب پانچ ہزار سال گذرے
اور ڈالٹن Dalton کے اُصول سنہ ۱۸۰۴ء مین قائم ہوئے جس کو صرف
۱۱۴ سال ہوئے - لیکن فرق یہہ ہے کہ ہند کے قدیم حکما نے صرف منطق و فلسفہ کے
خیالی بحث سے اپنے کلام کی راستی ثابت کی تھی اور ڈالٹن
زمانہ مین یورپ کے حکما نے مشاہدون سے ثابت کر دیا -
ڈالٹن Dalton. کا یہہ اصول کہ ایک مفرد سے دوسرا مفرد نہین بن سکتا
جب یورپ مین مقبول عام ہوگیا تو خواہ مخواہ سونا چاندی بنانیکی کوشش بے سود ہوگئی
کیونکہ سونا چاندی دونون مفرد معدنیات ہین جو کبھی دوسرے مفرد دہاتون کے اجتماع سے
نہین بن سکتے اور جبکہ اُصولاً بننا ناممکن ثابت ہوا تو پھر کوشش بھی بے سود ہے - یورپ کے
اس عام تفتیش اور تحقیقات کے علم کو کمسٹری کہتے ہین پس ظاہر ہے کہ عرب کے کیمیا
مین اور اس کمسٹری مین زمین و آسمان کا فرق ہوگیا - علوم و فنون مین انیسوین صدی
عیسوی مین جتنی اور جس عجلت سے ترقی ہوئی شاید اُس کے پہلے کے ہزارہا سال مین
بھی اتنی ترقی نہین ہوئی تھی - آجکل علم کے ہر شاخ مین کمسٹری کی ضرورت پڑتی ہے
ہیئت دان بھی جن ثوابت کو آنکھہ سے نہین دیکھہ سکتا اُن کا فوٹو کیمیا دان کے بنائے ہوئے

پلیٹون پر کھینچ رہا ہے۔ طبیب کے سامنے مریض آیا وہ ایک خاص قسم کے شعاع کے چراغ کے سامنے مریض کو بٹھا کر اوس کے جسم کے اندر کی ہڈیان رگ پٹھے دیکھہ رہا ہے اور ان رگ پٹھون کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ صنعت مین حرفت مین طبابت مین زراعت مین قصہ کوتاہ جہان دیکھو وہان کمسٹری کسی نہ کسی شکل مین اپنا اثر دکھا رہی ہے زمانہ قدیم سے ہندوستان نیل کی پیداوار کے لئے مشہور ہے لیکن آجکل جرمنی کے کمسٹری کے لیبورٹری مین بنی ہوئی مصنوعی نیل نے قدرت کے لیبورٹری مین بنی ہوئی نیل کو بیکار بنا کر کارخانہ اور بازار سے نکالدیا ہے چونکہ جنگ کی وجہ سے مصنوعی نیل دستیاب نہین ہوتا اس لئے اب بنگال اور بہار کی پرانی نیل کی کوٹھیان جو کہ پچیس تیس سال سے بند تھین پھر سر سبز ہو رہی ہین اور اب کی سال نیل کی کاشت پھر کی جا رہی ہے۔ سرد ملکون مین جہان سبزہ زار کم ہے مویشی بھی کم ہین وہان امرا کے میزون پر گائے بھینس کے دودھ کے مسکہ کے بجائے مصنوعی مسکہ استعمال مین آرہا ہے۔ اب بدخشان کے لعل کو کوئی نہین پوچھتا مصنوعی لعل قدرتی لعل سے عمدہ خریدار کے حسب فرمایش بڑا اور شوخ رنگ کا بننے لگا ہے۔ الماس بھی بننے لگا ہے گو ابھی بڑی کمپنیان نہین بنتین اس لئے بازار مین نہین ملتا اُمید ہے کہ کچھہ دنون مین کوہ نور بھی لیبورٹری سے نکلنے لگیگا۔

باقی آیندہ

یعقوب ابن لیث الصفار

(گذشتہ سے پیوستہ)

یعقوب ایک بہادر سپاہی تھا جس کی رگون مین خون کی جگہہ پارہ بھرا ہوا تھا۔ اور جسم فولاد کا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی مسکراتا تھا۔ اور اسکی کامیابی کی وجہ یہہ تھی کہ وہ تمام مہمین تدبیرین خود ہی سوچتا اور جہان تک ہو سکتا خود ہی ان پر عمل۔ اسکی سب سے بڑی دل لگی بچون کو فوجی

قواعد سکھاتا تھی۔ انتہائی طاقت کے زمانہ مین بھی وہ ہمیشہ نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتا رہا۔ جو زیادہ تر اسکی پرانی عادات کا نتیجہ تھی۔ جنگ کے زمانہ مین وہ اپنے خیمہ مین اپنی ڈھال پر سوتا تھا۔ اسکا کھانا بھی ایسا ہی سادہ اور معمولی ہوتا تھا۔ یعقوب کے خیمہ مین کبھی کوئی خادم نہین دکھائی دیا۔ خیمہ کے قریب چند نرکی غلام ہر وقت اپنے آقا کے حکم بجا لانے کے لئے مستعد رہتے تھے۔ یعقوب سے کسی قسم کی نرمی کی توکیا توقع ہوسکتی تھی۔ مگر ساتھہ ہی وہ بے حد بے رحم بھی نہ تھا۔ طوق اور علی کے ساتھہ اسکا سلوک اس زمانہ مین کسیطرح غیر معمولی نہ تھا۔ اور اس لئے اسے ظالم نہین کہہ سکتے۔ مگر یعقوب کا دغا و فریب مشہور ہے۔ اور حقیقت یہہ ہے کہ اس صفت کے بغیر اور زیادہ کامیابی تو کیا یعقوب کے لئے یہہ بھی ناممکن تھا کہ وہ سیستان کے رضا کارون پر ہی اپنا تسلط جمائے اس صفت کا ظہور زیادہ تر خلیفہ اور دوسرے بادشاہون کے ساتھہ نامہ و پیام مین ہوتا تھا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہین کہ اسی وجہ سے بعض دفعہ وہ اپنے وعدون کو توڑتا اور اپنے الفاظ پر قائم نہ رہتا تھا۔ مگر ساتھہ ہی ہمکو یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ کے مورخین اُسکا ذکر کرتے ہوئے اسبات کی بہت پروا نہین کرتے۔ کیونکہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ ایسے بے ایمانی اور عہود کا توڑنا کوئی بڑی بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ زمانہ کی حالت اور خود یعقوب کے عادات و خصائل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوئی عجیب بات نہین معلوم کہ وہ کوئی پائدار اور مستحکم سلطنت قایم کرسکا۔ اصل یہہ ہے کہ یعقوب کبھی فتح کے ساتھہ ساتھہ ایسی سلطنت کے قایم کرنیکا خیال بھی نہین کرتا تھا اسلئے اس نے کبھی یہہ کوشش نہین کی کہ مفتوحہ علاقہ مین کوئی خاص قانون رائج ہو جائے۔ تالیف قلوب تو کجا اس نے اپنی رعایا سے نہایت سختی کے ساتھہ خراج وصول کیا۔ کوئی اور شخص ضرور ایسے وسائل اختیار کرتا جس سے اسکے فتوحات کی حفاظت ہوسکے۔ مگر اس نے ایسا کبھی نہین کیا۔ بہر حال کوئی شخص اس بات سے انکار نہین کرسکتا کہ وہ ایک ایسی عجیب و غریب شخصیت کا آدمی تھا جس نے ایک معمولی صناع کی حیثیت سے ترقی کرکے ایک ایسی حکومت قایم کرلی

جس سے ایک طرف تو افغانستان کے لوگ اپنے پہاڑوں میں اور دوسری طرف خلیفہ اپنے محل میں کانپتے رہتے تھے۔

یعقوب کا بھائی عمرو اسکا جانشین مقرر ہوا۔ یہ شخص کسی زمانہ میں گدہے چرایا کرتا تھا اور بعض اوقات معماری بھی کر لیا کرتا تھا۔ مگر اپنے بھائی کے خراسان پر حملہ کرنے کے وقت سے یا شائد اس سے پہلے سے وہ یعقوب کا دست راست بنا ہوا تھا۔ حکومت ملنے کے بعد عمرو نے اپنی تمام سلطنت کا فیصلہ خلیفہ کے ساتھہ ایک ہی جنگ میں نہ کرنا چاہا۔ بلکہ فوراً ہی خلیفہ کے زیر فرمان اور تابعدار رہنا منظور کر لیا۔ اُس طرف موفق نے بھی اس تمام قضیہ کا فیصلہ اسطرح پر کیا کہ تمام وہ مراعات جو وہ یعقوب کو دیتا تھا عمرو کو بھی دیدیں۔ اور اُن کے علاوہ اصفہان کا علاقہ اسکے پاس ہی رہنے دیا۔ اسطرح عمرو کی سلطنت مشرق و شمال میں موجودہ ایران سے کہیں زیادہ تھی اگرچہ مغرب اور شمال مغرب میں ذرا اس سے کم تھی۔ مگر اس زمانہ میں یہ علاقہ آجکل کی نسبت کہیں زیادہ زرخیز تھا۔ اس وسیع سلطنت کے علاوہ وہ سمرا اور بغداد کا فوجی محافظ بھی مقرر ہوا۔ مگر عمرو خود اس کام کو نہ کر سکتا تھا اس لئے اس نے اپنے طرف سے اس کام کے لئے نائب مقرر کر دیا۔ یہہ شخص خاندان طاہریہ کا ایک فرد عبیداللہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبیداللہ اور اوس کے بھتیجے میں جسے یعقوب نے معزول کیا تھا کچھہ نا چاقی تھی۔ عمرو کا اقتدار اسقدر بڑھ گیا تھا کہ اس نے مکہ اور مدینہ کے حاکم بھی مقرر کئے۔ مگر بدقسمتی سے اس وسیع مملکت میں صرف چند ہی علاقہ ایسے تھے جہاں اسکی حکومت مستحکم طور پر قائم ہوئی۔ خراسان خاص طور پر اسوقت بہت مخدوش حالت میں تھا خجستانی نام ایک شخص پہلے تو آہستہ آہستہ یعقوب کا رازدار بنا اور آخر میں دغابازی کر کے خراسان کے ایک علاقہ سے اسکے بھائی علی کو نکالدیا اور بہانہ یہہ کیا کہ وہ خراسان کو اسکے اصلی مالک خاندان طاہریہ کے لئے فتح کرتا ہے عمرو فوراً خراسان کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں کہ وہ اس سے پہلے بھی بہت سی لڑائیاں لڑ چکا تھا مگر خجستانی اسے شکست دی۔ اور اسکے دارالخلافہ نیشاپور کو فتح کر لیا اس شکست کے بعد عمرو

سیستان چلا گیا مگر خراسان کی فتح کا خیال اسے برابر رہا۔ اس نے خلیفہ سے شکایت کی کہ یہہ تمام مصیبت محمد کی ڈالی ہوئی ہے۔ اور وہ خجستانی کو در پردہ مدد دے رہا ہے۔ موفق چونکہ اب تک حبشی غلاموں سے برسر پیکار تھا۔ اس لئے عمرو کی خوشامد مین لگا ہوا تھا اس نے فوراً محمد اور اس کے ہمدردون کو قید کر دیا۔ حج کے موسم مین پھر عمرو نے اپنا رعب مکہ مین قایم رکھا۔ جولائی سنہ ۸۸۱ء مین خود کعبہ مین اسکے اور مصری امرا کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔

سنہ ۸۸۱ء مین عمرو کے گورنر پارس نے بغاوت کی۔ مگر عمرو نے فوراً باغی کو شکست دیکر استخر پر قبضہ کر لیا تعاقب مین باغی گرفتار ہو گیا۔ اور اس کے سامنے لایا گیا چند روز شیراز مین ٹھیرنے کے بعد وہ پھر واپس پھرا۔ اس عرصہ مین اس نے پارس مین اپنے اقتدار اور حکومت کو مستحکم کیا۔ اصفہان کے امیر سے ایک بڑا خزانہ وصول کیا۔ اور اس سے خلیفہ کو بھی تحفے بھیجے سنہ ۸۸۲ء تک اور خاصکر خجستانی کے قتل کے بعد خراسان پھر اسکے ہاتھ آگیا۔

موفق کے ساتھ اسکی ظاہری دوستی برابر قایم رہی۔ اسکے کہنے سے اس نے محمد ابن عبداللہ ایک کرد کو قید کر دیا۔ جو ایک مرتبہ حبشیون سے بھی مل چکا تھا۔ مگر سنہ ۸۸۳ء مین حبشیون کی بغاوت فرو ہونے کے بعد صورت حالات بالکل بدل گئی۔ اور تمام جنگی کارروائیون سے سنبھلنے کے بعد موفق نے سلطنت کے اور باقی حصص اور خاصکر پارس مین خلیفہ کی حکومت قایم کرنے کی ٹھان لی۔ دکھاوے کے لئے اس نے عمرو کے ساتھہ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا مگر عمرو نے اپنے اقتدار کو گھٹانے سے انکار کر دیا۔ اس ناکامی کا نتیجہ یہہ نکلا کہ ۲۵ مارچ سنہ ۸۸۵ء مین خلیفہ کے معتمد نے خراسان کے تمام حاجیون کو جو اسوقت بغداد مین موجود تھے جمع کیا اور بذات خود ان کے سامنے عمرو کو خراسان کی حکومت سے معزول کیا۔ اور اسکی جگہہ محمد کو مقرر کیا اس عزل کا اثر صرف خراسان ہی پر نہ پڑتا تھا۔ بلکہ صفار کے اور علاقہ جات بھی اس مین آجاتے تھے۔ یہہ حکم دیدینا تو آسان تھا۔ مگر اس کا پورا کرنا مشکل تھا۔ دور افتادہ صوبجات مین تو

اسطرح محض رعایا کو بادشاہ کے خلاف اکسایا ہی جاسکتا تہا - مگر پارس مین اس سے زیادہ ممکن تہا - ۸۸۵ء ہی مین پارس مین عمرو کے خلاف ایک فوج روانہ کی گئی - اور امیر اصفہان نے عمرو کو شکست دیکر اسکا کیمپ لوٹ لیا - اگسٹ ۸۸۵ء مین موفق خود پارس روانہ ہوا عمرو نے فوج روانہ کی مگر اس کا جنرل موفق سے جاملا - اسطرح چار و ناچار اسکو یہ صوبہ چھوڑ دینا پڑا - موفق نے اسکا تعاقب کرمان تک کیا - ممکن ہے کہ اسکا خیال اسکو سیستان سے نکالدینے کا ہوا - عمرو بھی سیدہا سیستان چلا گیا - اسی کوچ کے دوران مین اسکے بیٹے محمد کا انتقال ہوگیا مگر موفق کی حالت ایسی نہ تہی کہ وہ کرمان کو بھی اپنے قبضہ مین رکھہ سکے کیونکہ یہان کی زمین عام طور پر بنجر ہے - اور تمام قلعے عمرو کے ہاتہہ مین تھے - ایسے صحرا مین فوراً سیستان کی طرف روانہ ہوجانیکا خیال بھی نہ گذر سکتا تہا - قدرتی رکاوٹ ایسی حائل ہوئی کہ جس کو موفق نہ توڑ سکتا تھا -

اس واقعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موفق نے یہہ سمجھہ لیا کہ وہ ابہی عمرو کے مقابلہ کی تاب نہین لاسکتا اور اس سے صلح ہی ہر حالت مین بہتر ہے - چنانچہ ۸۸۹ء مین عمرو پھر بغداد کا فوجی محافظ مقرر کیا گیا - چند ہفتہ بعد عمرو نے پھر عبید اللہ کو ہی اپنا نائب مقرر کیا - ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونون مین پھر صلح ہوگئی تہی اور عمرو کو تمام مراعات پھر مل گئے ۸۹۰ء مین پھر اسکو معزول کیا گیا - اس زمانہ مین وہ خود بھی مصیبتون مین پھنسا ہوا تہا اپنے بہائی علی پر بغاوت کا شبہ کیا اور اس کو مع دو بیٹون کے قید کردیا - یہ دونون آخر مین بہاگ نکلے - اسوقت یعقوب کے ایک پرانے سپاہی رفیع نے بتدریج خراسان کو فتح کرلیا - اور رے پر بہی قابض ہوگیا - علی نے اسیکے پاس انتقال کیا - مگر اسکی موت سے اس قضیہ کا فیصلہ نہوا - اب رفیع کا نئے خلیفہ معتضد کے ساتہہ بھی جو اپنے باپ موفق کی موت کے بعد خلیفہ ہوا تہا جھگڑا ہوگیا - انجام یہہ ہوا کہ معتضد نے عمرو کو پھر بغداد کا حاکم مقرر کردیا جبکہ رفیع اصفہان کے لوگون کو تنگ کر رہا تہا - عمرو نے اسکے دارالخلافۃ

نیشاپور پر قبضہ کرلیا۔ مگر رفیع اب بھی ناامید نہ ہوا۔ اسنے طبرستان کے فاطمی امیر سے عہد نامہ کرلیا۔ اور جب عمرو نیشاپور سے چلاگیا تو رفیع نے وہان داخل ہوکر فاطمی امیر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خود بھی شیعی ہوگیا۔ ایسی صورت مین عمر و خلیفہ البغداد کا جو سُنی المذہب تھا لامحالہ طرفدار بنگیا۔ ۸۹۶ء تک اس کا برتاؤ بغداد کے ساتھہ نہایت ہی دوستانہ تھا۔ ان تحائف سے جو اس نے اس زمانہ مین بغداد روانہ کئے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دوران مین ہندوستان کے قریب تک جا پہنچا تہا۔ اور غزنی کا شہر تو کم از کم اسی کے ہاتھہ مین تھا۔

مگر پھر عمرو رفیع سے لڑنے کے لئے مستعد ہوگیا۔ مئی مین نیشاپور کا محاصرہ ختم ہوگیا۔ اور رفیع اسکو چھوڑکر بھاگ نکلا۔ عمرو نے اسکا تعاقب کیا۔ اور اُس کو شکست دی۔ اس فتح کی خبر بغداد مین ۸۹۶ء مین پہنچی۔ اور ایک ہفتہ بعد ہی یہہ خبر ملی کہ رفیع کو طوس کے قریب ایک اور شکست ہوئی ہے اور خوارزم مین پناہ لی ہے جہان وہ مارا گیا اس واقعہ سے عمرو اور خلیفہ دونون رفیع سے آزاد ہوگئے۔

رفیع کی شکست اور موت کے بعد عمرو کے ہاتھہ اسکے بہائی علی کے دو بیٹے بھی لگ گئے اور ایک دفعہ پھر وہ خراسان کا بلا شرکت غیرے بادشاہ ہوگیا۔ ۸۹۷ء مین خلیفہ معتضد نے اسے رے کا حاکم مقرر کیا۔ اسکے بدلہ مین عمرو نے حاجیون کے رستہ مین سرائے تعمیر کرانے کے لئے بہت سا روپیہ خلیفہ کی خدمت مین روانہ کیا۔ اس وقت وہ اپنے عروج کے انتہائی درجے پر پہنچ چکا تہا۔ اور یعقوب سے بدرجہا زیادہ طاقتور تہا۔

مگر معتضد کی آنکھون مین عمرو کانٹے کی طرح کھٹک رہا تہا۔ خلیفہ منصور کے بعد خاندان عباسیہ کا لائق خلیفہ معتضد ہی ہوا ہے۔ اس نے پھر اپنے خاندان کو عروج دینے کی کوشش کی۔ اور ایسی صورت مین عمرو کسی طرح بھی اسکی دوستی کا طالب نہ ہوسکتا تہا۔ آخر کار خود عمرو کی ہی بیوقوفی نے خلیفہ کو چھیڑ چھاڑ کا موقع دیا وہ بار بار ماوراء النہر کے اضلاع کا مطالبہ کرتا تہا

کیونکہ یہہ اضلاع قدرتی طور پر خراسان کا ایک حصہ ہے - جو یعقوب کے جولان گاہ رہ چکے تھے - اسوقت اس پر سامانی بادشاہ قابض تھے - اور ان کے عدل و انصاف کی وجہ سے یہہ علاقہ نہایت ہی سرسبز و شاداب ہوگیا تھا معتضد نے بالآخر عمرو کی درخواست کو منظور کرلیا - اور اسے باقاعدہ ماوراءالنہر کا گورنر مقرر کردیا - کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی اس نے اسمعیل سامانی کو عمرو کی معزولی سے اطلاع دی - مگر یہہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی اس لیئے کہ اس دورخی سے بغیر ہی خلیفہ اپنا مطلب حاصل کرسکتا تھا - کیونکہ یہہ یقینی بات تھی کہ سامانی اسکا مقابلہ کرتا - اور اسکا نتیجہ اگر عمرو کو بالکل نیست و نابود نہ کردیتا تو کم از کم اسکو بے حد کمزور کردیتا - اس فرمان کے ملتے ہی عمرو نے ایک فوج جیحون کو عبور کرنے کے لئے اِرسال بھیج دی - اس طرف سامانی مقابلہ کے لئے آگے بڑھا - یہہ دیکھکر عمرو کی فوج پیچھے ہٹی اور ابیورد کے مقام پر اس نے شکست کھائی - اسمعیل نے اسکا تعاقب نہ کیا بلکہ واپس چلا گیا اب عمرو نے اپنے مشیروں کے خلاف مشورہ خود جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ کیا - اس وقت یا شائد اس سے بھی پہلے اسمعیل نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اپنی موجودہ سلطنت پر قانع ہوکر بیٹھا رہے - مگر عمرو کس کی سنتا تھا - اور جب لوگون نے اس سے جیحون کو عبور کرنے کی مشکلات کا ذکر کیا تو اس نے جواب دیا کہ اگر مین چاہون تو دریا کے رخ کو سونے کی تھیلیون سے بدل سکتا ہون - بہرحال وہ فوراً بلخ چلا گیا - جو دریا جیحون کے کنارہ پر واقع ہے - اسمعیل پھر مقابلہ کے لئے تیار ہوا - اسوقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تمام رعایا اپنے ملک و مال کی حفاظت کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہوگئی تھی - اسمعیل نے فوراً بلخ کا محاصرہ کرلیا - شائد اس سے عمرو ایک دو شکستین کھاچکا تھا - اس نے صلح کی درخواست کی مگر بے سود - آخر وہ جنگ پر مجبور ہوگیا - مگر اوس کی فوج کے پاؤن اکھڑ گئے - اور جسکے جدھر سینگ سمائے بھاگ گئے - عمرو خود بھی ایک دلدل مین پھنس کر گرفتار ہوگیا - اور تنہا رہ گیا - اسمعیل کی فتح کی خبر بغداد مین ۲۸ مئی سنہ ۹۰۰ء کو پہنچی - معتضد نے فوراً

اسمعیل کو خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور اسطرح خراسان ایک مدت تک سامانی سلطنت کا صوبہ بنا رہا۔ مگر پارس خلیفہ نے ایک اور کو بخش دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسمعیل نے عمرو کو اختیار دیا تھا کہ یا تو قید مین رہے یا اگر چاہے تو اسکو خلیفہ کے پاس بھیجدیا جائے اور خود اس نے خلیفہ کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اگر یہہ بات صحیح ہے تو عمرو نے معتضد کی طبیعت کا صحیح اندازہ نہین کیا تھا۔

عمرو اور معتضد کی دوستی محض دکھاوے کی دوستی تھی۔ خلیفہ اسکو ہمیشہ غاصب ہی سمجھتا رہا۔ اغلب یہہ ہے کہ خود خلیفہ کی خواہش سے عمرو اسکے حوالہ کیا گیا۔ ۲۳ اپریل سنہ ۹۰۱ع مین عمرو بغداد پہنچا۔ اسمعیل سامانی نے اسکے ساتھہ ایک خادم کر دیا تھا جسکو حکم تھا کہ اگر اسکے طرفدار ذرا بھی بغاوت کی کوشش کرین تو عمرو کی گردن مار دے۔ وہی عالیشان بادشاہ جسکے تحائف چار سال قبل بغداد کی گلیون مین دکھائے گئے تھے۔ اب اسی شہر مین بے سر و سامان نہایت ہی ذلیل حالت مین داخل ہوا۔ اس عبرتناک حالت کا اثر عوام پر بھی ایسا پڑا کہ انھون نے اس پر معمول کے مطابق لعنت نہ بھیجی۔ ایک شاعر بیان کرتا ہے کہ اس حالت مین عمرو نے خدا سے دعا مانگی کہ اس کو اس عذاب سے نجات دے۔ اور پھر وہی شاہانہ زندگی اسے حاصل ہوجائے۔ یہین بغداد مین وہ ایک سال کی قید کے بعد اوائل اپریل سنہ ۹۰۲ع مین معتضد کی موت کے دن قتل کر دیا گیا۔ شاید یہہ کام دربار کے کسی امیر کے مشورہ سے کیا گیا ہوگا۔ جسے ڈر تھا کہ نئے خلیفہ کے وقت مین وہ شاید پھر خود سر ہوجائے یا یہہ بھی ممکن ہے کہ خود معتضد کے اشارے سے اسکو قتل کیا گیا ہو۔ کیونکہ الصفار کا زندہ رہنا حکومت کی آئندہ بہبودی کو ضرور خطرے مین ڈال سکتا تھا۔ موت کے قبل ہی سنہ ۹۰۱ع مین سپاہیون نے اس کے پوتے طاہر کو اپنا بادشاہ مقرر کر لیا تھا۔ اور پارس کو فتح کر کے سوسیانہ پر قبضہ کرنے کی تیاری کر دی تھی۔

عمرو اپنے بھائی یعقوب کی طرح کوئی بڑا جنرل نہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ عقلمند

اور حکومت کے اصول کو سمجھتا تھا - سپاہی اس کے گرویدہ تھے - اور یعقوب کی طرح
اس کا خزانہ بھی ہمیشہ بھرپور رہتا تھا - بعض اوقات اس کے افسر بڑی بڑی رقوم
دینے پر مجبور کئے جاتے تھے - جو خود وہ بسا اوقات ظلم و تعدی سے وصول کیا کرتے تھے
روپیہ کی افراط اور بیش بہی کی بدولت اسنے ہمیشہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھا حتی کہ جوع الارض
نے بالآخر اس کا ستیاناس کر دیا - اسکی والی نسلیں بہت جلد اسکو بھول گئیں - اور صرف
چند عمارات ہی اس کا نام اور عظمت قائم رکھنے کے لئے باقی رہ گئیں -

اسکا پوتا طاہر بھی چندروز تک پارس اور سیستان میں فساد مچاتا رہا - آخر ۹۰۸-۹ سنہ
میں ایک مملوک کے ہاتھوں شکست کھا کر قید ہوا اور بغداد لایا گیا - اسکے بعد علی کے
تین بیٹے ظاہر ہوئے مگر جلد ہی ناپید ہو گئے - له

پچاس برس بعد ایک شخص خلف نام سیستان میں سامانیوں کے ماتحت حکومت
کرتا تھا - اسکے نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ عمرو کی اولاد میں سے تھا - سیستان میں اب
بھی خانہ صفاریہ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے - خلف ایک دیندار اور
علم دوست بادشاہ تھا - اسکے حکم سے قرآن شریف کی ایک تفسیر سو جلدوں میں لکھی گئی
اور یہی سب سے بڑی تفسیر ہے جس کا ذکر تاریخوں میں پایا جاتا ہے - مگر خلف
بھی اپنے آبا و اجداد کی خصلتوں سے بالکل پاک نہ تھا - ذرا سے شبہ پر اسنے اپنے
بیٹے طاہر کو قید کر لیا - اور وہ وہیں خودکشی کر کے مر گیا - سنہ ۱۰۰۲ء میں خلف محمود غزنوی
کے ہاتھوں میں قید ہو گیا - اور سنہ ۱۰۰۸ء میں مر گیا - اسکے بعد ابو حفص نے محمود کے ہاں ملازمت
اختیار کر لی - اور اسطرح اس عظیم الشان خاندان کا خاتمہ ہو گیا -

محمد جمیل الرحمن - ایم - اے -

له - خاندان صفاریہ کا شجرہ نسب یہ ہے -

لیث
علی — عمرو — یعقوب
محمد
یعقوب — طاہر

حلقہ قرآن

از مولوی عالم ابوالمعظم سید عبد الغفار صاحب (دار العلوم)

خدا کا برتر و اعلی عطیہ مسلمانون پر نزول قرآن ہے جس نے معاد و معاش مین ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ملت باطلہ کا بطلان حقیقت اسلام کے براہین دانا دل و بینا آنکھہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ دیکھنے والی آنکھہ سوچنے والے دل نے دیکھا سوچا سمجھا اور جہانتک ادراک نے کام دیا اس بے پایان دریا سے دُر نصیحت ساحل ہستی پر لایا۔ اہل بینش و دانش نے تفاسیر لکھے۔ اور مبدا ر فیاض سے جس قدر فیضان اون کے قلوب پر فائض ہوتے گئے تحریر کئے تاکہ سہولت پیدا ہو۔ لیکن ایل افراد نے اسکی قدر و منزلت یہہ کی کہ اوسے طاق نسیان پر رکھدیا آج اکثر لوگون کو یہہ بھی نہین معلوم کہ ابتدا کلام مجید کی الم سے ہوتی ہے یا عم سے۔ اگر خوش اعتقاد سلف نے خلف کو بچپن مین قرآن پڑہا بھی دیا تو چلتی ہوئی دنیا کی روش نے کالج کی تعلیم سے اتنی فرصت ندی کہ شکسپیر کے ڈرامے اسکاٹ کے ناول چہوڑ کر موسی و فرعون کے ایک ہی قصہ کو بار بار لوٹاتے۔ بیشک یہ بیجا زحمت کیون گوارا کی جاتی تاسس کو ہمیشہ تاکید پر فوقیت حاصل ہے۔ الافادۃ خیر من الاعادۃ برنیالڈ کے تصانیف تہیٹر کے کرشمے روز ایک نہ ایک جدید طرز مین عمدہ سبق سکہلاتے ہین۔ برخلاف وہ کتاب قدیم جس مین جب پڑہو وہی حضرت یوسف و حضرت یعقوب کی جدائی کا قصہ نظر آتا ہے اور وہ بھی عربی زبان مین فرمایا ہو کس کا اللہ میان کا دل بہلے تو کیونکر بہلے۔ حکایت بیان کرتے کرتے فرمادیا گیا کہ ان عذاب اللہ لشدید لو کانوا یفقہون۔ اس ہیئت کے بنانے اور بھی دل مین الجہن ذوق مین بدمزگی پیدا کردی

بڑہنے کو طبیعت خواہش کرے تو کیونکر کرے کون مجرم اپنی فرد جرم اپنی زبان سے پڑہنا
پسند کریگا انجمن ثمرات الادب نے زیر صدارت عالیجناب مولوی حمید الدینصاحب
بی۔ اے۔ جو حلقہ قرآن قایم کیا اوسکا منشا رہے کہ عوام الناس مین تلاوت قرآن کا مذاق
پیدا ہو اور لوگ قرآن کے مضامین پر غور و خوض کرنے کی عادی ہون مگر افسوس ہے
کہ اس مغز متبرک مجلس مین شرکت قبول کرنے والے اصحاب معدودے چند نظر آتے ہین
عصر قدیم کا مذاق دہر جدید کے مذاق سے کیا نسبت رکہتا ہے یہ کتب قدیمہ کے مطالعہ سے
واضح ہوجاتا ہے مگر میرا منشا یہ ہے حضرت رابعہ بصری کا ایک مکالمہ لکہنا ناظرین کے
ترغیب و تحریص کا باعث ہونے کے علاوہ دلچسپی سے بہی خالی نہ ہوگا کہ جب آپ کسی سے
گفتگو فرماتی تہین کلام پاک کی آیتون سے جس سے مخاطب کے سوال کا جواب ادا ہوجاتا
تہا۔ ایک وقت کا واقعہ ہے کہ عبد اللہ ابن مبارک جو امام اعظم رضی اللہ عنہ کے ارشد
تلامذہ مین تہے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے راہ مین رابعہ بصری سے ملے یہہ راہ مین
بیٹہی ہوئی تہین کوئی آگے پیچہے نہ تہا جو گفتگو ہوئی وہ اکثر کتابون مین منقول ہے مکالمہ
بہت دلچسپ ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

عبد اللہ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

رابعہ بصری۔ سلام قولاً من رب رحیم (سلام قول ہے پروردگار مہربان کی جانب سے)

عبد اللہ۔ خدا تم پر رحمت کرے۔ یہان کیا کر رہی ہو۔

رابعہ بصری۔ ومن یضلله فلا هادی له (جس کو اللہ گمراہ کردے اسکو راہ بتلانے والا کوئی نہین۔

عبد اللہ۔ دل مین سمجہے یہہ راہ بہول گئی ہے۔ اور کہا کہان جاتی ہو۔

رابعہ بصری۔ سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (پاک ہے
وہ اللہ جو لے گیا اپنے بندے کو مسجد حرم "کعبہ" سے مسجد اقصیٰ "بیت المقدس" کیطرف

عبداللہ۔ سمجھے حج سے فراغت کر کے بیت المقدس جاتی ہے اور پوچھا۔ کب سے تم اس مقام پر پڑی ہو۔

رابعہ بصری۔ ثلاث لیال سویا (تین راتین پوری) یعنی تین دن سے۔

عبداللہ۔ تمہارے پاس کھانا تو نہین۔ آخر تم نے بسر کیونکر کی۔

رابعہ بصری۔ ھو یطعمنی و یسقینی (وہی ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے)

عبداللہ۔ تم وضو کس چیز سے کرتی تھین۔

رابعہ بصری۔ فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا (اور نہ پاؤ تم پانی تو تیمم کرو پاک مٹی سے)

عبداللہ۔ میرے پاس کھانا ہے کھاؤگی۔

رابعہ بصری۔ ثم اتموا الصیام الی اللیل (پھر تمام کرو روزے کو تم رات تک)

عبداللہ۔ یہ رمضان کا مہینہ تو نہین ہے۔

رابعہ بصری۔ ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم۔ (اور جو بطور نفل نیک کام کرے تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔)

عبداللہ۔ لیکن سفر مین تو ہمین روزہ نہ رکھنا مباح ہے۔

رابعہ بصری۔ وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ (اور اگر روزہ رکھو تم تو تمہارے حق مین بہتر ہے اگر تم جانتے ہو)

عبداللہ نے اُن کی قرآن خوانی سے عاجز آکر کہا جسطرح مین تم سے باتین کرتا ہون اسیطرح آزادی سے تم مجھسے باتین کیون نہین کرتین۔

رابعہ بصری۔ ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید۔ (نہین منہ سے نکالتا ہے کوئی بات مگر یہ کہ اس پر ایک جاسوس مہیا ہے)

عبداللہ نے پوچھا تم کس قبیلے کی عورت ہو۔

رابعہ بصری۔ ولا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولیک کان عنہ مسئولا (اور نہ واقف ہو تو اس چیز سے جس کا تجھے علم نہین ہے بیشک کان اور دل سب سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔

عبد اللہ نے کہا مجھسے خطا ہوئی معاف کرو۔

رابعہ بصری۔ لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم (نہین تمپر سرزنش اللہ تمہارے گناہ معاف کرے۔

عبد اللہ۔ مین تمہین اپنی اونٹنی پر بٹہاکے لیچلون۔ چلوگی۔

رابعہ بصری۔ وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ (اور جو نیکی کا کام تم کرو اللہ اوسے جانتا ہے)

عبد اللہ۔ اونٹنی بٹہائی اور کہا آؤ۔

رابعہ بصری (قل للمومنین یغضوا من ابصارھم (کہہ تو مومنین سے کہ اپنی آنکہین بند کرلین۔

عبد اللہ نے اپنی آنکہہ اون کی طرف سے پہیرلی اور کہا لو سوار ہو۔

رابعہ بصری جیسے ہی سوار ہونے کا قصد کیا اونٹنی بہڑکی اور اون کی چادر پہٹ گئی اپنی چادر کو پہٹتے دیکہکر بولی وما اصابکم من مصیبۃ فیما کسبت ایدیکم اور تمکو جو مصیبت پہونچے وہ خود تمہارے ہاتہون سے ہے۔

عبد اللہ نے کہا اچہا تم ذرا ٹہرجاؤ مین اونٹنی کو باندہ دون جب تم سوار ہونا۔

رابعہ بصری۔ ففہمنا سلیمان (پس سمجہایا ہم نے سلیمان کو)

عبد اللہ۔ اونٹنی کو باندہکر کہا۔ اب سوار ہو۔

رابعہ بصری سوار ہوئین اور اونٹنی کی پیٹہ پر بیٹہکر کہا۔ سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون (پاک ہے وہ اللہ جسنے اسکو ہمارا مطیع کیا اور ہم اسکی صلاحیت نہین رکہتے تھے۔ اور ہم اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرنے والے ہین۔

عبد اللہ۔ اونٹنی کی مہار ہاتہہ مین لی اور شور مچاتے ہوئے چلے۔

رابعہ بصری - واقصد فی مشیک و اغضض من صوتک (نرمی کرو اپنی چال مین اور پست کرو اپنی آواز کو -

عبداللہ - یہہ سنکر آہستہ آہستہ چلنے لگے - اور چلانیکی جگہہ دہیمی آواز سے بطور ترنم کچھہ اشعار پڑہنے لگے -

رابعہ بصری - فاقرؤا ما تیسر من القرآن (پڑہو جس قدر توفیق ہو قرآن سے)

عبداللہ - نے کہا اللہ نے تم مین بہت سی نیکیان پیدا کی ہین -

رابعہ بصری - وما یذکر الا اولوا الالباب (اور نہین سمجھتے ہین مگر صاحبان عقل)

عبداللہ - نے تہوڑی دور چلکر دریافت کیا کہ تمہارے شوہر بھی ہین -

رابعہ بصری - یا ایہا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نہ سوال کرو ان چیزون سے کہ اگر ظاہر ہو جائین تو تمکو بری معلوم ہون)

عبداللہ - یہ سنکر خاموش ہوگئے اور چلتے چلتے قافلے مین پہونچے اور رابعہ سے دریافت کیا کہ قافلے مین تمہارا کون ہے -

رابعہ بصری - المال والبنون زینۃ الحیوٰۃ الدنیا (مال اور دولت دنیاوی زندگی کی زینت ہین -

عبداللہ - سمجھے کہ اون کے بیٹے قافلے مین ہین - کہا - انکا پتہ کیا ہے -

رابعہ بصری - علامات وبالنجم ہم یہتدون (اور علامتین ہین اور تارون سے وہ راستہ پاتے ہین -

عبداللہ - سمجھے کہ ان کے لڑکے قافلے کے رہبر ہین اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے خیمون مین پھرنے لگے - اور رہبرون کے حلقے مین پہونچکر رابعہ سے کہا کہ تمہارا

خیمہ کونسا ہے پہچانو ۔

رابعہ بصری ۔ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا و کلم اللہ موسیٰ تکلیما

یا یحییٰ خذ الکتب بقوۃ (اور لیا اللہ نے ابراہیم کو دوست اور بات کی

اللہ نے موسیٰ سے اچھی طرح ۔ اے یحییٰ لے تو کتاب مضبوطی سے ۔

عبد اللہ ۔ سمجھے کہ یہہ ان کے بیٹون کے نام ہین اور آواز دی ۔ ای ۔ ابراہیم

اے موسیٰ ۔ اے یحییٰ ۔ آواز سنکر تین نوعمر لڑکے نکلے جو اسقدر خوبصورت تھے

کہ گویا چاند کے ٹکڑے تھے ۔ لڑکون نے اپنی مان کو اتارا اور عبد اللہ سے بیٹھکر

باتین کرنے لگے ۔

رابعہ بصری ۔ نے یکایک چلا کر کہا ۔ فابعثوا احدکم بورقکم ھذہ الی

المدینۃ فلینظر ایہا ازکیٰ طعاما فلیاتکم برزق منہ ۔

یہہ سنتے ہی ان لڑکون مین سے ایک فوراً بازار دوڑ گیا اور جو کچھہ ملا لاکے عبد اللہ

کے سامنے رکھدیا ۔

رابعہ بصری نے کہا ۔ کلوا واشربوا ھنیأ بما اسلفتم فی الایام الخالیہ

کھاؤ اور پیو برکت کے ساتھہ بعوض اسکے کہ جو گذشتہ خالی دنون مین تم کر چکے ہو

رابعہ بصری کی باتین سُن سُن کر عبد اللہ اسقدر حیرت مین تھے کہ لڑکون سے

کہا سنو ۔ مین اپنے اوپر تمہارے کہانے کو حرام سمجھتا ہون جب تک یہہ بیان

نکرو کہ یہہ کون خدا کی بندی ہین اور ان کی کیا داستان ہے لڑکون نے

کہا ہمین بیان کر دینے مین کوئی عذر نہین ہے یہہ ہماری والدہ ہین ۔ چالیس

برس ہوئے جب سے سوا قرآن کی آیات کے اور کوئی لفظ ان کی زبان سے نہین نکلا

اور انہون نے اس خوف سے اور باتین کرنا چھوڑ دی ہین کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان سے

نکل جائے جس کی قیامت کے دن جوابدہی کرنا پڑے ۔

امرؤ القیس

از مولوی زیاضیل منشی فاضل عبدالقدیر صاحب پروفیسر ادب دار العلوم

نام و نسب امراؤ القیس بن حُجر بن الحارث بن عمرو حُجر اکل المرار بن معاویہ بن نور و ثور کا دوسرا نام کندہ ہے اسکی طرف قبیلہ ہی کندہ منسوب ہے۔ امراؤ القیس کا نام جندح ہے۔ تفاد لا امرؤ القیس لقب دیا گیا یعنی زور و قوت کا آدمی کیونکہ قیس کے معنی قوت کے ہین اور امرؤ القیس کی مان فاطمہ بنت ربیعہ بن الحارث بن زہیر ہے جو کلیب و مہلہل کی بہن ہے کلیب کے متعلق عرب کا قول ہے۔ اعز من کلیب وائل۔ اور جس کے فعل سے حرب بسوس برپا ہوئی جو بکر و تغلب مین ۴۰ سال قایم رہی۔

امرؤ القیس کا دادا حارث تبع آخر کا بھانجا تھا ہندہ بنت الحارث منذر کی جورو امرؤ القیس کی پھوپی ہے۔ ہند سے عمرو بن المنذر معروف بمحرق اور قابوس بن المنذر پیدا ہوئے۔

حالات اہل یمن کا خیال ہے کہ تبع اخیر نے حارث کو بادشاہ بنادیا تھا بعض کا خیال ہے کہ قباد شاہ فارس نے حارث کو تمام عرب کا بادشاہ بنایا تھا جب قباد مرگیا اور نوشیروان بادشاہ ہوگیا تو نعمان بن منذر بن ماء السماء کو حیرہ کا بادشاہ بنایا حارث کے بعد حجر کے تحت

سے ۔ اگرچہ یہ اس مضمون کا ابتدائی حصہ شایع ہوچکا ہے مگر کتابت کی چند غلطیان ہوگئین تہین اسلئے دوبارہ شایع کیاجاتا ہے۔

بنی اسد وغیرہ تھے۔ حجر بنی اسد سے کچھہ خراج یا ٹکس لیا کرتا تہا۔ اسد نے ادا ءِ خراج سے مخالفت کی اور حجر و بنی اسد مین لڑائی ہونے لگی۔ حجر نے بنی حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم کی مدد سے بنی اسد کو خوب مارا امرؤ القیس کہتا ہے۔

تمیم بن مر واشیاعہا　　وکندۃ حولی جمیعاً صبر

یعنی بنی تمیم بن مر اور اوسکے ساتہی　　اور کندہ میرے اطراف مین جو سب صابر ہین

حجر نے بنی اسد کے چند سردار ون کو ڈنڈون سے مار کر مار ڈالا۔ لہذا بنی اسد کا نام عبد العصا پڑ گیا۔ چند سردارون کو قید کر لیا جس مین عبید بن الابرص بھی تہا اس نے ملک حجر کے سامنے کھڑے ہو کر یہہ شعر کہے۔

یا عین ما فابکی بنی　　اسد ہم اہل الندامۃ

اے آنکھہ بنی اسد پر رو　　وہ نادم اور تائب ہو گئے ہین

اہل القباب الحمر و النعم المؤبل و المدامہ

جن کے پاس سرخ خیمے بکثرت شتر اور شراب ہے

مہلاً ابیت اللعن مہلاً　　ان فیما قلت امہ

جلدی نہ کیجیے لعنت سے آپ ابا و انکار کرین جلدی نہ کیجیے　　آپنے جو کچھہ کہا اس مین تشنگی ہے

فی کل واد بین یثرب و القصور الی الیمامہ

ہر وادی مین درمیان یثرب و قصور کے یمامہ تک

تطریب عان او صیاح محرق او صوت ہامہ

دردناک آواز ہے قیدی کی یا شور ہے جلنے والیکا یا الو کا بولنا ہے

انت الملیک علیہم　　وہم العبید الی القیامہ

تو اونکا بادشاہ ہے اور وہ تیرے غلام ہین قیامت تک۔

یہہ سنکر بادشاہ حجر نے انپر رحم کیا اور اون کو معاف کر دیا اور اون کو اون کے

ممالک کو واپس کر دیا۔ جب بنی اسد تہامہ سے ایک روز کے فاصلہ پر رہ گئے تو انکی
کاہن عوف بن ربیعہ اسدی نے پیشین گوئی کی اور کہا یا عبادی اے میرے بندو
بنی اسد نے کہا لَبَّیْکَ رَبَّنَا اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اس نے کہا والغلاب
غلب المغلب غالب اور ہے اور مغلوب اور رقی الابل کانہا ربرب وہ
اونٹوں میں ہے گویا کہ ایک اوڑھ لاتقلق راسہ الصخب - پریشان نہیں کرتا
اسکے سر کو شور و شغب هذه دمه ینعب یہہ اسکا خون رواں ہے وهو
غدا اول من یسلب - کل سب سے پہلے اس سے اسکا سامان چھین لیا
جائیگا لوگوں نے کہا من هو ربنا اے رب وہ کون ہے اس نے کہا لولا تجیش
نفس جائشه اگر جوش نفس نہوتا تو انبا تکما انه حجر صاحبه تو میں تم سے
صاف صاف کہدیتا کہ وہ حجر ہے بنی اسد نے بنی حنظلہ سے سازش کرلی کر وہ حجر کا ساتھ
چھوڑ دیں اور بنی اسد و کندہ کے جنگ میں شریک نہوں - بنی حنظلہ نے حجر کی مدد سے
کنارہ کشی کرلی - بنی اسد نے کندہ پر حملہ کیا اور دن چڑھنے سے پہلے حجر کو جو سو رہا تھا قتل کر دیا
اسکے قاتل کا نام علباء بن الحارث الاسدی ہے بنی اسد کو کندہ پر فتح نصیب ہوئی اور
امرء القیس نے بھاگ کر اپنی جان بچائی - عبید ابن الابرص کہتا ہے هلا سالت جموع
کندة یوم ولوا اھاربینا - تو نے کندہ کی جماعتوں سے کیوں نہ پوچھا جب وہ پیٹھ پھیر کر
بھاگ گئے - امرء القیس کو اس کے باپ نے اپنے گھر سے نکالدیا تھا دارۃ جلجل اور فاطمہ کے
واقعہ کی وجہ سے باپ کی خبر مرگ کے وقت وہ مقام دمون میں تھا - اس وقت اس نے
کہا تطاول اللیل علینا دمون ‏ ‏ ‏ دمون انا معشر یمانون

انّنا لاھلنا محبّون ؏

اے دمون غم کی وجہ سے ہم پر شب دراز ہوگئی - اے دمون ہم اہل یمن ہیں -
اور ہم اپنے اہل کو دوست رکھتے ہیں - پھر اس نے کہا -

صیعنی صغیرا وحملنی دمه کبیرا لاصحو
الیوم ولا سکر غداً الیوم خمر وغدا امرٌ

میرے باپ نے جب مین کم عمر تہا مجہے ضائع کردیا اور جب مین بڑا ہوگیا تو اپنے خون و انتقام کا بار گران مجہپر ڈال دیا - آج تو شراب سے افاقہ نہین اور کل نشہ نہین - آج شراب ہے اور کل بڑا کام ہے - پہر اس نے کہا -

خلیلی ما فی الیوم مصحی یشارب ولا فی غدٍ اذ کان ما کان مشرب

اے میرے دوستو آج شراب خوار کیلئے افاقہ نہین ہے - اور کل بہر حال شراب خواری نہین ہے - پہر اس نے قسم کہائی کہ نہ وہ گوشت کہائیگا نہ شراب پیئگا نہ سر دہوئیگا - جب تک اپنے باپ کا قصاص و انتقام نہ لیگا اس نے ذوجدن حمیری اور قبیلہ بنی بکر سے مدد لی اور ایک بڑا لشکر لیکر چلا - اس خبر کی جب بنی اسد کو اطلاع ہوئی تو اپنے مقامات سے نکل کر بنی کنانہ بن خزیمہ کے پاس جا اترے امرؤ القیس نے بنی اسد سمجہکر بنی کنانہ کے بہت سے آدمیون کو مار ڈالا جب اسکو اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی تو کہا -

الا یا لہف نفسی اثر قوم ہم کانوا الشفاء فلم یصابوا

اے میرے افسوس قوم کے پیچہے یعنے بنی اسد کی طلب مین ان کا قتل میرے جوش انتقام کی شفا تہا مگر وہ نہین ملے اور نہ کوئی اُن کو مصیبت پہنچی - پہر اسنے تلاش کرکے بنی اسد کو خوب قتل کیا اور یہہ شعر لکہے -

قولا لدودان عبید العصا ما غرکم بالاسد الباسل

اے میرے دو دوستو دودان سے کہنا کہ عصا سے پٹنے والے غلامو تمہین کس چیز نے دہوکا دیا کہ بہادر شیر سے لڑ پڑے -

قد قرت العینان من وائل ومن عمرو ومن کاہل

بنی وائل و بنی عمرو و بنی کاہل سے آنکھیں ٹھنڈی ہوئین۔

نطعنہم سلکی ونخلوجۃ　　کرلک لامین علی نابل

ہم اون کو سیدھے اور ترچھے نیزے مارتے ہین　تیر اٹھا کر حملہ کرنا دو زرہین پہنے ہوئے

تیر انداز پر۔

حلت لی الخمر وکنت امرءً　　عن شربہا فی شغل شاغل

اب مجھے شراب پینا حلال ہوگیا ہے اور میری قسم پوری ہوگئی ہے کیونکہ مین نے

اپنے دشمنون سے انتقام لے لیا ہے اور اس سے پہلے ایک اہم کام اور شدید

شغل مین مشغول رہنے کی وجہ سے شراب سے اعراض کرنا پڑا تہا۔

فالیوم اشرب غیر مستحقب　　اثماً من اللہ ولا واغل

آج مین شراب پیتا ہون اور چونکہ مین نے اپنا عہد پورا کرلیا ہے۔ اور اپنا انتقام

لے لیا ہے۔ لہذا اب مین خدا کا گنہگار نہوگا۔

فتح سسیلی[۵۱]

از خواجہ میر طاہر علی خان صاحب متعلم نظام کالج ؏۔

سنہ ۱۸۰ھ مین امیر المومنین خلیفہ ہارون رشید نے ابراہیم اغلب التیمی کو گورنر

آفریقیہ مقرر فرمایا تہا جسکی اولاد خلفاء عباسیہ کے طرف سے سنہ ۲۹۶ھ تک مصر مین حکمران

رہی۔ یہہ مبارک خاندان اسلام کے بہت سی خدمت صدق دل سے بجا لایا۔

ابراہیم کا بیٹا زیادۃ اللہ خلیفہ مامون رشید کی نیابت کا فخر رکہتا تہا۔ اس نے سنہ ۲۰۲ھ

[۵۱] ایک جزیرہ ہے بحیرہ روم مین جو اب انگریزون کے قبضہ مین ہے۔

مین جنگی جہازات کا ایک بڑا بھاری بیڑا طیار کرکے جزیرہ سارڈینا[۱] فتح کیا اور سنہ ۲۰۷ھ مین جزیرہ سسلی پر حملہ آور ہوا رومی بیڑے کو تنگ تدبیر سسلی کے اطراف مین چند مستحکم اور مفید مقامات پر قبضہ کرلیا غرض اسیطرح کے کئی حملون کے بعد اس نے سوائے قصریانہ[۲] کے تمام سسلی فتح کرلیا ابھی وہ قصریانہ کی فتح کی تدبیر مین سوچ ہی رہا تھا کہ افریقہ سے کچھہ بغاوت کی خبرین آئین اور فوراً وہان چلا گیا اور قصریانہ کی مہم بہادر مجاہدین پر چھوڑ دی جنہون نے بڑی بڑی مصیبتون کے بعد قصریانہ کے اطراف و اکناف کے چند مقامات فتح کرلئے مجاہدین جبکہ شہر جرجنیت کا محاصرہ کر رہے تھے تو اچانک رومی فوج نے انھین محصور کرلیا اور بڑی بڑی تکلیفین دین۔ مگر بہادر جانبازان کے ہر حملہ کو پسپا کرتے رہے اور اپنی قندقون کو دشمنون سے بچاتے رہے کل مسلمانون کے شہید ہونے مین کوئی کسر باقی نہ تھی اور ان کی رسد بھی ختم ہو چکی تھی اتنے مین امیر عبدالرحمن اوسط والی اندلس کا جنگی بیڑا مدد کو آگیا اور بہادرون کو بچالیا جب مسلمانون نے اس بلا سے نجات پائے تو انہون نے بھی رومیون سے اپنے بدلے لینے شروع کردئے اور ان کو یہان تک تنگ کیا کہ وہ ہتیار ڈالکر بھاگ گئے۔ اسکے بعد مسلمانون نے شہر بلرم[۳] کا قصد کیا اور قلعہ کو محصور کرلیا گورنر بلرم نے محاصرہ سے خوف کھاکر شہر کو مسلمانون کے حوالہ کردیا اور معہ اپنے اہل و عیال کے اٹلی چلا گیا مجاہدین جب سنہ ۲۱۶ھ کو شہر مین داخل ہوئے اور جب یہہ داخل ہوئے تو شہر کی آبادی صرف تین ہزار رہگئی تھی یعنی (۶۷۰۰۰) ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ یہہ واقعہ خلیفہ مامون رشید کے زمانہ کا ہے۔

سنہ ۲۱۸ھ مین امیر المومنین معتصم باللہ خلیفہ ہوا اور مسلمان سنہ ۲۱۹ھ تک بلرم

---

[۱] یہہ جزیرہ بحیرۂ روم مین واقع ہے۔
[۲] یہہ سسلی کا پایہ تخت۔
[۳] بلرم ایک شہر ہے جسے پلرمو انگریزی کہتے ہین۔

ہی مین مقیم رہے کیونکہ سردی کا موسم اور برف باری کثرت سے تہی
بعد ازان مجاہدین فتح قصریانہ کی غرض سے نکلے اور قصریانہ کا محاصرہ کرلیا اور
رومیون کی فوجون نے قلعہ سے نکلکر مقابلہ کیا مگر شکست کہاکر پہر قلعہ بند ہوگئی مسلمانون
نے اس لڑائی کے بعد شہر ربیع کی طرف کوچ کیا اور وہان رومیون کا خوب استیصال کیا
سنہ ۲۲۲ھ مین قصریانہ کی طرف بڑہے -

اہل اٹلی بہت پریشان تھے کیونکہ قصریانہ کے بعد مجاہدین کی جولانگاہ اٹلی ہی ہوتی
رہی اسی لئے انہون نے والی کو بہت سی کمک دی اور تمام یورپ سے بھی کمک
دلوائی مگر اس زمانہ مین تمام دنیا مسلمانون سے خوف زدہ تہی - آفریقہ فتح ہوچکا تھا
وہان عمالان اسلام کا داب وضرب تھا - یورپ امیر عبد الرحمن اوسط سے کانپ
رہا تہا - ایشیا اور ابنائے قسطنطنیہ پر خلیفہ المسلمین معتصم باللہ کا سکہ بیٹھا ہوا تہا
خلیفہ کی فوجین رومیون کو شکست پر شکست دیں مسلمانون نے پھر قصریانہ پر حملہ
کیا اسکے اہل شہر اور رومیون نے قابل داد شجاعت دکھائی مگر نتیجہ وہی قسمت مین
لکھا تہا یعنی شکست اس مرتبہ تو والی قصریانہ کی بی بی گرفتار ہوگئی اور رومی کیمپ
لوٹ لیا گیا - بہت سا مال واسباب مسلمانون کے ہاتہہ لگا ہزیمت خوردہ
فوج قلعہ مین جابیٹھی اور مسلمانون نے بلرم سے جاکر فتح کیا اسکے بعد بعض مسلمان سپاہی
بدل گئے اور اس نے امیر محمد بن سالم کو قتل کردیا - زیادۃ اللہ والی افریقہ نے فضل
بن یعقوب کو امیر سسلی کرکے تازہ فوج کے ساتہہ روانہ کیا - بہادر فضل آتے ہی
نواح سرقولہ کو تاخت وتاراج کردیا اور پھر ایک عظیم الشان معرکہ مین شاہ قصریانہ کو
شکست دی - اس لڑائی مین بادشاہ ایک غازی کے ہاتہہ سے زخمی ہوکر گرا مگر اسکے
سپاہی اوسے میدان جنگ سے اٹھالئے گئے اُس وقت بھی مسلمانون کو بہت سا
مال واسباب ملا - اسی سال ماہ رمضان مین آفریقہ سے تازہ فوج آئی جسکا کمانڈر

ابو الاغلب تہا۔ رستہ مین اس نے رومیون سے بحری لڑائی لڑکے بہت سے
جہاز غرق اور گرفتار کر لئے۔

اسی اثنا مین مسلمانون نے کوہ اٹنا[۱] کے اطراف کے کئی قلعہ اور
فوجی مقامات کو فتح کئے اور دو مقامات پر شکست بھی کھائی۔ یہہ لڑائی یون ہی
جاری تھی کہ ۲۲۷ھ کو سلطنت عباسیہ کا ساواں دستاج زیادۃ اللہ والی
افریقہ راہی ملک بقا ہوا اور محمد بن اغلب جانشین ہوا۔ اور فضل بن یعقوب
نے سسلی مین خوب جوانمردی کے جوہر دکھائے اور شہر قسطانیہ۔ سرقوسہ
لوطس۔ اعوس کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس نے ایک رومی قیدی کی رہبری
سے (عین اسوقت جبکہ جاڑے کا موسم تہا اور برف باری کثرت سے ہو رہی
تھی) اپنے چچا[ر] باج کے ساتہہ شہر قصریانہ پر حملہ کرکے فتح کر لیا۔ وہ شہر جسکے
فتح کرنے کے لئے بڑے بڑے لوگون نے ہمت ہار دی تہی فضل نے فتح کر لیا
جب شہر فتح ہو گیا تو فی الفور ایک مسجد بنائی گئی اور جمعہ کے دن امیر المومنین خلیفہ
معتصم باللہ کے نام کا خطبہ پڑہا گیا فقط

ایک عرض

سرکار عالی کی درسگاہون سے شائع ہونے والا یہہ ہی پہلا رسالہ ہے۔ علم دوست
اصحاب سے گذارش ہے کہ وہ توسیع اشاعت فرمائینگے۔ تاکہ طلبہ کی
ہمت افزائی ہو۔

---

[۱] اٹنا سسلی مین ایک کوہ آتش فشان کا نام ہے جسے انگریزی مین (والکینو
) کہتے ہین۔

ثمرۃ الادب

صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا

ایک دوسرے کو تھام رکھو اور آپس مین ملکر رہو۔

از مولوی ابو حامد سید محمد صاحب سبزوار

آلہی آشنائے نامِ خود گردان زبانم را ‌ ‌ ‌ ‌ زبسم اللہ زینت بخش دیوان بنانم را

قدرت کا منشاء اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی مذہب کے پیرو رہین۔ اور تمام جہان مین ایک ہی مذہب رہے تو کیا اُس کی قدرت عظمیہ کے سامنے یہ بالکل آسان کام نہ تھا ؟

جس قدرت نے قسم قسم کی مخلوق اور انواع و اقسام کے مذاہب و مِلَل پیدا کر دیے ہین۔ اُس کے لئے ایک ہی نوع کی چیزین اور ایک ہی قسم کے مذہب کا پیدا کرنا کونسا مشکل کام تھا ؟ مگر نہین !

ایسا ہوتا تو تعریف کی بات ہی کیا تھی بلکہ اِس فعل سے اُس کی کمزوری اور بے بضاعتی ثابت ہوتی۔ اور بھلے بُرے کی تمیز نہ رہتی اور زندگی کا کچھہ مزا نہ آتا۔ دیکھو اگر سب مرد ہی مرد ہوتے یا سب عورتین ہی عورتین ہوتین یا تمام درخت ہی درخت ہوتے یا پتھر ہی پتھر یا اپنے جسم پر آپ قیاس کیجئے کہ اگر

اگر آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں۔ یہ جو مختلف اعضاء ہین نہ ہوتے اور ایک ہی قسم کا کوئی ایک عضو ہوتا یا مضغہ ہی۔ مضغہ رہتا تو اب مختلف اعضاء سے جو مختلف کام آپ لیتے ہین اُس حالت مین کس طرح لیتے اور ان کے وجود سے جو لطیف و لذیذ حظ آپ اُٹھاتے ہین کیسے اٹھاتے۔ اسی طرح سب ایک ہی نوع کی مخلوق ہوتی یا دنیا مین فقط ایک ہی مذہب ہوتا تو اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے عجائب و غرائب کا گونا گون ظہور کیسے ہوتا اور کون کس کی حمد و ثنا کرتا اور اللہ جل شانہٗ کی شان ربوبیت جیسی اب ظاہر ہوتی ہے اوس صورت مین کماحقہ کیونکر ظاہر ہوتی۔ اس کے سوائے بھی کسی چیز یا عقیدے کی بھلائی یا بُرائی اُسوقت ظاہر نہین ہوسکتی جب تک کہ اُس کے مقابل اُسی نوع کی چیز یا عقیدہ موجود نہ ہو مثلاً سیاہ بمقابلہ سفید، گندگی بمقابلہ نزاکت، شرک بمقابلہ توحید اور دنیا بمقابلہ عقبیٰ نہ ہوتے تو یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ کونسی چیز اچھی اور کون بُری ہے یا کونسا عقیدہ سچا اور کون جھوٹا ہے۔ علیٰ ہذا اگر ایک ہی مذہب ہوتا تو عقلون کا کھرا یا کھوٹا پن کیسے معلوم ہوسکتا؟

سچا مذہب۔ اب جبکہ مختلف مذاہب دنیا مین موجود ہین ان مین جو شخص اللہ پاک کے سچے مذہب کو قبول کر لیگا وہی عقل سلیم رکھنے اور وہی خدا کی رضا پانے والا بندہ ہوگا اور جو شخص سچے اور جھوٹے مین فرق نکرکے اللہ کی راہ سے پھیرنے والے مذہب کا پابند رہے گا وہ بارگاہ رب العزت سے دور جا پڑے گا۔ غرض اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ قسم قسم کی مخلوق کی طرح قسم قسم کے مذاہب بھی پیدا ہون اور وہ دیکھے کہ کون کون سا بندہ سچے مذہب کو مانتا ہے اور کون جھوٹے مذہب کی نمایشی اور گلٹی چھلاؤن مین دہوکہ کھاکر گمراہ ہوجاتا ہے۔ دیکھئے اللہ پاک فرماتا ہے:

ہر ایک کی ایک شریعت اور ایک راہ ہے لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا

اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک امت ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ

بنا دیتا۔ لیکن وہ تمہاری اس چیز میں آزمائش ولکن لیبلوکم فی ما آتکم

کر رہا ہے اس لیئے تم بھلائی میں سبقت کرو۔ فاستبقوا الخیرات۔

اس فرمان مقدس سے اللہ جل شانہٗ کی مشیت صاف ظاہر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو دنیا میں مختلف اور متعدد مذاہب و ملل دیکھ رہے ہیں یہ انسان کے خود ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے آزمائش کے ذریعہ ہیں پس ہر شخص پر لازم ہے کہ عقل سلیم سے کام لے اور ٹھنڈے دل سے غور کرے اور اچھی طرح دیکھے کہ کونسا مذہب یا دین سچا اور قابل قبول ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی دیکھو کہ اس نے سمجھداروں کی سہولت کے لیئے نشاندہی بھی کر دی کہ تمام دنیا کے کل مذاہب و ادیان میں کونسا مذہب یا دین سچا ہے۔ اللہ کے نزدیک تو سچا دین اسلام ہی ہے "اِنَّ الدِّین عند اللہ الاسلام ہ" پ ۳ س آل عمران۔

صراط مستقیم۔ اور یہ دین اسلام تیرے رب کی سیدھی راہ ہے۔ دھیان کرنیوالوں کے لیئے ہم نے کھول کھولکر آیتیں بیان کر دی ہیں۔ وھذا صراط ربک مستقیما قد فصّلنا الآیٰت لقوم یذّکّرون

پھر یہ فرماتا ہے اور جو شخص اسلام کے سوا دوسرا دین تلاش کریگا اس کا دین ہرگز مقبول نہ ہوگا اور آخرت میں وہ ٹوٹا پانے والوں سے ہوگا۔ ومن یّبتغ غیر الاسلام دینا فلن یّقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین ہ پ ۳ س آل عمران ع

"تاکہ انسان خدا پر نا انصافی کا دھبہ نہ لگائے۔ نیز عذر و حیلہ کی گنجائش نہ رہے نہ حرف

یہی کہکر خاموش ہوگیا بلکہ اس سچے دین کی خوبیون کو صاف صاف طور پر بیان کرنے کے لیئے وقتاً فوقتاً ہر قوم مین اپنے خاص خاص بندون کو بھی مامور فرمادیا تاکہ کسی کو سچے اور جھوٹے مذہب کی شناخت مین پریشانی نہ ہو اور یہ بھی فرمادیا کہ اُسی مذہب کو اختیار کرو جس مین سب مذاہب سے زیادہ خوبیان ہون بلکہ وہ سراسر خوبیون سے بھرا ہوا ہو اور باہمی حمیت کو کام مین نہ لاؤ کہ یہ وہ ہوگا ہے ہمیشہ سبقت کرو کہ زیادہ نیکیان تم مین جمع ہوجائین کیونکہ مذہب کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس مین نرا انفرادی یا ذاتی نفع یا نقصان (اچھے یا بُرے اعمال کرنے سے) ہوتا ہے یعنے تم کوئی اچھا کام کرو تو اسمین تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ اور اگر بُرا کام کروگے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ مثلاً اگر تم سخاوت کروگے تو مشہور نام اور نیکنام ہوجاؤگے اور اگر کوئی جرم کروگے تو سزا پاؤگے اور بدنام ہوگے پس دنیا مین بھی بُری کامونکے یہ نتیجے ہین تو عقبیٰ مین ایسا نہ ہونیکا کیا سبب ہے؟

تیرا نفع ہے نقصان۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ اَمَدًا بَعِيْدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ

القران الحکیم پ ۳ س ۳ ع ۳

وہ دن یاد کرو کہ جب ہر شخص اپنا اچھا اور بُرا عمل اپنے سامنے پائیگا اور آرزو کرے گا کہ کاش اوس کے اور اوس دن کے درمیان مین زمانہ دراز حائل ہوتا۔ اللہ تم کو اپنے جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ شفقت بھی رکھتا ہے اپنے بندون پر۔ اے محمد تو ان لوگون سے کہدے کہ۔ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری راہ پر چلو کہ اللہ تم سے محبت رکھے اور تمہارے گناہون کو بخشدے اللہ بخشنے والا مہربان ہے ٥ اے محمد!

تو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ نہ مانین تو سمجھے رہین کہ اللہ منکرون کو دوست نہین رکھتا۔

انسان نقصان مین۔

قسم ہے زمانہ کی کہ بیشک انسان گھاٹے مین ہے مگر وہ لوگ (گھاٹے مین نہین ہین) جو ایمان لائے ہین اور اچھے کام کرتے ہین باہم امر حق کی ہدایت کرتے رہتے ہین اور صبر کی بھی ہدایت کرتے رہتے ہین۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

القرآن الحکیم پارہ عمّ ۵

قرآن شریف کی یہ وہ سورۃ ہے جس کو ہم روزانہ پنج وقتہ نمازون مین کم سے کم ایک دو دفعہ تو ضرور ہی دہراتے ہین مگر غور کبھی نہین کرتے کہ اس کے نزول سے منشار رب کیا ہے؟

دیکھئے! اس مین تین امور ہین:-

(۱) انسان کا نیک کام کرنا اور
(۲) امر حق کی اور صبر کی ہدایت کرتے رہنا اور
(۳) خود صبر کی ہدایت کرتے رہنا

اوس کو خسران سے بچاتا ہے یعنی ایسا کروگے تو تم نقصان مین نہ رہوگے ورنہ ایسے لوگ تو ہر وقت گھاٹے ہی مین ہین جو ایسا نہین کرتے اگر تمہین اس کا یقین نہین آتا تو زمانہ پر نظر ڈالو وہ شاہد ہے کہ خود نیک کام کرنے والون اور دوسرون کو امر حق کی ہدایت اور صبر کی تلقین کرنے والون کو ان اعمال صالح کی کیا جزا ملی اور ایسا نہ کرنے والون نے کیا پھل پایا اور کونسا نام نیک چھوڑا؟

جہان ہمین یہ معلوم ہوا کہ نیک عمل نقصان کو مٹانے کا حربہ ہین وہان یہ بھی سمجھ مین آگیا کہ اعمال نیک کی ضد اعمال بد سے بچنا اور بچانا بھی نیکی مین داخل ہے جہان اورون کو امر حق کی تعلیم کرنی چاہیئے وہان خود کو بھی امر حق کے قبول مین ہمیشہ تیار رکھنا ضرور ہے۔ اور دوسرون کو صبر کی ہدایت کرکے خود اس سے الگ رہنا دانشمند کا کام نہین ہو سکتا۔ پس یہ بھی لازم ہے کہ رنج ومصیبت درد وزحمت خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہر ایسے حال مین اپنی ذات کو بھی صبر کی حد سے باہر نہ رکھنا چاہیئے۔

نیک کام بذات خود بدکاریون کا ازالہ کردیتے ہین۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ۔ یعنی تحقیق نیکیان بدیون کو دور کردیتی ہین ؕ (سورہٗ ہود) اور بدکاریون سے بچنا نیکی کی طرف خود بخود مائل کردیتے ہین۔ لہذا اولاً افعال واعمال بد سے بچین۔ اگر اللہ کا فضل شامل حال ہو تو نیکیان ہم مین آپ سے آپ چلی آئینگی اور بدی سے بچنا بھی تو نیکی ہے!

ہمین بعض لوگ ایسے بھی نظر آتے ہین کہ وہ نہ تو نیک کام ہی کرتے ہین اور نہ بُرے کامون کے عادی تو حقیقت مین ان لوگون کا شمار بھی بدون مین ہی ہوگا۔ کیونکہ یہ لوگ جو وقت بلا نیکی کے گذار رہے ہین وہ گویا ضایع ہو رہا ہے اور وقت جیسی بے بہا چیز کا ضایع کرنا کون سمجھدار کہے گا کہ بدی نہین ہے، بیشک ایسے لوگ بھی خسران سے محفوظ نہین رہ سکتے!

البتہ وہ لوگ ان سے بھی بدتر ہین جو اپنا وقت عزیز بُرے کامون مین صرف کرتے ہین۔ بُرے بھلے کامون کے صرف نام اگر لکھے جائین تو مین سمجھتا ہون کہ ایک چھوٹی سی کتاب بن جلائے گی مگر بُرائیون مین فساد بھی ایک برائی ہے۔ جس کا پیدا کرنا یا بڑھانا اچھے لوگون سے ظہور مین نہین آتا۔ یہ فعل قبیح ہر نیک نفس انسان کو

بُرا معلوم ہوتا ہے۔

فساد سے اللہ ناراض ہے۔ | اللہ سبحانہٗ بھی اس سے ناراض ہے۔ اور اُس شخص سے بھی ناخوش ہے جو فساد پھیلاتا ہے۔ یون تو دنیا مین سوائے شریرون کے اور کون ہے جو عمداً فساد پیدا کرے لیکن بعض کام ایسے ہین کہ ان کے کرنے سے فساد واقع ہوتا ہے اگرچہ اُس کام کے آغاز پر اُس کے نتیجہ (فساد) کا ادراک واحساس نہین ہوتا پس وہ لوگ اچھے ہین۔ جو اس قسم کے کامون سے بچے رہتے ہین۔ اور اچھے ہین وہ بھی جو کرنے کے بعد جب معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کام کا نتیجہ فساد کی صورت مین ظاہر ہوگا یا ہوا بھی ہے تو فوراً اس سے ہاتھ کھینچ لیتے ہین اور آیندہ ایسے افعال کے ارتکاب سے جہان تک اُن کے اِمکان مین ہوتا ہے پرہیز کرتے ہین اور اس مین کوئی شک نہین کہ بدترین ہین وہ لوگ جو فساد پیدا کرتے اور اس کو بڑھاتے اور منع کرنے پر اور دلیر ہوجاتے ہین۔

اللہ کو فساد پسند نہین ہے اور جب اُس مفسد سے کہا جاتا ہے" اللہ سے ڈر" تو حمیت (جاہلیت) اس سے گناہ کراتی ہے۔ اب اسے جہنم کافی ہے کہ وہ بُری جگہ ہے اور ایک آدمی وہ ہے جو اللہ کی خوشی کی تلاش مین اپنے آپ بکا ہے۔ اپنے بندون پر اللہ شفقت رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(القرآن الحکیم پارہ سیقول سورۃ البقرہ)

غرض فساد ایک بری بلا ہے۔ اللہ اس سے ہر مسلمان کو بچا رکھے اور ہر ایک کو توفیق دے کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق چلے اور اس کی رضا کا امیدوار رہے۔

فساد نہ صرف ذاتی و شخصی تنازعات ہی سے پیدا ہوتا بڑھتا اور پھیلتا ہے بلکہ مذہبی اعتقادات بھی اس کا باعث ہوتے ہیں اور ایسا فساد اتنا پوشیدہ ہوتا ہے کہ فریقین کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ باہم ایک دوسرے کو برسرناحق ٹھراتے اور مفسد وغیرہ خطابات شنیع سے مخاطب ومشہور کرتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اعتقادی مباحث جب طول پکڑتے ہیں تو ان میں نفسانی جذبات اور خاندانی حمیت وغیرہ نامعلوم طور پر سرایت کر جاتے ہیں۔ جس سے اس فساد کی آخری صورت ہر دو فریق کو مبتلائے مرض ظاہر کرتی ہے۔ گو ان میں سے ایک یا دونوں بوقت آغاز بحث برسرحق وراستی کیوں نہ ہوں اور جو فتنہ اوائل میں بآسانی فرو ہو سکتا وہ مشکل سے بھی آخر میں نہیں دب سکتا اور جب تک کہ فریقین کے ہر شخص میں اس جانب غور و تامل کرنے کا خیال نہ پیدا ہوا اور وہ صلح کا حامی نہ بن جائے اور کوئی صورت تصفیہ کی نہیں نکل سکتی۔ اور یہ بات اُسوقت تک نہیں پیدا ہو سکتی تاوقتیکہ فرداً فرداً اوامر و نواہی پر عمل نہ کیا جائے الحاصل معاملات مذہب میں باہم نہ جھگڑو کہ اس سے فساد پیدا ہوتا ہے اور تحقیق و تلاش امر حق سے کبھی ہاتھ نہ کھینچو کہ اس میں فریقین کا نقصان ہے یعنی کسی سے مذہبی یا اعتقادی مقابلہ ہو تو نفسانیت کو کام میں نہ لاؤ ٹھنڈے دل سے غور کرو جو بات باصواب ثابت ہو قبول کر لو اپنی رائے پر اڑے نہ رہو جو لوگ امور مذہبی میں کافر تو کافر کہا کرتے اور اپنی عمر عزیز کو ان قضیوں میں صرف کرتے ہیں انھیں اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا اچھی طرح خیال رکھنا چاہیئے ہاں اگر تمہیں کوئی اچھی بات معلوم ہو تو اوروں کو نصیحت کرو ماننا نہ ماننا اون کا کام ہے جبر کا تمہیں اختیار نہیں بلکہ ؎

دین میں زبردستی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۵

(القرآن الحکیم)

ایسا ہی اگر کوئی شخص تمہیں اچھی بات بتائے تو اُس کو قبول کر لو اس میں سب کا فائدہ ہے اور اس سے نفاق رفع ہو جائے گا۔ اتفاق اپنی جگہہ آپ لے لیگا اور تم ہمیشہ اس امر رب کو پیش نظر رکھو!!

ایمان والو! صبر کرو! ایک دوسرے کو تھام رکھو! آپس میں ملکر رہو! اور اللہ سے ڈرتے رہو! کہ تم مراد کو پہنچو ہ

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ہ

(القرآن الحکیم۔ آلِ عمران)

کوئی شخص کسی کے اعتقادات کو جبراً بدل دینے پر قادر نہیں ہے اور نہ کسیکو ایسا خیال زیبا ہے اور نہ رنجیدہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ (ذرا غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ) باپ بھی اپنے بیٹے کے اعتقادات کو پلٹ نہیں سکتا چہ جائے کہ غیر اشخاص کی نسبت اس کے امکان کی توقع رکھی اور تبدیل کی (لاحاصل) کوشش کیجائے دیکھو اللہ جل شانہ اسی معاملہ میں مسلمانوں سے فرماتا ہے۔

اعتقادات کو سوائے اللہ کے کوئی پلٹ نہیں سکتا۔

کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ نے جسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اُسے تم راہ پر لاؤ؟ جسے اللہ راہ نہ دکھائے اُسے تم میں سے کوئی بھی راہ نہیں دکھا سکتا ہ

اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا

(القرآن الحکیم۔ والمحصنٰت)

البتہ ہم سے اللہ جل و شانہ کے اس فرمان کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ مگر اولاً انفرادی قابلیت کی ضرورت ہے جو بعد میں آپ سے آپ مجموعی حیثیت اختیار کرے گی فرماتا ہے۔

تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھی بات کا

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ

حکم دے اور بُری بات سے منع کرے	عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
ایسے ہی لوگون کے لیئے فلاح ہے	وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا
تم اُن لوگون کی طرح نہ ہوجاؤ جواحکام	وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
صریح آجانے کے بعد متفرق ہوگئے	الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
اور اختلاف کرنے لگے ان پر بڑا	عَظِيْمٌ ع ۱۱
عذاب ہوگا۔	

پس ہمین چاہیئے کہ اپنی عاقبت بخیر بنانے کے لیئے اللہ رسول کے احکام پر چلیین۔ اور دوسرون کو بھی اس کی ہدایت کرین جو مانے جزا پائیگا جو نہ مانے سزا کا مستحق ہوگا۔ اُس کی بازپرس ہم سے نہ ہوگی :-

جس نے رسول کا حکم مانا اُس نے	مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ
اللہ کا حکم مانا۔ اور جس نے اُس سے	وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ
روگردانی کی (اس کی بازپرس تجھ سے	عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا۔
نہ ہوگی) ہم نے ان پر تجھے یعنے (محمد کو)	
نگہبان بنا کر نہین بھیجا ہے !!	

اللہ پاک صالحین کے اوصاف بیان فرماتا ہے کہ وہ :-

اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہین	يؤمنون بالله واليوم الاخر
اور بھلائی کا حکم دیتے ہین اور برائیون	ويامرون بالمعروف وينهون
سے منع کرتے ہین اور خود بھلائیون	عن المنكر ويسارعون فى
مین جلدی کرتے ہین۔ یہی لوگ صالحین	الخيرات واولئك من
سے ہین اور جو کچھ بھلائی (وہ) کرینگے	الصالحين ۝ وما يفعلوا من
اس کی ہرگز ناقدری نکیجائے گی۔ اور	خير فلن يكفروه ۝ والله عليم

اللہ پرہیزگاروں کو جانتا ہے۔ بالمتقین ہ
لن تنالو ع ۱۲ ال عمران ع ۱۲

لہذا جب اللہ پاک نے بھلائی حاصل کرنے مین سبقت کرنے کا حکم فرمایا تو اس سے تحقیق وتلاش لازم آئی یعنے جب تک کوئی شخص (ایسا نہ کرے گا کسی برائی کو دور نہ کرسکے گا اور کسی بھلائی کو نہ پہنچیگا - کیونکہ بلا تحقیق کسی بات کا مان لینا ایسا ہی ہے جیسے پانی پر لکیر کرنا اس طرح کسی بات کو قبول کر لینا دلی یقین نہین بخشتا - جب کسی بات کی سچائی کا یقین ہی نہ ہوا ور اُس مین شک رہے تو ایسا اعتقاد کیا منزلت رکھتا ہے کس طرح دیرپا رہ سکتا اور نہین کیونکر پکا کر سکتا ہے - جب یہ معلوم ہو گیا کہ جتنے مذاہب ہین آزمایش کے ذریعے ہین تو ہمپر فرض ہوا کہ جہان تک ہم سے ہو سکے ہر امر کی چھان بین کرین - اس کی بھلائی یا بُرائی کا حق الیقین حاصل کرین تاوقتیکہ اوس کا کامل یقین نہ ہو لے چین نہ لین بھلائی کو اختیار کرین اور بُرائی کو چھوڑ دین اور استبقوا الخیرات مین کسی طرح پیچھے نہ رہین - اس سے خود بخود آپس مین اتحاد پیدا ہو جائیگا - مین تو اچھی طرح یہ سمجھ بیٹھا ہون کہ سب سے اچھا مذہب و مشرب اللہ کی طلب ہے اور اللہ کی طلب کا اصلی مدعا وصال و دیدار الٰہی ہے اور یہ حاصل نہین ہو سکتا جب تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلام اللہ کی کامل پیروی نہ کیجائے تم ہمیشہ اپنا نقطۂ نظر و منتہائے خیال اور منزل مقصود محض اللہ کی ذات کو بنائے رہو - اور اسی کو مقصد اصلی جانو اور دل مین رکھو اور بدام ذکر الٰہی مین منہمک رہو اور تلاوت قرآن مجید مین (کما حق تلاوت) مصروف رہو، اس مین خوب غور کرتے رہو جو بات اچھی سمجھ مین نہ آئے اس کو بامداد احادیث وتفاسیر سمجھو بہ نہیم سمجھنے پر قادر نہون

تو کسی عالم سے مدد لو! اور اعتقادی عنادی جھگڑوں سے بالکل الگ رہو! انشاء اللہ المستعان تم کچھ سے کچھ ہو جاؤ گے اور کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے!!!

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اسلام اور تعلیمی مجالس

از نصیر الدین ہاشمی متعلم عثمانیہ میٹرک

قوم کے لیڈروں کا ایک طبقہ جنہوں نے محض انگریزی ہی کی تعلیم پائی ہے اپنی دانست میں قوم کی ترقی کو اس بات پر منحصر سمجھتا ہے کہ قوم یورپ کی شاہ راہ ترقی پر چلے کیونکہ ان کے دماغ جس تعلیم سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں اس سے یہی خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ایک طبقہ جس نے صرف عربی کی تعلیم حاصل کی ہے ظاہری طرز معاشرت پر نظر ڈال کر پہلی گروہ کا مخالف ہے اور پابندی مذہب کو باعث ترقی سمجھتا ہے۔ مگر وہ طبقہ جس نے دونوں پر غور کی نظر ڈالی ہے آسانی سمجھ سکتا ہے کہ دراصل دونوں میں منافات نہیں۔

پہلے گروہ کا خیال اس لئے مناسب ہے کہ حقیقت میں یورپ نے جو ترقی کی ہے وہ دراصل اسلام ہی کے اصول کی پابندی کی بدولت ہے۔ کیا

بلحاظ اصول تعلیم اور کیا بلحاظ اصول تمدن یورپ کی تمام ترقی اسلامی فیضان کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے اور یورپ کے بڑے بڑے مورخ اس امر کو تسلیم کر چکے ہیں۔

پس دوسری گروہ کی رائے بھی بالکل درست ہے۔ اگر تاریخ پر غور کیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی طریقہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اصول مجلس کی پابندی نے اہل یورپ کو مہذب اور متمدن بنایا۔ اگر وہ اسلامی اصول کی پابندی نہ کرتے تو ہرگز یہ ترقی حاصل نہ ہوتی۔

یورپ کی تاریخ پر جن لوگوں نے نظر ڈالی ہے وہ بآسانی اسکی تصدیق کر سکتے ہیں کہ یورپ کے علمی مدرسے اور علمی مجالس مسلمانوں ہی کے نقش قدم پر قائم ہوئے اور وہاں مجالس شوریٰ کا انعقاد قرانی تعلیم وشاورھم فی الامر کی بنا پر ہوا

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے کیا وہ اصول ہیں اور اسلام نے کیا نصب العین قرار دیا تھا کہ جس کی وجہ سے یہ عالمگیری ترقی حاصل کی میں نہایت زور کے ساتھ کہوں گا کہ اسلام کی ترقی کا راز اس کی سچائی کے بعد یہی مجلسی اصول ہے۔ اسلام نے اس اجتماعی اصول کیوجہ یا دوسرے الفاظ میں اتحاد و اتفاق کے سبب عالم میں یہ ترقی کی۔ ابتدائے اسلام پر نظر کیجیے تو یہ امر صاف روشن ہو گا کہ چند غریب غلاموں اور لڑکوں نے اس کی پیروی کی جن میں سے اکثر کو غذا تک برابر میسر نہ تھی تو پھر کس تلوار اور کس قوت کے زور سے اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلاتے دراصل اسلام کی صداقت کا ظہور اس کی اجتماعی اصول کی بدولت ہوا۔ یہ طریقہ اسلام میں ابتدا ہی سے ہے۔

عربوں میں نہایت قدیم زمانہ سے انجمنوں یا عربی الفاظ میں مجلسوں کا دستور تھا۔ اہل عرب شعر گوئی اور تبادلہ خیالات کے لئے مجلسیں منعقد کرتے تھے اس میں عام حالات پر بھی بحث کی جاتی تھی۔ ان مجلسوں کے مختلف نام ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض مقامات اور بازار ایسے تھے جہاں کسی خاص موسم میں لوگ جمع ہوتے تھے یہاں علاوہ خرید و فروخت کے اپنے قبیلے کی عظمت اور شرافت کا ذکر ہوتا اور قصیدے سناتے تھے۔ سوق عکاظ (بازار عکاظ) کا مجمع کل مجمعوں سے زیادہ مشہور تھا یہ طائف اور نخلہ کے درمیان ماہ ذیقعدہ کے غرہ سے قائم ہوتا تھا۔ اور بیس یوم تک میلا رہا کرتا تھا۔ اس بازار میں ہر دیار کے امرا اور رؤسا شریک ہوتے تھے اگر کسی کو ایسا کام کرنا ہوتا جو تمام عرب میں مشہور ہو جائے تو وہ اسی مقام پر کرتا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے ہر ایک کام شجاعت خونریزی شکار یہاں تک کہ کثرت مصائب پر بھی فخر کرتے اسی طرح علم و فضل حسب و نسب پر بھی دھوم دھام سے فخر کیا جاتا اور خوب قصائد پڑھے جاتے اور خطیب لکچر دیتے یہیں شخص کی لیاقت کا بھی امتحان ہو جاتا۔ جب قریش کسی قصیدے کو پسند کرتے اور اس کو تسلیم کر لیتے تو وہ خانہ کعبہ کے دروازہ میں لٹکایا جاتا۔ اس قسم کے قصیدے سات تھے جو سبع معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔

جس طرح عرب کے یہ میلے مشہور تھے اسی طرح ان کے خطبے (لکچر) بھی مشہور تھے۔ چونکہ اہل عرب آزاد منش اور پر جوش تھے۔ لہذا انکی طبیعتیں بھی پر جوش شاعرانہ جذبات میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اُن کے نفوس نہایت سریع الاحساس اور بہت جلد اثر کو قبول کرنے والے تھے

اس لئے فصیح و بلیغ بیان کا ان پر بے حد اثر پڑتا تھا۔ ان کے باہمی تنازعات
اور ایک دوسرے پر فخر کرنے کی وجہ سے خطابت کی ضرورت پڑی
اور نیز لڑائیوں کے لئے اعوان و انصار جمع کرنے کا اس سے بہتر
کوئی طریقہ نہیں تھا۔ عربوں کے خطباء کے نام تاریخوں میں مشہور ہیں
جس میں ساعدہ بڑا مشہور خطیب گذرا ہے۔ جاہلیت اور اسلام کی خطابت
میں یہ فرق تھا کہ اسلام نے اس میں حکمت کی باتیں اور قرآن کی فصیح و بلیغ
آیتیں اضافہ کردیں جس کی وجہ سے اس کی تاثیر ایک سے دہ چند ہوگئی
اہل اسلام نے خطابت کو نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا اس کی وجہ یہ تھی
کہ انہوں نے بہت سے ممالک فتح کئے تھے۔ ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی
تھیں۔ اس لئے ان کے خطبے پر جوش اور با اثر ہوتے تھے۔ جس کی نظیر
کسی دوسری گذشتہ قوم میں نہیں ملتی۔ یونانیوں اور اہل روما میں بھی بڑے
بڑے لکچرار اور اسپکر (خطیب) ہوئے مثلاً ڈیموستھنس سسرو وغیرہ دونوں
کے خطبوں کا مقابلہ کیا جائے تو عربوں کا پلہ بھاری رہے گا۔ اسلامی
خطبوں اور مقرروں نے ان کی خطابت کو پس پشت ڈال دیا۔ مکہ کا
دار الندوہ بھی مشہور ہے جہاں قریش بوقت مشورہ جمع ہوا کرتے تھے
آنحضرت کو مجلسی اصول نہایت محبوب تھا علاوہ اوقات بیرونی کے
اندرونی اوقات میں بھی آپ مجلس فراہم فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ امام حسینؓ نے اپنے باپ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے نبی کریم
کے اندرونی نظام الاوقات کے متعلق دریافت کیا۔ علیؓ نے بیان فرمایا
آپ کے اوقات اندرونی کے تین حصے تھے پہلے وقت میں خدا کی عبادت
فرماتے۔ دوسرے کو امور خانہ داری کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ اور تیسرے

حصہ میں پھر وہی مجلس فراہم ہوتی۔ اور خاص خاص باتیں طے ہوتیں تھی گویا خلوت میں جلوت تھی۔ علاوہ اس کے جب باہر تشریف فرما ہوتے تو وہی مجلس برپا ہوتی جو گویا علمی اور ادبی وغیرہ ہر قسم کے موضوع پر مشتمل ہوتی جس کی تفصیل شمائل ترمذی اور شفائے قاضی عیاض سے ظاہر ہوسکتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں شروع ہی سے دونوں قسم کی مجلسیں موجود تھیں ایک تو علمی و ادبی دوسری گویا سرکاری۔

خداوند پاک نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے وشاورھم فی الامر چنانچہ مختلف غزوات وغیرہ کے متعلق ابتداء مجلس مشاورت ہوتی تھی جب قرآن پاک ہی ہم کو مجلس اصول یا مشاورت کی تعلیم دیتا ہے تو پھر اس سے بہتر دلیل مجلسی اصول کے لئے ضرور نہیں۔

علمی مجلس حضرت عمرؓ نے قرآن جمع کرنے کا کام گویا ایک علمی مجلس کے ہی تفویض کیا تھا جس میں زید بن ثابت اور سعد بن عاص بڑے رکن تھے عمرؓ کے زمانے میں حضرت علیؓ عبداللہ بن مسعود و زید بن ثابت و عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی علمی مجلس تھی جس میں تمام اہم علمی امور تصفیہ پاتے تھے۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی مجلسی اصول کی جھلک نظر آتی ہے رشید اکثر مجلسیں منعقد کرتا تھا جس میں شعر شاعری اور اس کے لطائف پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ مامون ہر سہ شنبہ کو اپنی محل میں علمی انجمن فراہم کیا کرتا تھا جس میں طلبہ و مدرسین حاضر ہو کر علمی مباحث کیا کرتے تھے۔

یہ ہی نہیں بلکہ دور دور سے علما رطلب کئے جاتے اور ان سے علمی بحثیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ ۲۰۴ھ میں جب مامون بغداد پہنچا تو قاضی یحییٰ بن

الحکم کو حکم دیا کہ علما و فضلا میں سے بیس شخص انتخاب کئے جائیں جو علمی مجلسوں میں شریک ہوا کریں نیز امین بھیجکر ہر جگہ سے ادیب فقیہہ شاعر حکیم وغیرہ طلب کئے اور معقول تنخواہیں مقرر کیں۔

معتصم متوکل کے زمانہ میں بھی علمی انجمنیں ہوا کرتی تھیں واثق باللہ بھی جو اپنے حرکات و سکنات میں مامون کے مشابہ تھا اسی طرح فقہا اور متکلمین کے مباحثہ کے لئے مجلسیں منعقد کرتا۔

بنی عباس کے زمانہ میں خلفاء کے علاوہ شاہزادے امرا بھی علمی انجمن میں دلچسپی لیتے تھے اور خود بھی مناظرہ کی مجلس منعقد کراتے تھے۔ چنانچہ ہارون رشید کے زمانہ میں زنبور اور نحلہ کی بحث مشہور ہے۔ جو امین رشید نے کسائی اور سیبویہ میں کرائی تھی۔

فتح بن خاقان وغیرہ دیگر امرا کی علمی مجالس کا تاریخ میں داخلہ موجود ہے بغداد کی مجلس اخوان الصفا مشہور ہے۔ جو چوتھی صدی ہجری کے وسط میں قائم ہوئی تھی جس کے پانچ ممبر مشہور ہیں۔ ابو سلیمان محمد بن جعفر معروف بہ مقدسی۔ علی بن ہارون۔ ابو احمد عوفی اور زید بن رفاعہ۔ یہ ایک مخفی انجمن تھی جس میں فلسفہ کی مختلف بحثیں ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی فلسفی معلومات کو پانچ رسالوں میں جمع کیا اور اس کا نام رسائل اخوان الصفار کھا تھا۔ ان کو تصنیف ہوکر جب نصف صدی کا زمانہ گذر گیا تو عمر بن عبدالرحمن نے اندلس لے گیا اور وہاں کھلم کھلا لوگوں نے ان کی تعلیم شروع کی۔ اندلس میں علمی مباحث و مناظرہ کے لئے الحکم کا زمانہ اسی طرح مشہور ہے جس طرح بغداد میں مامون کا۔ اندلس میں علمی مجالس بھی تھے جس کے نمونہ پر یورپ میں علمی مجلسوں کا قیام ہوا۔

الغرض علمی شوق تمام مسلمانوں میں بے حد تھا محلسرا کے قصر امرا کے محلات مدرسے مساجد اہل علم سے بھرے پڑے تھے۔ مناظرہ کے مجالس منعقد ہوتے تھے اور شعرا و ادبائ کے جلسے ہوا کرتے تھے۔

آج کل یورپ میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی علمی کاروبار میں حصہ لیتی ہیں۔ یہ بھی گویا اسلام کے اثر کی تقلید ہے۔ اسلام کے شروع زمانہ ہی سے مستورات بھی علمی کاروبار میں حصہ لیا کرتی تھیں چنانچہ بی بی عائشہ صدیقہؓ کا کمال علم و فضل مشہور ہے اور ان سے بہت سے نامور صحابہ تابعین نے روایت کی ہے گویا ان کا مکان ایک علمی انجمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں مجلس علم جاری ہوتی تھی بہرحال اسلام کے شروع زمانہ ہی سے اس میں مجلسی اصول کا رواج رہا ہے۔ اور اس طرح جو چیز یورپ کی ترقی کا باعث ہے وہ خود اسلام ہی سے اخذ کی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے اس اصول ترقی سے غفلت کی جس کا نتیجہ یہ روز بد ہوا۔ برخلاف اس کے یورپ نے اسلام کے اس اصول اجتماعی کی تقلید کی اور اس کا نتیجہ اس کی ترقی ہے۔ پس اگر ہم اپنی علمی ترقی بھی چاہتے ہیں تو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ مجلسی اصول کو نہایت مضبوط طریقہ سے اپنے تمام کاروبار کا محور بنائیں جس سے ہمیں دین و دنیا دونوں میں صحیح اور اصلی ترقی مل سکتی ہے۔ والسلام

پیٹر اعظم

محمد احمد رضا عثمانی متعلم عثمانیہ میٹرک

تقریباً دو سو پچاس برس گذرے کہ روس کا ایک ہونہار نوعمر اور شریف الخاندان لڑکا پیٹر اعظم نامی اورنگ حکومت روس پر جلوہ فرما ہوا۔ اس شہنشاہ کی سلطنت اس قدر وسیع تھی کہ اس کی جنوبی حد بحر اسود تھی اور شمالی بحر سفید۔ اس وسیع میدان میں بزمانۂ موسم سرما برف باری شدت سے ہوتی ہے اس قدر شدید کہ بڑی بڑی ندیاں جو اسے سیراب کرتی ہیں اور جھیلیں برف سے پوشیدہ ہوجاتی ہیں۔ پیٹر بوقت تاج پوشی بہت کم عمر تھا یعنی صرف دس برس کا تھا۔ اور سترہ سال کی عمر میں اس نے عنان سلطنت خود اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ پیٹر گو سخت مزاج اور ظالم تھا مگر اس کے ساتھ وہ ہمیشہ مشغول بکار رہا کرتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے فوج کی اصلاح کی۔ گذشتہ عہد میں فوج کو غذا کم مقدار میں ملا کرتی تھی اور فوج قواعد فوجی سے بھی ناواقف تھی۔ پیٹر خود بھی فوج میں داخل ہوگیا اور سپاہیوں کی طرح خود بھی کام کرنے لگا۔ اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر سپاہیوں میں ایک جوش پیدا ہوگیا اور وہ اپنے فرائض منصبی کو اس قدر عمدگی سے انجام دینے لگے کہ ان کی فوج ایک قلیل عرصہ میں یورپ کی دوسری قوموں کی فوجوں کے برابر طاقتور ہوگئی۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ پیٹر ہمیشہ مشغول بکار رہا کرتا تھا۔ ایک روز جبکہ وہ اشیاء سرکاری کا معائنہ کررہا تھا اسے ایک پرانا اور ٹوٹا ہوا جہاز ردی اشیاء میں پڑا ہوا ملا اس نے

اُسے باہر نکلوایا اور اُس کے حالات دریافت کرنا شروع کئے۔ بعد دریافت حالات تجسس واقعات اُسے معلوم ہوا کہ اُس جہاز کو اُس کے والد نے انگریزی کاریگروں سے اس غرض سے بنوایا تھا کہ روسیوں کو جہازرانی کا کام سکھلا مگر اس نے اس معاملہ میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ لی۔ پیٹر نے اس جہاز کی مرمت کی اور وہ چونکہ ہر چیز کے جاننے اور سیکھنے کا شوقین تھا اِس لئے اُس نے جہاز میں معمولی ملاح کے درجہ سے کام کرنا شروع کیا اور درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے کپتان کے درجہ تک پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں روس میں کوئی جنگی جہازی بیڑہ نہ تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ ان کے ملک کے شمال وجنوب میں بڑے بڑے سمندر ہوں اور یورپ کا سب سے بڑا دریا والگا اُن کے ملک میں ہوکر بہتا ہو اور یورپ کے اکثر اقوام مثلاً پرتگال۔ ہسپانیہ۔ ہالینڈ اور انگریزوں کے یہاں جہازوں کے بڑے بڑے بیڑے ہوں جو امریکہ چین اور ہندوستان جایا کرتے ہوں روس میں جو کہ یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا (اور ہے) جہازوں کے بیڑے کا نہ ہونا نہایت قابل افسوس تھا۔ نوجوان زار جب مذکورہ بالا باتوں کا خیال کرتا تو اس پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہوجاتا تھا اور وہ اپنے ملک سے اس عیب کو دور کرنے کی تدبیر سوچنے لگتا تھا۔ آخر کار بعد غور وخوض اُس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ وہ خود جہاز بنانے کا فن سیکھے گا اور اپنے لوگوں کو سکھلائیگا۔ اس غرض کو پوری کرنے کے لئے وہ مع اپنے چند دوستوں کے مغرب کی طرف روانہ ہوا اور ہالینڈ پہنچا جہاں کہ ایک جہاز بنانے کے کارخانے میں وہ بطور مزدور کے بڑھئی کا کام کرتا۔ مزدوروں کی پوشاک پہنتا۔ مزدوروں کا سا موٹا جھوٹا اناج کھاتا اور اسی طرح کے جھونپڑوں میں رہتا اس کارخانے میں لکڑی کا ایک بڑا جہاز بن رہا تھا اس نے اسے روس کیواسطے خرید لیا اور وہ اس بات پر

فخر کرتا تھا کہ اُس جہاز میں کچھ کام اُس کے ہاتھوں کا بنا ہوا بھی ہے۔ بعدہٗ وہ لندن کو گیا اور وہاں اس کا یہ کام رہا کہ وہاں کی ہر چیز کو وہ بغور وخوض دیکھتا اور پارلیمنٹ میں جا کر بیٹھتا اور اراکین کی تقریروں کو نہایت غور سے سنتا تھا۔ اہالیان انگلستان کی ایسی تقریروں کے سننے میں جس میں کہ وہ یورپ امریکہ انگلستان اور ہندوستان میں انگریزوں کے صنعتی کارناموں کا ذکر کرتے تھے اُسے خاص دلچسپی تھی ان تقریروں نے اُسے اس بات پر اُبھارا کہ وہ بھی صنعت وحرفت سیکھے اور اپنے ملک میں جا کر ایسے کارخانے کھولے جو اس کے ملک کی آئندہ ترقی وبہبودی کا باعث ہوں اسی شوق نے اُسے کاغذ اور رسّی بنانے اور لکڑی چیرنے کا کام بہت جلد سکھلا دیا اور لندن سے چلتے چلتے وہ گھڑی بنانے کے فن میں بھی طاق ہو گیا تھا۔ بزمانۂ قیام انگلستان وہ چھاپہ خانوں میں یہ دیکھنے جایا کرتا تھا کہ کتابیں کیسے چھاپی جاتی ہیں۔ کوئی چیز اس کے علم کی پیاس نہیں بجھا سکتی تھی اس لئے انگلستان میں ایسا ہی کیا جیسا کہ ہالینڈ میں کیا تھا وہ انگریزی مزدوروں کے ساتھ جہاز بنانے کے کارخانوں میں کام کرتا تھا۔ اکثر وہ ایک سنسان کمرہ میں تنہا بیٹھ جاتا تھا اور مثل ایک طفل مکتب کے لکھا اور پڑھا کرتا۔ اُس نے علم ہندسہ اور علم جہاز رانی سیکھا۔ اور اس کو انسان کی ہڈیوں اور پٹھوں کے علم یعنی علم تشریح کے سیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اس کے بعد وہ روس واپس آیا اور یہاں پہنچ کر بھی وہ ایک سیدھا رہتا تھا۔ گویا وہ بادشاہ اور مزدور دونوں ہے۔ اس کے حکم سے کشتیاں اور جہازوں کے چلنے کے لئے تمام ملک میں نہریں کھدوائی گئیں بعض اوقات وہ خود اپنے پھاوڑے سے زمین کھودا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ دیہاتی سڑک سے گاڑی پر سوار ہو کر جاتا تو اُتر پڑتا اور کھیت میں کسانوں سے جا کر

باتیں کرتا یا وہ اُن کے جھونپڑوں میں اس کے دیکھنے کے لیے کہ وہ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں گھس جاتا۔ وہ اپنی راہ سے میلوں دور کسی ایسی جگہ کو دیکھنے کے خیال سے چلا جاتا۔ جہاں کہ قدیم زمانے میں کوئی مقدس شخص رہا ہو۔ جو لوگوں سے واعظ کیا کرتا ہو۔ یا جہاں قدیم زمانے میں کسی مشہور شجاع نے کوئی بڑا بھاری کام کیا ہو۔ وہ اپنے محل میں پرانا نیلا کوٹ پہنے ہوئے ایک آرام کرسی پر بیٹھا کرتا۔ اور اگر اُس کے پرانے دوستوں میں کوئی انگریزی یا ڈچ ملاح جس کے ساتھ اُس نے جہاز بنانے کے کارخانے میں کام کیا تھا اُس سے ملنے آتا تو زار اپنا حقہ پیتے ہوئے اس سے جہازوں کے بارے میں بات چیت کیا کرتا۔ بڑے بڑے جہاز جن پر روسی جھنڈے لہراتے تھے اب سمندر میں چلتے دکھائی دیتے تھے۔ پیٹر کے پاس ایک طرف سوڈان کے باشندوں سے اور دوسری طرف فارس سے جنگ کرنے کے لئے کثیر فوج تھی۔ اس نے کتبخانے قائم کئے تھے دور دراز ملکوں سے لائی ہوئی عجیب وغریب چیزوں کے رکھنے کے لئے عجائب خانے تعمیر کرائے تھے اور تصویر خانہ بنوائے تھے جن میں تصویریں اور بت رکھے گئے۔ کتابیں چھاپنے کے لئے چھاپے خانے جاری کرائے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ اب سے عورتیں مکانوں میں بند نہ رکھی جائیں۔ بلکہ اُن کو باہر نکلنا چاہئے اور زار سے مردوں کیساتھ ملاقات کرنے آنا چاہئے۔

معزز بھائی مسلمانوں۔ میں ایک پیٹر کی اُن تمام دلیرانہ کارروائیوں کا ذکر کرتا آیا ہوں۔ جن کی تقلید ہم کو فائدہ پہنچا سکتی ہے لیکن میں اس کی اس آخری الذکر تدبیر کا سخت مخالف ہوں اور پر زور الفاظ

میں کہتا ہوں کہ کسی مسلمان کو اس کی پیروی نہ کرنی چاہئے کیونکہ پردہ اسلام کا ایک خاص رکن ہے اور اس کو شارع اسلام نے ہم پر تاکیداً لازم کیا ہے اور جس طرح شراب کی حرمت کے وجوہات پر مفصل بحث ہو سکتی ہے اور اسی طرح پردہ کے لازمی ہونے میں کبھی کوئی شک نہیں۔ پیٹر نے یہ پتہ لگانے کے لئے ہر ایک ملک میں کیا کام کس طرح انجام پاتا ہے لوگوں کو مختلف ممالک کو بھیجا۔ انہوں نے مشرق میں چین تک دور دراز سفر کئے اس کے بعد پیٹر کے دل میں مغرب کے سفر کے خیالات پھر موجزن ہونے لگے اور اسی بنا پر وہ پھر راہی مغرب ہوا۔ اس سے بیس سال قبل بھی وہ مغرب کی طرف کا سفر کر چکا تھا۔ ہالینڈ پہنچکر اُس نے اُس مکان کو پھر دیکھا جس میں وہ پہلے رہ چکا تھا۔ اور جو اب شہزادے کے مکان سے موسوم تھا۔ ہالینڈ سے زار کے اسپ سفر نے فرانس کی راہ لی۔ زمانہ قدیم میں روس کا دارالخلافہ ماسکو تھا۔ جو ملک کے وسط میں سمندر سے بہت دور واقع تھا اور جہاز وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس وجہ سے یہ شہر کبھی بڑا تجارتی شہر نہ رہا تھا نہ ہو سکتا تھا۔ زار کو یہ بخوبی معلوم ہو گیا اور اس نے کہا کہ مجھ کو یورپ کے دیکھنے کے لئے ایک کھڑکی کی ضرورت ہے اور اُس نے سمندر کے کنارے ایک نیا شہر تعمیر کرانے کا پکا ارادہ کر لیا جو کہ ایک بڑا بندرگاہ اور دارالخلافہ بھی ہو۔ بحر بالٹک کے ساحل کے قریب چھوٹے دریا نیوا کی دھار سے بنا ہوا ایک بڑا دلدل تھا۔ جو جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور چند ماہی گیر وہاں بستے تھے جن کی گزر اوقات کا ذریعہ مچھلیاں تھیں۔ یہاں پر پیٹر نے لکڑی کا ایک چھوٹا جھونپڑا بنوایا جس میں وہ نئے شہر کی تعمیر کی نگرانی کرنے کو رہا کرتا تھا

وہ جھونپڑا اب تک موجود ہے۔ کیونکہ یادگار ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی حفاظت و نگرانی کی گئی ہے۔ اس شہر کا نام پیٹر وگریڈ یعنی پیٹر کا شہر ہے۔ دلدل کو بھرنے میں بے انتہا مٹی صرف ہوئی۔ اور کثیر تعداد آدمی اس بڑے کام پر پانی کیچڑ میں کام کرتے تھے۔ اور بہت لوگ کام کرتے کرتے راہی ملک عدم ہو گئے۔ ایک سال میں اس جگہ پر جہاں کہ پہلے دلدل اور جنگل تھا۔ زار کی حسن تدبیر اور لوگوں کی جانفشانی کے سبب سے تقریباً تیس ہزار مکان تیار ہو گئے۔ اللہ اللہ کیا شان کبریائی ہے کہ اس خالق کون و مکاں و مالک زمین و آسمان نے ایک خاک کے پتلے کو وہ قوت عطا فرمائی ہے کہ اگر چاہے تو بڑے بھاری جنگل کو دم کے دم میں ایک عظیم الشان شہر بنا دے۔ مگر معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے گناہوں اور بداعتقادیوں کا جنگل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اور ہم لوگ اس کو صاف کرکے ایک عظیم الشان شہر بنانے کی فکر نہیں کرتے مجھے خدا سے توی امید ہے کہ ہماری یہ گردش کا زمانہ عنقریب ختم ہونیوالا ہے کیونکہ جس طرح ہر شام کیساتھ صبح لازمی ہے اسی طرح ہر زوال کیساتھ اوج بھی ضروری ہے چنانچہ ہمارا ایک پرزور شاعر صفی بھی یہی کہتا ہے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

زار کبھی کسی کام سے اکتاتا نہ تھا لیکن اس کے اخیر زمانے میں غیظ و غضب نے اس پر اختیار پا لیا تھا چنانچہ یہ واقعہ اس کی تصدیق کرتا ہے "جب جون سال کی عمر میں وہ بیمار ہوا اس نے غصہ میں آکر ڈاکٹروں کو مار اٹھا زار اپنے بستر مرض سے اٹھ کر سمندر میں ایک نئے جہاز کے چھوڑے جانے

جانے کی رسم دیکھنے کے لئے گیا اور وہاں سے وہ ایک نئی نہر دیکھنے کو گیا اور پھر لوہے کے کارخانہ کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلا آیا اور اس کا مرض ترقی کر گیا۔ مگر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ایک روز اس نے ایک کشتی کو خطرے میں دیکھا جس میں کہ کئی آدمی ڈوب رہے تھے یہ دیکھ کر زار سے نہ رہا گیا۔ وہ ان کی مدد کو دوڑا اور کشتی کو ہٹا کر کنارے تک لانے میں اُسے کمر برابر پانی میں اترنا پڑا۔ اور اُسی نے اُس کے مرض کو بیحد بڑھا دیا۔ افسوس ہے کہ ۱۷۲۵ء میں روس کے مایہ ناز اور قابل فخر زار پیٹر اعظم نے ملک بقا کا سفر اختیار کیا۔ فقط

سر رشتہ صنعت و حرفت سرکار عالی

" اجلاس حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس (انجمن ترقی تعلیم) منعقدہ ۱۳۲۴ف میں سرکار عالی کی توجہ تقرر ناظم مصنوعات کی جانب مبذول کرائی گئی تھی پھر اس تحریک کی تجدید اجلاس کانفرنس منعقدہ ۱۳۲۵ف میں کی گئی۔ انجمن ثمرۃ الادب نے ۱۳۲۵ف میں ایک علمی جلسہ منعقد کیا تھا جس میں مقررین نے استدعا کی تھی کہ حیدرآباد میں سر رشتہ صنعت و حرفت قائم کیا جائے جو ایک عرصہ قبل حیدرآباد میں قائم اور بعد میں تخفیف کر دیا گیا تھا۔ سرکار عالی نے مکرر یہ سر رشتہ قائم کیا ہے۔ اخبارات میں متعدد مرتبہ اس امر کی تحریک کی گئی کہ اس سر رشتہ کے حالات عام طور پر شایع کئے جائیں۔ ثمرۃ الادب نے بطور خاص اس سر رشتہ

کے متعلق نوٹ مرتبہ جی۔ ٹی سی وکیفیلڈ صاحب سابق صدر ناظم مال و حال صدر ناظم سررشتہ صنعت و حرفت زراعت و آبکاری حاصل کئے جو زبان انگریزی سنہ ۱۹۱۹ء میں شایع ہوئے ہیں۔ اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ امید کہ ناظرین دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں گے۔"

گلہوہ ہماری تحقیقات گلہوہ سے شروع ہوتی ہے جس سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں شراب نکالی جاتی ہے۔ سررشتہ جات مال کا جائزہ لیتے ہی مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ بجائے تیس لاکھ روپیہ سے زیادہ کی شکر سالانہ ملک میں درآمد کرنے کے یہ ممکن ہے کہ ہم خود ان پھولوں سے شکر بنا سکیں۔ جی۔ سی میک ایون صاحب بی۔ ایس۔ سی (جو اس وقت نظام کالج کے پروفیسر سائنس تھے) کی مدد سے یہ معلوم ہوا کہ ان پھولوں میں شکر کی کثیر مقدار موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان میں اسٹک ایسڈ (Acetic acid) اور کچھ مقدار اسٹیون (Aceton) ہے جو کہ کارڈائٹ ([illegible]) کے خاص اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ بہ نسبت لکڑی کے مہوہ سے دہ چند زیادہ اسٹیون (Aceton) نکالا جا سکتا ہے۔ اس تحقیق سے پہلے تک لکڑی ہی اسٹینون (Acetone) کا منبع رہی ہے۔

مہوہ کے جھاڑ عموماً ممالک محروسہ سرکار عالی کے کھیتوں اور جنگلوں میں عموماً۔ اضلاع نظام آباد۔ میدک اور آصف آباد میں خصوصاً موجود ہیں موسم گرما میں جھاڑ سے پھول جھڑتے ہیں۔ جن کو جمع کر کے خشک کیا جاتا ہے۔ خشک ہونے کے بعد اس کی شکل منقہ کے جیسی ہو جاتی ہے۔ اب تک اس سے صرف شراب بنائی جاتی ہے۔ ہم سالانہ پچیس ہزار ٹن گلہوہ جمع

کرتے ہیں جس میں سے دس ہزار ٹن گلمہوہ کی شراب بنائی گئی۔ بقیہ پندرہ ہزار ٹن گلمہوہ اس وقت بازار میں بے کار ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کو کام میں لائیں۔ گلمہوہ کی اس بجیت سے شکر بنانا موٹر اسپرٹ اور دوسری قیمتی چیزیں تیار کرنا ممکن ہوگا۔ ہم کچھ عرصہ تک ایسی اسپرٹ سے جو گلمہوہ سے تیار کی گئی تھی پٹرول کی آدھی قیمت پر کامیابی سے موٹر کار دوڑا چکے ہیں ڈاکٹر گلبرٹ۔ جے فولر پروفیسر انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے ورود حیدرآباد کے وقت موٹر کار جو انہیں لیجاتی رہی اسی اسپرٹ پر دوڑتی تھی اس انقلاب پیدا کرنے والی کامیابی کے طرف توجہ کرونگا جس سے ریلوے پانی کے نل، موٹر کار اور فی الحقیقت ہر ایک طاقت اور کل کے موجودہ اخراجات میں معتد بہ کمی ہوتی ہے حیدرآباد اور سکندرآباد میں پٹرول کی موجودہ سالانہ کھپت ایک لاکھ گیالن کے قریب ہے۔ اور اس قدر پٹرول تیار کرنے کے لئے ہم کو صرف پندرہ سو ٹن گلمہوہ کی ضرورت ہوگی۔

مجھے ناسازی مزاج کے باعث سپٹمبر ۱۹۱۵ء میں رخصت لیکر انگلستان جانا پڑا اور وہاں مجھے حیدرآباد دکن کی خام پیداوار کے استعمال و صنعت کی تحقیقات کا موقع ملا جس سے میں اس بڑی ریاست کی صنعتی ترقی میں مشورہ دینے کے قابل ہوا۔

تخم مہوہ | اس جھاڑ کا صرف پھول ہی نہیں بلکہ بیج بھی قیمتی ہے۔ جنگ چھڑنے سے پہلے ممالک محروسہ سرکار عالی سے اس کی برآمد پچاس ہزار من سے زیادہ تھی۔ مجھے انگلستان میں تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس بیج سے جو تیل نکالا جاتا ہے اس کی بہت مانگ ہے کیونکہ یہ بنسبت دوسرے نباتاتی

تیل کے اس میں پگلنے کا درجہ بڑھا ہوا ہے اس لئے مختلف قسم کے تیل کے قوام کو گاڑھا کرنے میں کام آتا ہے۔ میں نے اس کو مارگرین کی صنعت میں (جو ممالک یورپ میں مسکے کا ایک سستا اور سادہ قائم مقام ہے) بنولہ کے تیل کے ساتھ مستعمل ہوتے ہوئے پایا۔ میں نے لندن میں تھوڑا سا اصلی مسکہ خرید کر اس کا گھی بنایا اور اس کو ایک مارگرین کے کارخانہ میں لے گیا۔ اس کو دیکھ کر اہل کارخانہ نے مجھے بنولہ اور تخم مہوہ سے ایک مرکب بنا دیا جو بالکل گھی کے مشابہ تھا اور قیمت میں نصف کی کمی تھی۔

تخم روغن دار | اچھے ہنگام میں سالانہ حسب ذیل قیمت کے تخم روغن دار کی برآمد ممالک محروسہ سرکار عالی سے ہوئی۔

تخم ارنڈ	$\frac{1}{2}$ کروڑ روپیہ۔ السی $\frac{1}{4}$ کروڑ روپیہ۔
بنولہ	۹۰ لاکھ روپیہ۔ ولایتی مونگ ۲۸ لاکھ روپیہ۔
تخم مہوہ	ایک لاکھ۔

ہم اولاً تیل کے بجائے تخم کی برآمد سے قیمت کھو دیتے ہیں کیونکہ تخم کی برآمد سے حمل و نقل کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اگر تیل یہاں ہی نکالا جاتا تو کھلی یہاں ہی رہ جاتی اور تیل کی باربرداری کا خرچ بہت کم ہوتا۔

(۲) اگر تیل یہاں نکالا جاتا تو ہم محنت کا فائدہ نہ کھوتے جو ہمارے ہی لوگوں کو ملتا۔

(۳) ہم خود تیل کھو دیئے جو ہمارے لئے بہت نفع بخش ہے اور بوجہ جہالت ہم اس سے فائدہ حاصل نہیں کئے۔

(۴) ہم تخم ارنڈ کے برآمد کی صورت میں ایسی کھلی کھو دیتے ہیں جو نہایت

قیمتی کھاد ہے۔ السی بنولہ اور ولایتی مونگ کے برآمد کی وجہ سے ایسی کھلی کھو دیتے ہیں جو جانوروں کی بہت قیمتی غذا ہے۔

السی بنولہ، ولایتی مونگ اور مہوہ کے تیل اگر عمدگی سے تیار کیے جائیں تو نہ صرف کھانے کے قابل ہیں بلکہ صابون، موم بتی، گلسرین اور بہت سی دوسری قیمتی چیزیں ان سے بنائی جاسکتی ہیں۔ میں نے فرانس میں بمقام مارسلز ممالک محروسہ کی ولایتی مونگ کو روغن زیتون اور مارسلز کے مشہور سفید صابون میں مستعمل ہوتے ہوئے دیکھا۔

روئی | ۱۳۳۳ف میں ممالک محروسہ سرکار عالی سے سات کروڑ روپیہ سے زیادہ قیمت کی روئی برآمد ہوئی۔ اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں دو کروڑ تمیئیس لاکھ اڑتیس ہزار روپیہ کا کپڑا درآمد کیا گیا۔ ریاست دکن میں کپڑا بننے کی صرف تین گرنیاں جسین ساگر، گلبرگہ شریف اور اورنگ آباد میں واقع ہیں۔ یہاں غالباً اور بہت سی گرنیوں کی گنجائش ہے۔

کاغذ | ممالک محروسہ سرکار عالی میں سالانہ ۴۳۹۰۰۰ روپیہ کا کاغذ درآمد کیا جاتا ہے۔ وہ مادہ جو ہمارے پاس ہے کام میں نہیں لایا جاتا جس سے اچھا کاغذ بن سکتا ہے۔ میں انگلستان میں کاغذ کے کارخانوں کو دیکھا جس میں لکڑی کا وہ گودا استعمال کیا جاتا ہے جو ناروے اور سویڈن سے لایا جاتا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں لکڑی کے گودے کی ساخت کے لیے روئی کے جھاڑ کے ڈنٹھل قیمتی مادہ رکھتے ہیں۔ یہ ڈنٹھل جو سالانہ کئی ہزار ٹن جمع ہوسکیں گے ایندھن کی طرح یہ جلا دیئے جاتے ہیں یا زمین میں جوت دیئے جاتے ہیں۔

نمک میں نے ضلع رائچور میں تنقیح کے موقع پر دیکھا کہ ملکی ساخت کا نمک بازار میں ۲۷ سیر فی روپیہ کے حساب سے بیچا جاتا ہے اور بمبئی کا دریائی نمک روپیہ کو ۱۲ سیر فروخت ہوتا ہے ملکی نمک صاف طور پر مصنوع نہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر کڑوا تھا۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں سالانہ اڑتیس لاکھ کا نمک درآمد کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ضلع رائچور کی کھاری باولیوں سے مناسب طریقوں کے ساتھ ویسا ہی نمک پیدا کر سکتے ہیں جیسا کہ اسوقت دوسرے مقامات بیرون ملک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس بارہ میں تجربے ہو رہے ہیں۔

اون اور بال ممالک محروسہ سرکار عالی سے بھیڑ کی اون اور بکرے کے بال کثیر مقدار میں سالانہ برآمد کی جاتی ہے۔ ان قیمتی اشیاء سے قابل فروخت سامان کی صنعت کے لئے اب تک عمدہ باضابطہ کارخانہ نہیں ہے۔

نباتی ریشہ انگلستان اور ممالک یورپ میں لکڑی اور دوسرے ریشہ سے ایک کیمیائی چیز کی مدد سے جس کا نام گلیشل اسٹیٹ (Glacial acetate) ہے مصنوعی ریشم عموماً بنایا جاتا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں لکڑی اور ریشہ دار پودوں کی کثیر مقدار موجود ہے جس میں روئی کے ڈنٹھل بھی شریک ہیں۔ اور ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر نے ہم سے کہا ہے کہ گلیشل اسٹیٹ (Glacial acetate) گلمہوہ سے نکالا جا سکتا ہے۔

انگریزی کیالکو چھاپنا ممالک محروسہ سرکار عالی میں کئی قیمتی رنگ ہوتے ہیں جیسے نیل، ساف فلوئر (Safflower) پلاس کے پھول۔ مگر مقامی استعمال اور برآمد کے لئے رنگ سازی کا کوئی کارخانہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں نہیں ہے

دباغت | ممالک محروسہ سرکار عالی میں سالانہ [illegible] روپیہ کی مالیت کا خام چمڑا برآمد کیا جاتا ہے۔ ہمارے خاص فوجی ساز و سامان بوٹ، شوز اور دوسرے جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں دباغت کے کارخانے رکھنے کی ضرورت ہے۔ جن چیزوں کی ہمیں ضرورت نہ ہو انہیں برآمد کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ ترڈور کی کثیر مقدار ممالک محروسہ سرکار عالی میں موجود ہے جو دباغت کی نہایت قیمتی چیز ہے۔ اسکی استعمال اور برآمد کے لئے اس پودہ سے ٹیانن (Tannin) نکالنا بھی ایک صنعت مہیا کریگا۔

خون | صرف شہر حیدرآباد میں ہی ہر سال ہزاروں جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور خون کی اس کثیر مقدار سے فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا جس سے غذا اور صنعتی اغراض کے لئے البومن (Albumen) سائناڈ آف پوٹاسیم (Cyanide of Potassium) اور ٹیانن کے نچوڑ میں ڈکلرائزر (Decoloriser) نکالے جا سکتے ہیں۔

سینگ | سینگ سے دوسری چیزوں کی صنعت جیسے کاغذگیر، چمچہ، کنگھی ترازو کے پلڑے، جوتے کے چمچے، قلم کے قبضہ وغیرہ نسبتاً آسان ہے تاہم اس کا کوئی کارخانہ نہیں ہے۔

ہڈی | ممالک محروسہ سرکار عالی سے سالانہ ۱۲۰۰۰ ٹن کی ہڈی باہر روانہ کی جاتی ہے۔ ہڈی جب پیسی جائے تو وہ نہ صرف قیمتی کھاد ہے بلکہ چاقو کے دستے، گنڈیاں اور دوسرے متعدد اشیاء تجارتی کی صنعت کے لئے ایک قیمتی چیز ہے۔

کھر | جہاں تک مجھ کو علم ہے کھر جمع نہیں کئے جاتے۔ سائناڈ آف پوٹاسیم

( ) گنڈیاں۔ چاقو کے دستہ اور سریش کی صنعت کے لئے کھر قیمتی مادہ ہے۔

آنت | مذبوح اور مردہ جانوروں کی آنتوں سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا۔ آلات موسیقی، روئی کاتنے والوں کی کمان، کھیل کے لوازم جیسے ٹینس، بیاڈ منٹن اور راکٹ بیاٹ اور کلوں کے لئے کمرپٹہ ان سب کے لئے ہر ایک جانور کی آنت بہت مضبوط سُتلی کا کام دیسکتی ہے۔ جانور جتنا دبلا ہوگا اس کی آنت اتنی ہی مضبوط ہوگی۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے جانور دنیا میں بہترین آنت مہیا کرسکیں گے۔

سریش | چمڑے کی کترن سیلے کا چمڑے۔ ہڈی۔ پٹھے۔ پرانے جوتے اور سینگ وغیرہ سے سریش تیار ہوتی ہے۔

پر | مرغ اور دوسرے پالو پرندوں کے پر بہت قیمتی ہوتے ہیں مگر یہ جمع نہیں کئے جاتے۔

لاک | ممالک محروسہ سرکار عالی میں بہت ہی تھوڑی مقدار میں لاک بنائی جاتی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ اس صنعت کو ترقی دیں ممالک محروسہ سرکار عالی کے جنگلوں میں اس قسم کے جھاڑ ہیں جس سے لاک کے کیڑوں کی نشو و نما ہوسکتی ہے۔ گلہوہ میں الکحل کا نا محدود ذخیرہ ہے جو لاک کیساتھ ہر قسم کا وارنش مقامی استعمال اور برآمد کے لئے تیار کرسکتا ہے۔ (م ربانی وارد)

معذرت | مرض انفلوئنزا کے باعث جسمیں نہ صرف اڈیٹر صاحب بلکہ منیجر اور کارکنان مطبع بھی مبتلا ہوگئے تھے۔ رسالہ کی اشاعت میں دیر ہوگئی تھی۔ امید کہ ناظرین معاف فرمائیں گے۔ فقط

(مینیجر)

ثمرۃ الادب

شعبۂ صنعت و حرفت سرکار عالی

(گذشتہ سے پیوستہ)

شکر | جیسا کہ آگے بیان کیا گیا ممالک محروسہ سرکار عالی میں سالانہ [illegible] روپیہ کے قریب شکر درآمد کی جاتی ہے اور ہم اپنی ضرورتوں کو نیشکر، مہوہ اور تاڑ کے رس سے شکر بنا کر پوری نہیں کرتے ضلع رائچور میں لاکھوں تاڑ کے جھاڑ ہیں جو تاڑی کے لئے تاسے نہیں جاتے کیونکہ لوگ تاڑی پینے کے عادی نہیں ہیں۔ ان جھاڑوں سے شکر کی بڑی مقدار نکالی جاسکتی ہے جیسا کہ مدراس میں نکالی گئی۔

کانچ | ممالک محروسہ سرکار عالی میں کانچ کا پورا سامان درآمد کیا جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں کانچ بنائی جاسکتی ہے۔ الکلی، ریت اور کوارٹز (   ) اس کے اجزا ہیں۔ ریت اور کوارٹز (   ) یقیناً ممالک محروسہ سرکار عالی میں موجود ہے اور الکلی رائچور کی کھاری بادلیوں سے شاید حاصل ہو سکے۔ بہر حال تحقیقات

کی ضرورت ہے۔

تمباکو | ممالک محروسہ سرکار عالی میں نفیس تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ یہیں ہم الحمدللہ کھا
کا نہایت خصوصیت کے ساتھ سگریٹ کی شکل میں درآمد کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے
پرگنہ میں بمقام بنگلور ہندوستانی تمباکو سے جو سگریٹ بنائے جاتے ہیں وہ ہمارے
تمباکو سے بہتر نہیں ہوتا۔

فولاد | یہ اتفاقاً معلوم ہوئی کہ دمشق کی مشہور تلواروں اور روما کی
زمانہ میں آلات جراحی کے لئے فولاد ممالک محروسہ سرکار عالی کے مقام نرمل سے
لیا جاتا تھا۔ اور اپنی نفاست کے باعث اس قدر طول طویل فاصلے طے کرتا تھا
فولاد ڈھالنے کے کارخانہ کے کھنڈر اس کے شاہد حال ہیں جو اب تک بمقام نرمل
دیکھے جاتے ہیں جہاں اب فولاد نہیں بنایا جاتا۔

ٹراموے | ان امور کے علاوہ جن کو میں نے بیان کیا ہے۔ ہماری بڑی ضروریات
کے منجملہ عمدہ وسائل آمد و رفت بھی ہیں۔ میں نے انگلستان میں موجودہ ذرائع آمد و رفت
کے مسئلہ پر اچھی طرح غور کیا جس کی بنا پر بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ملکی ٹراموے
جاری کرنے سے ہم کو بے حد فائدہ ہوگا جو ہماری پیداوار کے مرکزوں کو ہماری
ریلوں سے ملا دے۔ یہ ٹراموے اس سستی اسپرٹ سے دوڑائی جائے گی جس کو ہم
مہوہ سے تیار کریں گے۔

کوئلہ | ارزاں کوئلہ کے بغیر صنعتی ترقی عملاً ناممکن ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی
کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں کوئلہ کے معدن نہ صرف سنگرینی بلکہ آصف آباد کے
بہت سے حصوں میں موجود ہیں۔ میں نے مؤخر الذکر مقام پر سطح زمین سے کوئلہ نکلتا ہوا دیکھا ہے

کیمیائی دارالعمل | اتنی دیر تک ہم تاریکی میں تلاش کرتے رہے۔ آجکل دارالعمل سے ترقی

ملاحظہ۔ سوائے سنگرینی کے معدن سے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ آصف آباد میں ابھی کام شروع نہیں ہوا ہے۔ مترجم

صنعتی ترقی ممکن نہیں ہے۔ میں نے انگلستان میں جو کارخانہ دیکھا اس میں ماہرین کیمیا کو پایا۔ چند ماہ پیشتر ایک دارالعمل بنانے اور اس کو آراستہ کرنے کی منظوری لی گئی ہے۔ اس وقت آدھی عمارت مکمل ہوئی ہے اور اشیاء ضروری کیلئے انگلستان کو لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ چھ ماہ میں دارالعمل کا کام شروع ہو جائے گا۔

ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر کی ملاقات

ہز اگزالٹڈ ہائنس کے فرمان مبارک سے مجوزہ ترقی کے سلسلہ میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ ہم کو مشورہ دینے کے لئے حیدرآباد میں ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر پروفیسر انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور آئیں۔

۲۳ جون کو وہ آئے اور قریب ایک ہفتہ تک یہاں رہے۔ انہوں نے ایک علیحدہ یادداشت لکھی ہے جس کے اختتام پر وہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ "ریاست حیدرآباد کے نامحدود ذرائع ترقی کے ابتدائی کام کے اجراء میں بلا تاخیر مستعدی سے کام لیا جائے گا"۔

تجاویز

مجھے ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر کی رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی سے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو ان کے زیر نگرانی تربیت پانے کے لئے طلبہ روانہ کئے جائیں جو آئندہ چل کر ہمارے لئے صنعتی تحقیقات، نگرانی اور صناعی کے قابل ہو سکیں۔ میں ڈاکٹر متیالا کی نگرانی میں چار امیدواروں کو روانہ کرنے کی تجویز کرتا ہوں۔ میں نے سائنس گریجویٹوں کے لئے جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں جن امیدواروں نے ملازمت کی درخواست دی ہے اس میں امیدوار کا انتخاب ڈاکٹر فولر کریں گے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ جب تک طلبہ بنگلور رہیں تعلیم پاتے رہیں (جس کی میعاد ایک سال سے زیادہ نہ ہوگی) پانچ امیدواروں کو ماہانہ سو روپیہ اور ڈاکٹر متیالا کو ماہانہ چار سو روپیہ دیئے جائیں۔ بنگلور سے واپسی کے بعد ڈاکٹر متیالا نگران کار دارالعمل ہوں گے جن کی ماہوار تنخواہ تا باضافہ

کی ضرورت ہے۔

تمباکو | ممالک محروسہ سرکار عالی میں نفیس تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ [illegible]
کانپور خصوصیت کے ساتھ سگریٹ کی شکل میں درآمد کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے
پڑوس میں بمقام بنگلور ہندوستانی تمباکو سے جو سگریٹ بنائے جاتے ہیں وہ ہمارے
تمباکو سے بہتر نہیں ہوتا۔

فولاد | یہ حال میں معلوم ہوئی کہ دمشق کی مشہور تلواروں اور [illegible] کی
قدیم زمانہ میں آلات جراحی کے لئے فولاد ممالک محروسہ سرکار عالی کے مقام نرمل سے
لیا جاتا تھا۔ اور اپنی نفاست کے باعث اس قدر طول طویل فاصلے طے کرتا تھا
فولاد ڈھالنے کے کارخانہ کے کھنڈر اس کے شاہد حال ہیں جو اب تک بمقام نرمل
دیکھے جاتے ہیں۔ جہاں اب فولاد نہیں بنایا جاتا۔

ٹراموے | ان امور کے علاوہ جن کو میں نے بیان کیا ہے۔ ہماری بڑی ضروریات
کے منجملہ عمدہ وسائل آمد و رفت بھی ہیں۔ میں نے انگلستان میں موجودہ ذرائع آمد و رفت
کے مسئلہ پر اچھی طرح غور کیا جس کی بنا پر بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ہلکی ٹراموے
جاری کرنے سے ہم کو بے حد فائدہ ہوگا جو ہماری پیداوار کے مرکزوں کو ہماری
ریلوں سے ملا دے۔ یہ ٹراموے اس سستی اسپرٹ سے دوڑائی جائے گی جس کو ہم
کلہوہ سے تیار کریں گے۔

کوئلہ | ارزاں کوئلہ کے بغیر صنعتی ترقی عملاً ناممکن ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی
کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں کوئلہ کے معدن نہ صرف سنگرینی بلکہ آصف آباد کے
بہت سے حصوں میں موجود ہیں۔ میں نے مؤخر الذکر مقام پر سطح زمین سے کوئلہ [illegible]

کیمیائی دار العمل | اتنی دیر تک ہم تاریکی میں تلاش کرتے رہے۔ آجکل دار العمل کی توسیع

حصہ — سونت سنگرینی کے معدن سے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ آصف آباد میں ابھی کام شروع نہیں ہوا۔ (مترجم)

صنعتی ترقی ممکن نہیں ہے۔ میں نے انگلستان میں جو کارخانہ دیکھا اس میں ماہرین کیمیا کو پایا۔ چند ماہ پیشتر یہاں دار العمل بنانے اور اس کو آراستہ کرنے کی منظوری لی گئی ہے۔ اس وقت آدھی عمارت مکمل ہوئی ہے اور اشیاء ضروری کیلئے انگلستان کو لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ چھ ماہ میں دار العمل کا کام شروع ہو جائے گا۔

ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر کی ملاقات

ہز اگزالٹڈ ہائنس کے فرمان مبارک سے مجوزہ ترقی کے سلسلہ میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ ہم کو مشورہ دینے کے لئے حیدرآباد میں ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر پروفیسر انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور آئیں۔

۲۳ جون کو وہ آئے اور قریب ایک ہفتہ تک یہاں رہے۔ انہوں نے ایک علیحدہ یادداشت لکھی ہے جس کے اختتام پر وہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ریاست حیدرآباد کے نامحدود ذرائع ترقی کے ابتدائی کام کے اجراء میں بلا تاخیر مستعدی سے کام لیا جائیگا۔ ؎

تجاویز

مجھے ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر کی رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی سے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو ان کے زیر نگرانی تربیت پانے کے لئے طلبہ روانہ کئے جائیں جو آئندہ چلکر ہمارے لئے صنعتی تحقیقات، نگرانی اور صناعی کے قابل ہوسکیں۔ میں ڈاکٹر منتیالا کی نگرانی میں چار امیدواروں کو روانہ کرنے کی تجویز کرتا ہوں۔ میں نے سائنس گراجویٹوں کے لئے جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں جن امیدواروں نے ملازمت کی درخواست دی ہے اس میں امیدوارو کا انتخاب ڈاکٹر فولر کریں گے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ جب تک طلبہ بنگلور رہیں تعلیم پاتے رہیں (جس کی میعاد ایک سال سے زیادہ نہ ہوگی) پانچ امیدواروں کو ماہانہ سو روپیہ اور ڈاکٹر منتیالا کو ماہانہ چار سو روپیہ دیئے جائیں۔ بنگلور سے واپسی کے بعد ڈاکٹر منتیالا نگران کار دار العمل ہوں گے جن کی ماہوار [illegible] تا ضمیمہ یا ضا

؎ آئندہ یہ یادداشت ہدیہ ناظرین ہوگی۔

سالانہ عنٹ ہوگی۔ ان کے پانچ مددگاروں کا مشاہرہ حسب ذیل ہوگا۔

(۱) مار تا مارصے۔ اضافہ بحساب سالانہ عے

(۲) ماصے تا مار۔ " " " " "

(۳) ماعے تا ماصے۔ " " " " صہ

(۴) ما تا ماعے۔ " " " " " "

ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر کی سفارش پر ان چاروں طلبہ کو باعتبار قابلیت علی الترتیب جائدادوں پر مامور کیا جائے گا۔

میرا آخری مقصد یہ ہے کہ ایک وقت ریاست کے خرچ سے باضابطہ کارخانہ قائم کرکے ایک یا دو چالو پیداوار کو لے کر عملی طور پر ان کے فوائد و منافع سے لوگوں کو واقف کردیا جائے۔ بلاشبہ ہمارے سرمایہ دار سرکاری کارخانہ جات کو خرید کر انہیں وسعت اور ترقی دیں گے۔ اس ملک میں ایک ماشہ عمل تقریر کی بڑی مقدار سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میں نے انگلستان میں بوقت تحقیقات متعدد صنایع کے نقشہ جات، نمونے اور مکمل حالات حاصل کئے جو اجرائے کار پر بہت سودمند ثابت ہوں گے۔ میں ریاست کو یقین دلاتا ہوں کہ ترقی کا امکان تقریباً نامحدود ہے بہترین آدمیوں کے ذریعہ سے بہت کچھ مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ ہندوستانی صنایع کی ترقی پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن اب ہندوستان میں گشت لگاکر اطلاعیں فراہم کررہا ہے جس کے بعد وہ تجاویز کرے گا۔ پھر ہندوستان کے ہر حصہ میں ترقی کی کوشش شروع ہوگی۔ میری بڑی خواہش ہے کہ ہم فوراً کام شروع کرکے نہ صرف تجربہ میں بلکہ اصلی ترقی میں نفع حاصل کریں۔ یہ امر ضروری ہے کہ ہم کلوں اور ہنرمند اشخاص کو حاصل کرنے کے میدان میں سب سے

عنٹ۔ ابتدائی سطروں میں چار امیدواروں کا ذکر ہے شرح تنخواہ بھی چار جائدادوں کی دی گئی ہے غالباً طبع کی غلطی سے پانچ کا لفظ لکھا گیا ہوگا۔ (مترجم)

پہلے ہوں جن کی نسبت بہت بڑی درخواست فوراً جنگ ختم ہوتے ہی ہوگی۔

اقتباس | سرکار عالی نے ازراہ کرم ان تجاویز کو منظور فرمایا اور اس امر کا حکم صادر کیا کہ منجانب سرکار عالی جی، پی اسی ویکفیلڈ صاحب کی کوششوں کا جو انھوں نے ریاست کے صنعتی امکانات کے دریافت میں کی ہے اور ڈاکٹر گلبرٹ جے فولر صاحب کا ترتیب یادداشت کے بارہ میں شکریہ ادا کیا جائے۔ (مترجم ا۔م)

فنِ عروض کے متعلق ایک معرکۃ الآرا فیصلہ

مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی اور مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر میں معنی زحاف کے متعلق خط و کتابت ہوئی تھی وہ دونوں تحریریں بہبود علی صاحب نے مولانا مولوی محمد عبدالواسع صاحب پروفیسر دارالعلوم و اڈیٹر رسالہ کی خدمت میں بغرض فیصلہ ارسال کی تھیں۔ مولوی صاحب نے گذشتہ ذیحجہ ہی میں فیصلہ قلمبند فرمادیا تھا۔ مگر چونکہ مولوی صاحب کو بہبود علی صاحب کا پتہ معلوم نہ تھا اس لئے فیصلہ اُن کی خدمت میں ارسال نہ ہو سکا۔

یہ فیصلہ فن عروض کے اہم مسایل پر مشتمل تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ "ثمرۃ الادب" میں شایع کردیا جائے تاکہ فن عروض کے شائقین اس سے مستفید ہوسکیں۔

اور بہبود علی صاحب کو انتظار جواب کی زحمت سے فرصت مل جائے فقط

تفصیر

نقل رقعہ جناب مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی

مغلپورہ مورخہ ۲۵ مہر سنہ ۱۳۳۲ف

مولانا!

آج ایک بجے دارالترجمہ میں آپ کی ملاقات میرے لیے قابل شکریہ ہوئی کہ مدتوں سے چھوٹی چھپائی کتاب کو دیکھنے کی نوبت آئی۔ آپنے زحاف کی جو تعریف فرمائی وہ مجھے نہایت انوکھی نظر آئی اور مطلق دل کو نہ بھائی۔

یعنے آپ نے فرمایا ہے کہ "زحاف صرف سبب خفیف کے حرف ساکن کے سقوط کو کہتے ہیں۔ اور بس حالانکہ میں نے اذالہ و خرم کا ذکر کیا بھی تو جناب نے تسلیم نہ فرمایا اور اردو فارسی عروضیوں کی شان میں ارشاد فرمایا کہ" ان سبھوں نے عروض سمجھنے میں دھوکا کھایا ہے۔ اور غلطی کی ہے۔ آپ جیسے فاضل کی زبان سے یہ بات سن کر ایک طالب العلمانہ بے چینی سی رہی۔ وہاں سے اٹھ کر معتمدی گیا پھر نظامت تعلیمات گیا کہیں جی نہ لگا کسی کام پر طبیعت نہ جمی یہاں تک کہ گھر پہنچکر "عروض المفتاح سکاکی" مطبوعہ مطبع گلزار محمدی دیکھی اس نے پہلے تعریفات لکھتے ہوئے صفحہ (۱۴) میں لکھا ہے۔

وهذه التغيرات تنقسم الى قسمين فمنها ما يبتنى عليه البيت فيلزم ويسمى علة۔ سواء كان بالزيادة او بالنقصان ومنها ما ليس كذالك فيسمى زحافا۔

اس کا مطلب میں نے تو یہ سمجھا ہے کہ تغیرات کی دو قسمیں ہیں۔ جو تغیر بنائے شعر کیلئے لازم آتا ہے اس کو علت کہتے ہیں۔ عام ازیں کہ وہ زیادتی سے ہو یا کمی سے۔ اور جو ایسا نہ ہو وہ زحاف ہے یعنی عربی میں جو تغیر کہ لازمی

ہوتا ہے جس کا خلاف کبھی جائز نہیں وہ علت کہلاتا ہے۔ جیسے بحر طویل میں مطلع کے
سوا دوسرے اشعار میں قبض ضروری ہے جس کا بدلنا ابدًا ناجائز ہے۔ اس قسم کے
ضروری تغیر کو علت کہتے ہیں۔ اس کے سوا جو تغیر ہو عام ازیں کہ وہ سبب خفیف
میں ہو یا ثقیل میں یا فاصلہ میں یا وتد میں سب پر زحاف کا اطلاق ہوتا ہے۔

سبب خفیف کا زحاف کہلانا خود آپ کا مسلمہ ہے اس لئے اس کی نظیر نہیں
دی جاتی ہے۔ فاصلہ اور وتد کی نظیر سکاکی کے قول سے ملاحظہ انور میں پیش ہے
بحر وافر صفحہ ۲۴۔

اذا لم تستطع شیئًا فدعہ   وجاوزہ الی ما تستطیع

اس میں مفاعلتن سے مفاعیلن پر زحاف عصب ہوا ہے۔ اور بحر کامل ص۲۶

الی ام من خیر عبس منصبا   شطری و احمی سائری بالمنصل

اس میں متفاعلن سے زحاف اضمار مستفعلن ہوا ہے۔ اور نیز ہر جز کے تغیرات
کو زحاف سے سکاکی نے تعبیر کیا ہے۔ اور آخر پر صفحہ (۲۱) میں مندرج ہے
واعلم ان مجموع الزحافات والعلل التی لہا اسماء مفردۃ
ثلثۃ وثلثون۔ اس کے تحت میں ہر رکن کے زحافات کی اسماوار فہرست
دی ہے۔ اذالہ وغیرہ پر بھی زحاف ہی کا اطلاق کیا ہے۔ اور بحر بسیط صفحہ ۲۱۔

قد اشہد الغارۃ الشعواء تحملنی   جرداء معروقۃ اللحیین سرحوب

اس میں صرف حوب بروزن فعلن بسکون عین ہے۔ جو اصل میں فاعلن سے
بزحاف قطع بنا ہے۔ وتد مجموع علن سے ن ساقط اور دوسرا متحرک ساکن۔
اس پر بھی زحاف ہی کا اطلاق ہے۔

معلوم نہیں ہوتا کہ سکاکی نے کہاں وہ تعریف کی ہے جو جناب نے
بیان فرمائی۔ اگر میں اس کے سمجھنے میں غلطی کرتا ہوں یا مجھے دھوکا ہو رہا ہے

توبراہ کرم وطلبہ نوازی اس کی تصحیح وتوضیح سے مجھے دوبارہ ممنون ہونے کا موقع دیا جائے کیونکہ میں بیتابانہ جواب کا منتظر ہوں۔

شرح دستخط
جناب کیفی صاحب

نقل رقعہ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی

شفیق مکرم
دارالترجمہ میں ذکر یہ ہوا تھا کہ زحاف کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر تغیر کو زحاف کہیں گے۔ میں نے گذارش کی کہ فارسی کے عروضیوں نے دھوکا کھایا ہے کہ وہ ہر تغیر کو زحاف کہتے ہیں۔
ورنہ زمخشری وابن عبد ربہ وسکاکی وغیرہ ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے۔ آپ نے پھر اذالہ وخزم کو بھی زحاف میں شمار کیا لیکن جو لوگ عرب کے عروض کو سمجھے ہوئے ہیں وہ اُن لوگوں کی اصطلاح کے بموجب اذالہ وخزم کو علل میں شمار کریں گے۔ اذالہ کا علل میں ہونا تو ظاہر ہے کہ اذالہ عروض وضرب کے سوا کسی رکن میں نہیں ہوتا۔ اور ضرب وعروض وہ رکن ہیں جن پر بیت کی بنا قائم ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اذالہ ان تغیرات میں ہے جن پر بیت مبتنی ہوتی ہے۔
سکاکی نے اس کی تصریح کردی ہے کہ "بیت جس پر مبتنی ہو وہ علت ہے زحاف نہیں" منہا ما یبتنی علیہ البیت فیلزم یسمی علۃ سواء کان بالزیادۃ او بالنقصان ھ اس فقرہ سے ظاہر ہے۔ اذالہ علۃ ہے۔ اصطلاح عرب میں اُسے زحاف نہیں کہیں گے۔

اور خرم تو کچھ اور ہی شئے ہے اس کو علل و زحافات میں شمار کرنا عروضیوں کی اتنی بڑی غلطی ہے۔ جو قابل عفو نہیں۔ میں اس پر ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں جو کسی زمانہ میں اردوئے معلیٰ جب علی گڑھ سے نکلا کرتا تھا اسی رسالہ میں چھپ چکا ہے۔ خیر اذالہ و خرم کو جو آپ نے زحافات میں شمار کیا یہ انہیں عروضیوں کی تقلید سے تھا جنہوں نے عروض عرب کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ان لوگوں کی غلطیوں کی میں نے دو ایک مثالیں آپ سے بیان کی تھیں۔ کہ یہ مصرع۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی

کسی عرب کے سامنے جو ماہر عروض ہو پڑھ کر دیکھئے وہ یہی کہیگا کہ بحر وافر ہے اور فارسی والے اسے بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں۔ یہ غلطی ایسی ہے جیسے کوئی بھیروں کو سن کر کہے کہ گوری ہے۔

اور یہ مصرع بنفشہ رستہ از زمین بطرف جوئبارہا

عرب کا شاعر سن کر کہے گا کہ بحر رجز ہے اور فارسی والے اِسے بھی بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اوزان عرب کا صحیح مذاق فارسی کے عروضیوں میں نہ تھا۔

فارسی کے عروضیوں نے لفظ زحاف کے معنی میں جیسا خلط کیا ہے وہ معیار الاشعار کی اس عبارت سے ظاہر ہے۔

فصل ششم در تغیرات ارکان

بعضے بجائے تغیر زحاف گویند۔ بعضے زحاف تغیرے را گویند کہ در بنا جائز بود و شعر بے آں تغیر نیکو تر بود۔ و بعضے زحاف اسقاط ساکن سبب خفیف را گویند۔"

پہلے معنی زحاف کے عموماً مشہور ہیں۔ دوسرے معنی وہ ہیں جو عوام الناس میں اُن کے موزوں طبع ہونیکے سبب سے پیدا ہو گئے ہیں مثلاً ؎

ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے نغمہ بلائے گوش ہے

اس شعر کو سُن کر لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مصرع میں زحاف ہے۔

یا جیسے۔ ع۔ حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف
اس مصرع کو سن کر کہہ دیتے ہیں کہ ٹوٹتا ہے۔

یہ دونوں معنی زحاف کے خلاف اصطلاح خلیل بن احمد ہیں۔

تیسرے معنی وہ ہیں جو اصطلاح عرب میں مقرر ہیں۔ بعض سبب خفیف کی تخصیص نہیں کرتے مطلق سبب کہتے ہیں۔ عقد الفرید کی تیسری جلد باب الزحاف میں صفحہ (۱۳۳) ابن عبد ربہ کہتے ہیں۔

اعلم ان الزحاف زحافان فزحاف لیسقط ثانی السبب الخفیف وزحاف لیسکن ثانی السبب الثقیل وربما اسقطہ ولا یدخل الزحاف فی شی من الاوتاد و انما یدخل فی الاسباب خاصۃ"

شاید اس قدر لکھنا کافی ہوگا۔ اس سبب سے میں اکتفا کرتا ہوں۔ زمخشری کا رسالہ عروض میں کمیاب ہے چھپا نہیں ہے۔ شاید قسطاس نام ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ اس میں بھی ایسی تصریح ہے کہ جس سے نکلتا ہے کہ زحاف ہر ہر تغیر رکن کو نہیں کہتے۔"

یہ فارسی کے عروضیوں کا ایجاد ہے اور اردو میں تو بہت شایع ہے۔

شرح دستخط
علی حیدر طباطبائی

فیصلہ

ہم نے مولوی سید ضی الدین حسن صاحب کیفی اور مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی کے خطوں کی نقلیں پڑھیں۔ ان خطوط میں امر مابہ بحث زحاف کے معنی ہیں اس لئے فیصلہ سے پہلے زحاف کے تمام معانی بیان کر دینا ضروری امر ہے کیونکہ اسی کی بنا پر فیصلہ ہوگا۔

عربی کے عروضیوں نے زحاف کی مختلف تعریفیں کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) اجزاء بیت کے ہر تغیر لازم وغیر لازم کو زحاف کہتے ہیں خواہ وہ بہ زیادتی ہو یا بہ کمی اور چاہے اسباب میں ہو یا نہ ہوتا دمیں اور خواہ وہ عروض وضرب میں ہو یا صدر و ابتدا وحشو میں چنانچہ علامہ قاضی عبد النبی رحمۃ اللہ تعالیٰ جامع العلوم میں فرماتے ہیں الزحاف عند ارباب العروض هو التغير فی اجزاء البیت زحاف کی یہ تعریف عام ہے جو علۃ اور زحاف بالمعنی الاخص دونوں کو شامل ہے جیسے کہ لفظ تصور کے معنی عام ادراک اور معنی خاص ادراک غیر مقارن للحکم ہیں چونکہ فارسی اور اردو زبان کے اشعار میں دو تین تغیرات کے علاوہ تمام تغیرات لازم تھے اور ان کو علۃ وزحاف میں فرق کرنے کی حاجت نہ تھی اس لئے ان زبانوں کے عروضیوں نے اسی تعریف کو راجح قرار دیا اور وہ اپنے عروض میں زحاف کے یہی معنی لیتے ہیں اور ان عربی عروضیوں کے قول کو ترجیح دیتے ہیں جنہوں نے یہ تعریف کی ہے۔

(۲) عروض وضرب کے علاوہ ہر رکن کے تغیر کو زحاف کہتے ہیں خواہ بزیادت ہو یا بہ نقصان اور چاہے وہ تغیر اسباب میں ہو یا اوتاد میں۔ علامہ سید شریف جرجانی کتاب التعریفات میں لکھتے ہیں الزحاف هو التغير فی الاجزاء الثمانیۃ

من البیت اذا کان فی الصدر او فی الابتداء او فی الحشو۔
اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تغیر عروض و ضرب میں کیا جائے وہ زحاف نہیں بلکہ علۃ ہے۔ اس تعریف کو ہم اس وجہ سے ناپسند کرتے ہیں کہ اس کی بنا پر لازم آتا ہے کہ عروض و ضرب میں جو غیر لازم تغیر ہوں اُن کو بھی علت کہیں۔ حالانکہ تمام محقق علماء عروض عربی اُن کو زحافات میں شمار کرتے ہیں۔
(۳) جس تغیر رکن پر بنا بیت بطور لزوم قائم نہ ہو یعنے اس تغیر کے نہ کرنے سے شعر کے بحر و وزن میں فرق نہ آئے اُس کو زحاف کہتے ہیں خواہ وہ زیادت ہو یا نقصان اور جا ہے وہ اسباب میں ہو یا اوتاد میں خواہ عروض و ضرب میں ہو یا کسی اور رکن میں۔ یہ تعریف محققین فن کے پسندیدہ ہے اور امام الفن علامہ سکاکی نے عروض المفتاح میں یہی تعریف کی ہے چنانچہ وہ تمام تغیرات ارکان کو بیان کر کے لکھتے ہیں ھذہ التغیرات تنقسم قسمین فمنھا ما یبنی علیہ البیت فیلزم و انہ یسمی علۃ سواء کان بالزیادۃ او بالنقصان و منھا ما لیس کذالک فیسمی زحافا۔ ہماری رائے میں یہ تعریف عمدہ ترین تعریف ہی اور تقسیم بہترین تقسیم اسلئے کہ یہ تقسیم مقاصد فن کے لحاظ سے کی گئی ہے کیونکہ فن عروض کا مقصد حقیقتاً اُن دونوں قسموں کے تغیرات میں باہم دگر فرق کرنا ہے جن سے شعر کی بحر و وزن میں تغیر ہو جاتا ہے اور جن سے ایسا تغیر نہیں ہوتا اور یہ مقصد اس تقسیم اور ان تعریفوں کے سوا دوسری تقسیم و تعریفوں سے نہیں حاصل ہوتا۔ چونکہ عروض المفتاح کا ماخذ کتاب الخلیل ہے۔ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ خلیل بن احمد نے بھی زحاف کی یہی تعریف کی ہے۔
(۴) سبب کے حرف ساکن یا متحرک یا حرکت کے ساقط کرنے کو زحاف

کہتے ہیں۔ علامہ زمخشری اساس البلاغۃ میں لکھتے ہیں وفی البیت زحاف وھو نقص فی الاسباب صاحب عقد الفرید نے زمخشری کی تقلید کی ہے جیسا کہ عقد الفرید کی اُس عبارت سے جو سید صاحب نے نقل کی ہے ظاہر ہے۔ ہماری رائے میں یہ تعریف ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے اس لئے کہ اس تعریف کی بنا پر لازم آتا ہے کہ تغیر رکن کی تقسیم یوں کی جائے کہ تغیر اسباب کو زحاف کہتے ہیں اور تغیر اوتاد کو علۃ۔ اور یہ تقسیم مقاصد فن سے اس قدر دور اور ناموزوں ہے کہ خود مقلدین زمخشری کو زحاف وعلۃ دونوں کی دوبارہ تقسیم کرنا پڑی جن سے تغیر کی چار قسمیں ہوگئیں (۱) علۃ لازمہ (۲) علۃ جاری مجری زحاف (۳) زحاف مطلق (۴) زحاف جاری مجری علۃ۔ دمنہوری نے ارشاد الشافی میں اور دمامینی نے شرح خزرجیہ میں یہ چاروں قسمیں لکھی ہیں۔ پہلی قسم کی مثال قطع۔ دوسری قسم کی مثال تشعیث ہے اور اس کو جاری مجری زحاف عدم لزوم کی وجہ سے کہا ہے۔ تیسری قسم کی مثال خبن غیر لازم اور چوتھی قسم کی مثال قبض عروض بحر طویل ہے اس کو جاری مجری علۃ لزوم کی وجہ سے کہا ہے۔ ارشاد الشافی اور شرح خزرجیہ میں یہ تصریحات موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ علۃ کے مفہوم میں معنی لزوم اور زحاف کے مفہوم میں معنی عدم لزوم داخل ہیں اور بنائے تقسیم یہی دو معنی ہیں۔ نہ تغیر فی السبب اور تغیر فی الوتد۔ لہٰذا جو تقسیم تغیر فی الاسباب اور تغیر فی الاوتاد کے لحاظ سے کی گئی ہے وہ بے کار اور غیر مفید ہے اور اس کی بنا پر جو تعریف زحاف کی کی گئی ہے وہ بھی نغو ولاطائل ہے کیونکہ وضع اصطلاحات کا منشا یہ ہے کہ بلحاظ مقاصد فن تقسیم کرنے سے جو اقسام متبائنہ حاصل ہوں وہ اصطلاحی اعلام کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں اور زحاف کی اس تعریف کی بنا پر وہ اقسام بجائے باہم دگر

ممتاز ہونیکے مخلوط ہو جاتے ہیں اور اُن کے ممتاز بنانے کیلئے پھر تقسیم کرکے اقسام الاقسام کیلئے اصطلاحات مقرر کرنا پڑتے ہیں جنمیں سوائے لاحاصل طوالت کے کوئی فائدہ نہیں۔

(۵) سبب خفیف کے حرف ساکن کی گرانی کا نام زحاف ہے محقق طوسی نے معیار الاشعار میں لکھا ہے و بعضے اسقاط ساکن سبب خفیف را گویند۔ یہ تعریف ہم نے معیار الاشعار کے سوا کسی اور کتاب میں نہیں دیکھی اور ہمارے نزدیک بوجوہ متذکرہ تعریف چہارم یہ تعریف بھی ناقابل قبول ہے بلکہ محقق طوسی کا اس تعریف کو سب کے آخر میں بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بھی اسکو مرجوح خیال کرتے ہیں۔

(۶) تغیر غیر مستحسن کو زحاف کہتے ہیں۔ یہ تعریف بھی محقق طوسی نے معیار الاشعار میں کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے و بعضے زحاف تغیری را گویند کہ در بنا جائز بود و شعر بے آں تغیر نکوتر بود (یہ تعریف بھی معیار الاشعار کے سوا کسی عربی کتاب میں نظر سے نہیں گزری)

اگر یہ تعریف عربی کے عروضیوں نے کی ہے تو مقاصد فن کے لحاظ سے ناموزوں ہے اور اگر فارسی کے عروضیوں کی تعریف ہے تو اُن کے مقاصد کے لحاظ سے مناسب ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔

زحاف کی تمام تعریفیں بیان کرنیکے بعد ہم اصل مقصد کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر امر مابہ البحث صرف یہ ہے کہ زحاف کی کیا تعریف ہے تو یہ نزاع لفظی ہے مولوی سید رضی الدین حسن کا یہ کہنا کہ ہر تغیر کو زحاف کہتے بلحاظ تعریف اول مطلقاً صحیح ہے اور بلحاظ تعریف دوم عروض و ضرب کے علاوہ بقیہ ارکان کے متعلق صحیح ہے اور بلحاظ تعریف سوم عروض و ضرب کے تغیرات لازمہ کے علاوہ بقیہ تمام تغیرات کے متعلق صحیح ہے اور سید علی حیدر صاحب کا یہ کہنا کہ ساکن سببی کی گرانی کو زحاف کہتے ہیں بلحاظ تعریف پنجم صحیح ہے۔ گو اس بنا پر یہ لازم آئیگا کہ سید صاحب اس مسئلہ میں اس شخص کی تقلید کر رہے ہیں جو انکی رائے میں عروض عرب کو نہیں سمجھا ہے اور نیز اُن کا یہ کہنا کہ نقص سے فی الاسباب کو زحاف کہتے ہیں بلحاظ تعریف چہارم صحیح۔ اور اگر امر مابہ النزاع یہ مسئلہ ہے کہ علمائے سلف نے زحاف کی کیا تعریف کی ہے جیسا کہ کیفی صاحب اور سید صاحب کے خطوں کے حسب ذیل فقروں سے معلوم ہوتا ہے۔

کیفی صاحب (معلوم نہیں ہوتا سکاکی نے کہاں وہ تعریف کی ہے جو جناب نے بیان فرمائی)
سید صاحب (زمخشری و ابن عبد ربہ و سکاکی وغیرہ ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے)

تو یہ نزاع نزاع معنوی اور قابلِ فیصلہ ہے کیونکہ سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ علامہ سکاکی صرف نقص فی الاسباب کو زحاف کہتے ہیں اور کیفی صاحب اس کے منکر ہیں۔ اس امر کا فیصلہ سکاکی کی عبارت گزشتہ اور دیگر عبارتوں پر غور کرنے سے سید صاحب کے خلاف ہوتا ہے۔ سکاکی کی عبارت سابقہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو تغیر ارکان میں ہوتے ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ تغیر جن پر بنا رہتی ہوتی ہے اور اس لئے وہ تغیر لازم ہوتے ہیں یعنے ایسے تغیرات جن کا التزام نہ کرنے کی صورت میں بحر کا وہ وزن مخصوص قائم نہ رہ سکے جس پر قصیدہ وغیرہ کہنا مقصود ہے جیسے بحر بسیط کے وزن اول میں عروض و ضرب دونوں کا خبن ضروری ہے یا وزن دوم میں عروض کا خبن اور ضرب کا قطع لازم ہے یا بحر وافر کے وزن اول میں عروض و ضرب کا مقطوف ہونا لابدی ہے۔ یہ تغیرات خواہ بزیادت ہوں یا بہ نقصان اور خواہ وتد میں ہوں یا سبب میں علماء عروض کی اصطلاح میں علت کہلاتے ہیں۔ یہ تغیرات عموماً عروض و ضرب میں واقع ہوا کرتے ہیں (۲) انکے علاوہ باقی تمام تغیرات خواہ وہ بزیادت ہوں یا بہ نقصان اور جا ہے وہ وتد میں ہوں یا سبب میں اور خواہ عروض و ضرب میں ہوں یا کسی اور رکن میں زحاف کہلاتے ہیں۔ پھر علامہ سکاکی اس کے بعد جہاں ارکان کے القاب بیان کرتے ہیں تحریر فرماتے ہیں۔ ما یسلم من العلة بالنقصان مع جواز ان لا یسلم یسمی صحیحا والسالم من العلة بالزیادة بالشرط المذکور یسمی معری والسالم من الزحاف غیر الخرم و الخرم بالشرط المذکور یخص باسم السالم والسالم من الخرم بالشرط المذکور یسمی

موفوراً وما ليسلم من الخزم اسمیہ انا مجرداً یعنے اگر کسی بحر میں عروض یا ضرب ایک وزن میں معلل بعلت نقصان اور دوسرے وزن میں تغییر علت سے سالم مستعمل ہوتے ہوں تو علت سے سالم مستعمل ہونیکی صورت میں ان ارکان کو صحیح کہتے ہیں نیز اگر کسی بحر کے ایک وزن میں یہ ارکان معلل بہ علت زیادت اور دوسرے وزن میں سالم استعمال کئے جاتے ہوں تو سالم استعمال کئے جانیکی حالت میں یہ ارکان معری کہلاتے ہیں اور اگر اجزا بیت خرم وخزم کے علاوہ دوسرے زحاف جائز ہونیکے باوجود ان زحافوں سے پاک مستعمل ہوں تو ایسے اجزا سالم کہلاتے ہیں اور خزم جائز ہونیکی صورت میں اگر خزم نہ کیا گیا ہو تو جزو مذکور موفور کہلائیگا۔ اور باوجود خزم کے جائز ہونیکے خزم نہ کیا جائے تو اُس رکن کا نام میں مجرد رکھتا ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ سکاکی کے نزدیک خرم وخزم دونوں زحاف ہیں باوجودیکہ خرم اوتاد کے سوا اسباب میں نہیں ہوتا اور خزم اگرچہ اسباب واوتاد دونوں میں ہوتا ہے مگر زیادتی کا نام ہے نہ نقصان کا۔ اس عبارت سے اس مسئلہ کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی حل ہوگیا یعنے خزم رکن پر زیادتی کو کہتے ہیں نہ شعر پر زیادتی کو۔ خرم کے زحاف ہونیکی عروض المفتاح میں متعدد جگہ تصریح موجود ہے چنانچہ بحر ہزج کے زحافات کے ضمن میں لکھا ہے ویجری فی مفاعیلن الصدری الخرم والخرب والشطر اور ضمن زحافات بحر متقارب میں ہے والثرم والثلم جاریان فی الصدری ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ خرم۔ خرب۔ شطر۔ ثرم۔ ثلم سکاکی کے نزدیک زحاف ہیں اور یہ سب صاف تغیر فی الوتد ہیں نیز بحر خفیف کے ضمن میں لکھا ہے زحافہ یجری فی کل فاعلاتن ومس تفع لن الخبن والکف والشکل الا فیما کان ضربا فالکف والشکل لا یجریان فیہ ویجری فی فاعلن الخبن وفی فاعلاتن الضربیۃ التشعیث وکذا فی العروضیۃ

لکن عند التصریع لا غیر۔ اس عبارت میں علامہ سکاکی نے تشعیث کو زحافات میں شمار کیا ہے حالانکہ تشعیث تینوں مذہبوں کی بنا پر تغیر وتد کا نام ہے نہ تغیر سبب کا
ان عبارتوں سے سید صاحب کے دعوی کا غلط ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا اور خرم و خزم کا زحاف ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ اب رہا اذالہ و تسبیغ کا مسئلہ اُس کے متعلق سکاکی کے مذہب کی بنا پر نہ کیفی صاحب کا ان کو مطلقاً زحاف کہنا صحیح ہے نہ سید صاحب کا ان کو علت قرار دینا بجا ہے اس لئے کہ علامہ سکاکی تغیر لازم کو علت اور تغیر غیر لازم کو زحاف کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر اذالہ یا تسبیغ ضرب میں ہوں تو تغیر لازم ہونے کی وجہ سے علت ہوں گے اور اگر عروض میں پائے جائیں تو تغیر لازم ہونے کے باعث زحاف کہلائیں گی کیونکہ بحالت تصریع ضرب مذال یا مسبغ کا عروض بھی مذال یا مسبغ ہو گا اور عدم تصریع کی حالت میں عروض کا مذال یا مسبغ ہونا ضروری نہیں۔ سید صاحب اپنے اس دعوی کے ثبوت میں یہ استدلال پیش کرتے ہیں (اذالہ عروض و ضرب کے سوا کسی رکن میں نہیں ہوتا اور عروض و ضرب وہ رکن ہیں جن پر بیت کی بنا قائم ہے اس سے ظاہر ہے کہ اذالہ اُن تغیرات میں ہے جن پر بیت مبتنی ہوتی ہے) یہ استدلال بالکل انوکھا استدلال ہے۔ سید صاحب نے نئی منطق کے ذریعہ سے نیا نتیجہ نکالا ہے ہم تو ہم اگر ارسطو اور بوعلی بھی اپنی ساری عقل وزیری اس امر کے سمجھنے میں صرف کر دے کہ سید صاحب کے ذکر کردہ مقدموں سے نتیجہ مطلوبہ کیونکر حاصل ہوا تو اس کی کنہ نہ دریافت کر سکے اصول منطق کی رو سے ان دونوں مقدموں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اذالہ اُن ارکان کے تغیرات میں ہے جن پر بیت کی بنا قائم ہے۔ جب اس نتیجہ کے ساتھ یہ کبری ملا یا جائے کہ جو تغیرات اُن ارکان میں ہوتے ہیں جن پر بیت کی بنا قائم ہے اُن پر بیت مبتنی ہوتی ہے تو سید صاحب کا مفروضہ نتیجہ حاصل ہو گا مگر یہ کبری غلط ہے اس لئے کہ گذشتہ بیانات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عروض و ضرب میں ایسے تغیرات

بھی ہوتے ہیں جن پر بنائے بیت قائم نہیں ہوتی جیسے خبن طے۔ کف تشعیث وغیرہ
لہٰذا اس دلیل سے سید صاحب کا ظاہری نتیجہ نہیں حاصل ہوتا اور اُن کی منطق دانی
کی قلعی کھلجاتی ہے نیز یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ سید صاحب نے سکاکی کی عبارت کا
مطلب غلط سمجھا ہے۔

اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں (خرم کچھ اور ہی شئے ہے اُسے علل و زحافات
میں شمار کرنا عروضیوں کی اتنی بڑی غلطی ہے جو قابل عفو نہیں) خرم کو علامہ سکاکی
نے زحافات میں شمار کیا ہے جیسا کہ عروض مفتاح کی عبارات گذشتہ سے ظاہر ہے
اور محمد بن علی المحلی نے شفاء العلیل فی علم الخلیل میں اس کو علل مفارقہ میں گنا ہے
چنانچہ لکھتے ہیں۔ الخزم بالزای فھو علۃ مفارقۃ غیر ملازمۃ ولا
یعتد بہ فی الوزن وھو زیادۃ اربعۃ احرف فما دونھا فی اول الصدر
والابتداء خاصۃ ولا یزاد فی الحشو ولا یختص بجر من البحور
اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ خزم صدر و ابتداء کے شروع میں چار حرفوں یا چار سے
کم حرفوں کی زیادتی کا نام ہے اور چونکہ تغیرات ارکان زحاف و علت میں منحصر ہیں لہٰذا
خزم سکاکی کے نزدیک زحاف زیادت اور زمخشری اور اُس کے متبعین کی رائے
میں علۃ ہوگا اور جب خزم سید صاحب کی رائے میں نہ زحاف ہے نہ علت تو وہ شاید
صدر کی چوٹی یا اُس کے سر کا سینگ ہو تو ہو سید صاحب نے خزم کے متعلق جس مضمون
کا حوالہ دیا ہے وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا لہٰذا اس کی اصابت و خطا کے متعلق
ہم کچھ نہیں لکھ سکتے۔

پھر سید صاحب یہ لکھتے ہیں (ازالہ و خزم کو جو آپ نے زحافات میں شمار کیا یہ اُنہیں
عروضیوں کی تقلید سے تھا جنہوں نے عروض عرب کے سمجھنے میں غلطی کی ہے)
اور آگے چلکر اس غلطی کا الزام اشارۃً فارسی کے عروضیوں پر لگاتے ہیں معلوم

نہیں کہ عربی عروض کے سمجھنے میں غلطی کرنے کے ان کی رائے میں کیا معنی ہیں۔
اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ فارسیوں نے مطلق تغیر رکن کو زحاف کہا حالانکہ عرب مطلق
تغیر رکن کو زحاف نہیں کہتے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابتداء مضمون میں ہم نے
بتادیا ہے کہ عرب کے عروضیوں میں ایسے افراد بھی ہیں جو مطلق تغیر رکن کو زحاف
کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تعریف اول و دوم و سوم جن میں زحاف کیساتھ نقص فی الاسبب
کی تخصیص نہیں ہے اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نقص فی الاسبب کے
زحاف کہنے پر عروضیین عرب کا اجماع ہے تو کیا ضرور ہے کہ فارسی کے عروضی
بھی اپنی اصطلاح میں دوسری زبان کے عروضیوں کی تقلید کریں اور اپنے مقاصد
کو نظر انداز کردیں لامشاحۃ فی الاصطلاح مسلم مسئلہ ہے پھر فارسی کے
عروضیوں پر غلطی کا الزام کیونکر لگایا جاسکتا ہے بلکہ جو شخص غلطی کا الزام لگائے
وہ خود خطاوار ہے اور اگر سید صاحب کا یہ منشا ہے کہ فارسی عروضیوں نے
اپنی کتابوں میں عروض عرب کو غلط نقل کیا ہے تو سید صاحب کو یہ الزام ثابت
کرنا چاہئے۔ ہمارے سامنے اسوقت معیار الاشعار اور اس کی شرحیں اور قواعد العروض
وغیرہ موجود ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں عربی
کے بحور و اوزان عروضی و زحافات وغیرہ وہی نقل کئے ہیں جو عروض المفتاح وغیرہ
کتب عروض عرب میں مذکور ہیں لہٰذا سید صاحب کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہوا
اور اگر سید صاحب کا یہ مطلب ہے کہ عجمی عروضیوں نے اپنی اپنی زبانوں کے عروض میں
میں عربوں کی کورانہ تقلید نہیں کی حتی کہ زبان عربی کے عروض پر زبان فارسی اور
اور اردو کا عروض بالکل منطبق ہوجاتا جیسا کہ ان کی مثالوں سے ظاہر ہے تو یہ
فارسی اور اردو کے عروضیوں کی غلطی نہیں ہے بلکہ سید صاحب کی فاش غلطی
ہے اگر عجمی عروضی ایسا کرتے تو ان کی زبانوں کا شیرازہ نظم درہم و برہم ہوجاتا

اور سہ موزوں طبع کھلے لفظوں میں کہتا کہ انھوں نے ناقابلِ عفو جرم کا ارتکاب کیا ہے نیز اُن زبانوں کی نظموں کا معیار وہ عروض ہرگز نہ بن سکتا۔ عروض ایک ایسا فن ہے جس کا مدار زبان کی نظموں کے وزنوں کے استقرار پر ہے یہ استقرا جس قدر تام ہوگا اتنا ہی فن بھی مکمل ہوگا خلیل بن احمد نے اشعار عرب کے اوزان کا استقرار کر کے عربی عروض کی بنا ڈالی اور پندرہ بحریں مقرر کیں اور جو وزن جس بحر میں داخل ہو سکتا تھا اُس کو اُس بحر میں داخل کیا اور ہر بحر کے ارکان کی وہی تعداد قرار دی جو عربی اشعار کے لحاظ سے قرار دی جانا چاہیے تھی اور جو زحافات وعلل عربی اشعار میں پائے گئے اُن کیلئے الفاظ اصطلاحی مقرر کئے اور اُن ارکان و بحور کی تعیین کر دی جن میں وہ پائے جاتے ہیں۔ پھر اخفش نے خلیل کی مقرر کردہ بحروں پر بحر متدارک کا اضافہ کیا اور عروض عرب کا فن مکمل ہو گیا۔ اسی طرح فارسیوں نے اپنی زبان کے اوزان اشعار کا استقرار کر کے فارسی عروض کی بحروں اور اُن کے ارکان کا تعین اور زحافات کا تقرر کیا جس میں اُن کو لامحالہ تخالف السنہ اور اختلاف اوزان کی وجہ سے عربی عروض سے علیحدہ ہونا پڑا لہذا اُن کا یہ فعل اُن کی قوت اجتہادی اور جودت طبع کی بین دلیل ہے نہ غلطی اور سید صاحب کا اس کو خطا قرار دینا ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم، کا مصداق ہے۔ اس کے بعد سید صاحب فارسی عروضیوں کی غلطیاں گنانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں (یہ مصرع "اگر غفلت سے باز آیا جفا کی"، کسی عرب کے سامنے جو ماہر فن عروض ہو پڑھ کر دیکھئے وہ یہی کہیگا کہ بحر وافر ہے اور فارسی والے اسے بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں) سید صاحب نے یہ نئی بھیروں چھیڑی جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے عربی عروض کی کتابوں میں دیکھ لیا ہے کہ بحر وافر وافی مقطوف العروض والضرب مستعمل ہوتی ہے جس کے رکن مفاعلتن

زحاف عصب سے مفاعیلن ہو جاتا ہے اور بحر ہزج مجزو مستعمل ہے اِس لئے بحر ہزج کا کوئی شعر مسدس الارکان نہیں ہو سکتا اور یہ مصرعہ مثمن رکنی شعر کا ہے مگر سید صاحب کا یہ غلط اعتراض نقصان معلومات فن پر مبنی ہے۔ تمام عروضیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی وزن میں دو بحروں میں داخل ہونیکا احتمال ہو اور ایک بحر کے لحاظ سے وہ وزن زحاف سے سالم اور دوسری بحر کے لحاظ سے مزحف قرار پاتا ہو تو اُس وزن کو اُس بحر کا وزن کہنا چاہئے جس کے لحاظ سے وہ زحافات سے سالم ہو نیز اگر کوئی وزن جو دو بحروں میں داخل ہو سکتا ہو اور ایک بحر میں شمار کرنے کے لحاظ سے اس میں زیادہ تغیر کرنا پڑتا ہو اور دوسری بحر میں شمار کرنے کی صُورت میں کم تغیر کرنا پڑتا ہو تو اُس کو اُس بحر میں داخل کرنا چاہئے جس کے لحاظ سے اس میں خفیف زحاف آئیں اور کم تغیر کرنا پڑے چنانچہ علامہ سکاکی بحر کامل کے ضمن میں حسب ذیل تین شعر نقل کر کے لکھتے ہیں۔

بیت المضمر؛ انی مرؤ من خیر عبس منصبا؛ شطری و احمی سائری بالمنصل؛ تقطیعہ متفعلن ستًّا

بیت الموقوص؛ یذب عن حریمہ بسیفہ؛ و رمحہ و نبلہ و یحتمی؛ تقطیعہ مفاعلن ستًّا

بیت المخزول؛ منزلۃ صم صداھا و عفت؛ ارسمھا ان سئلت لم تجب؛ تقطیعہ مفتعلن ستًّا

انما یحکم لھذہ الابیات الثلثۃ بکونھا مزحف الکامل اذا وجدت معھا فی القطعۃ او القصیدۃ متفاعلن یعنے ان تینوں شعروں کو اس صورت میں بحر کامل کے مزحف اشعار کہیں گے جب جس قطعہ یا قصیدہ کے یہ شعر ہوں اس میں کے کسی شعر میں کوئی جزو وزن متفاعلن پر ہو ورنہ پہلا شعر بحر رجز تام سالم الارکان میں شمار ہوگا اور دوسرا رجز مخبون الارکان میں۔ اور تیسرا رجز مطوی الارکان میں۔ اور دمنہوری ارشاد الشافی میں بحر وافر کے ضمن

زحافات میں لکھتے ہیں اذا عقلت اجزاء بیت من مجزو وھذ البحر اشتبہ بمجزو الرجز فان وجد فی القصیدۃ جزء علی زنۃ مفاعلتن تعین کونھا من مجزو الوافر وعلی زنۃ مستفعلن تعین کونھا من مجزو الرجز والاجاز حملھا علی کل وترجح حملھا علی مجزو الرجز لانہ حمل علی الاخف فان صیرورۃ مستفعلن فی الرجز مفاعلن بالخبن وھو حذف ساکن وصیرورۃ مفاعلتن فی الوافر مفاعلن بالعقل وھو حذف متحرک ولاشک ان حذف الساکن اخف من حذف المتحرک واذا عصبت بالصاد المھملۃ اجزاء بیت من مجزوہ اشتبہ بالھزج فان وجد فی القصیدۃ جزء علی زنۃ مفاعلتن تعین الحمل علی الوافر والا ترجح الحمل علی الھزج لان مفاعیلن فیہ اصلی وفی الوافر عارض بالعصب۔ یعنی بحر وافر مجزو کے کسی شعر کے تمام اجزا میں اگر زحاف عقل آئے تو یہ بحر مجزو رجز مخبون الارکان کے مشابہ ہو جائے گی اس لئے اگر اس قصیدہ کے کسی شعر میں کوئی جزء مفاعلتن کے وزن پر ہو تو شعر مذکور و قصیدہ یقیناً بحر وافر کا شعر ہوگا۔ اور اگر کوئی جزء مستفعلن کے وزن پر ہو تو وہ لامحالہ بحر رجز کا شعر شمار کیا جائیگا۔ اور اگر اس قصیدہ میں نہ کوئی جزء مفاعلتن کے وزن پر ہو نہ مستفعلن کے تو وہ بحر وافر اور بحر رجز دونوں میں شمار ہو سکے گا مگر بحر رجز میں اس کا شمار کرنا اولیٰ ہے اس لئے کہ اس صورت میں تغیر اخف ہوگا کیونکہ مستفعلن خبن سے مفاعلن ہو جاتا ہے اور مفاعلتن عصب سے اور خبن حذف ساکن سببی کو کہتے ہیں اور عقل متحرک سببی کے گرانے کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ حذف ساکن حذف متحرک سے اخف ہے۔ اور اگر مجزو وافر کی بیت کے ہر رکن

میں زحاف عصب آئے تو یہ بحر مجزو ہزج کے مشبہ ہو جائیگی اس لئے اگر اس قصیدہ کے کسی شعر کا کوئی جزو مفاعلتن کے وزن پر ہو تو اس کو بحر وافر کا قصیدہ کہینگے ورنہ بحر ہزج کا کیونکہ مفاعیلن بحر ہزج میں اصلی ہے اور بحر وافر میں زحاف عصب کے ذریعہ سے عارضی - ان دونوں عبارتوں سے متفق علیہ دو اصول ہم نے بیان کئے ہیں وہ اچھی طرح ثابت ہو گئے - انہیں دونوں اصولوں کی بناء پر سید صاحب کا غلط اعتراض اٹھ گیا اور واضح ہو گیا کہ عربی ماہرین عروض کے نزدیک بھی یہ مصرع " اگر غفلت سے باز آیا جفا کی " بحر ہزج محذوف العروض والضرب کا مصرع ہے کیونکہ اس غزل کے کسی مصرع کا کوئی جزو مفاعلتن نہیں ہے لہذا اس کا شمار اسی بحر میں ہوگا جس کا اصلی رکن مفاعیلن ہے نہ جس کا اصلی رکن مفاعلتن اور عارضی رکن بزحاف عصب مفاعیلن ہے - اب رہی یہ بات کہ عربی زبان کے عروضیوں نے بحر ہزج کو مجزوء الاستعمال قرار دیا ہے اور تام یا وافی الاستعمال نہیں کہا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ خلیل بن احمد و اخفش وغیرہ ائمہ فن نے جب تدوین عروض کے لئے شعراء عرب کے کلام کا استقراء کیا تو انہوں نے کوئی قطعہ یا قصیدہ ایسا نہیں پایا جس کا ہر مصرع مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن یا مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن پر ہو بلکہ پہلا وزن تو ان کے استقراء میں بالکل مفقود پایا گیا اور دوسرا وزن جس قطعہ یا قصیدہ میں ملا اس میں کسی نہ کسی مصرع کا جزو مفاعلتن کے وزن پر ضرور پایا گیا اس لئے انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ عربی زبان میں بحر ہزج وافی مستعمل نہیں ہے بلکہ مجزو مستعمل ہے اور جو مصرعے یا اشعار مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن پر ہیں وہ بحر وافر کے معصوب الارکان مصرعے یا اشعار ہیں کیونکہ جن قصائد کے وہ مصرعے یا اشعار اجزاء ہیں ان قصائد کے کسی نہ کسی مصرع کا جزو مفاعلتن ضرور ہے لیکن خلیل و اخفش وغیرہ کا یہ

فیصلہ جو استقرار کی بنا پر کیا گیا ہے جب خود زبان عربی ہی کے لئے قطعی نہیں ہے بلکہ ابن مرزوق نے لکھا ہے کہ عربی زبان میں بحر ہزج تام الارکان بھی شاذ و نادر مستعمل ہوئی ہے اور اسکے ثبوت میں انہوں نے یہ شعر اور اسکے مثل دو ایک شعر پیش کئے ہیں ؎

عفا یا صاح من سلمی مراعیہا فظلت مقلتی تجری ماقیہا ۔ تقطیعہ مفاعیلن ہشتا

پھر اس فیصلہ کا کیونکر یہ منشا ہو سکتا ہے کہ بحر ہزج کسی زبان میں مسدس الارکان مستعمل نہیں ہے لہذا اگر ان کا یہ منشا ہو بھی تو دوسری زبان والے اس کو کیوں ماننے لگے جبکہ ان کی زبانوں میں بحر ہزج مسدس بلکہ مثمن تام الارکان مستعمل ہے۔ اگر سید صاحب کا یہ قول مان لیا جائے کہ عروض عرب کی تقلید میں فارسی اور اردو کے عروضیوں کو یہی کہنا چاہئے کہ مصرع " اگر غفلت سے باز آیا جفا کی " بحر وافر کا مصرع ہے تو ہم سید صاحب سے یہ دریافت کریں گے کہ یہ مصرع " اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا " کس بحر کا مصرع ہے اس لئے کہ اگر اس کو بحر وافر یا ہزج کا مصرع کہیں تو عربوں کے اصول پر نہ بحر ہزج کا مصرع ہو سکتا ہے نہ بحر وافر کا کیونکہ یہ دونوں بحریں ان کے یہاں مسدس الاصل ہیں اور یہ مصرع مثمن ہزج کا ہے لہذا ہر مصرع کے ایک رکن کا خروج دائرے سے لازم آتا ہے اور علماء عروض عرب کے نزدیک دائرہ سے ایک حرف کا خروج بھی جائز نہیں ہے اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ تام الارکان بحروں کے عروض و ضرب میں اذالہ و تسبیغ نہیں آسکتے۔ ان دلائل سے صاف ظاہر ہے کہ مصرع مذکور کو کوئی صاحب عقل سلیم بحر وافر کا مصرع نہ کہیگا کیونکہ بحر وافر اردو میں مستعمل ہی نہیں ہے لہذا فارسی کے عروضی نہیں بلکہ خود سید صاحب بھیرویں کو سن کر گوری کہہ رہے ہیں۔

پھر سید صاحب فارسی عروضیوں کی دوسری غلطی بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں (اور یہ مصرع " بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جویبار ما " عرب کا شاعر سن کر کہے گا کہ

بحر رجز ہے اور فارسی والے بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں) سید صاحب کا یہ قول عربی عروض کے لحاظ سے بالکل غلط ہے عربی عروض کی بنا پر تو یہ مصرع نہ بحر رجز کا مصرع ہو سکتا ہے نہ بحر ہزج کا کیونکہ یہ دونوں بحریں عربی زبان میں مسدس الاصل ہیں اور یہ مصرع مثمن بحر کا ہے بلکہ یہ مصرع ان کے نزدیک چار بحروں کا شعر بن سکتا ہے (۱) بحر وافر مجزو معقول الارکان (۲) بحر کامل مجزو موقوص الارکان (۳) بحر رجز مجزو مخبون الارکان (۴) بحر ہزج مجزو مقبوض الارکان۔ مگر بلحاظ اصول مذکورہ بالا اس کو بحر وافر یا بحر کامل میں شمار کرنے سے بحر رجز یا بحر ہزج میں شمار کرنا اولیٰ ہے اس لئے کہ عقل اور وقص متحرک سببی کے ساقط کرنے کو کہتے ہیں اور خبن و قبض ساکن سببی کے گرانے کا نام ہے اور حرف ساکن کا گرانا بہ نسبت حرف متحرک کے گرانے کے تغیر خفیف ہے اس لئے اسی کو اختیار کریں گے پھر اس کو بحر رجز میں شمار کرنے سے بحر ہزج میں شمار کرنا اولیٰ ہے کیونکہ مفاعیلن پر زحاف قبض صرف حذف یا سے مفاعلن بن جاتا ہے اور صرف عمل حذف کرنا پڑتا ہے بخلاف اس کے مستفعلن پر زحاف خبن حرف سین ساقط کرنے سے متفعلن ہوتا ہے پھر اس کو مفاعلن سے بدلتے ہیں اور اس میں حذف ابدال دو عمل کرنا پڑتے ہیں اور دو عملوں کی بہ نسبت ایک عمل تغیر اخف ہے لہذا اس مصرع کو بحر ہزج کا شعر شمار کرنا بہتر و انسب ہے۔ ان وجوہ سے عرب کے عروضی بھی اس مصرع کو بحر ہزج کا شعر شمار کرینگے۔ سید صاحب اس غلطی میں ابن عبدربہ کی تقلید میں مبتلا ہو گئے ہیں کیونکہ اس نے لکھدیا ہے کہ بحر ہزج کے عروض میں قبض ممنوع ہے لیکن ان کو جان لینا چاہیئے کہ خلیل ابن احمد سے بعض روایتیں بحر ہزج میں قبض عروض کے جواز کی بھی ہیں اور اخفش تو مطلقاً بحر ہزج کے عروض کا قبض جائز رکھتا ہے عروض المفتاح میں ہے

وعن الاخفش رحمہ اللہ جواز قبضہا وفی بعض الروایات عن الخلیل ایضاً لہٰذا مطلقاً عدم جواز کا حکم دینا صحیح نہیں ہے یہ تو عربی عروض کے اعتبار سے ہے اب رہے فارسی کے عروضی تو ان میں سے محقق طوسی نے معیار الاشعار میں اس وزن کو صرف بحر رجز کا وزن شمار کیا ہے اور بحر ہزج کے ضمن میں یہ وزن نہیں بتایا ہے لہٰذا مطلقاً فارسی کے عروضیوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس کو بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں بہتان و افترا ہے اور اردو کے اساتذہ اس وزن کو بحر ہزج اور بحر رجز دونوں میں شمار کرتے ہیں اور بحر ہزج میں شمار کرنا بوجوہ مندرجہ بالا اولیٰ بتاتے ہیں چنانچہ قدر بلگرامی قواعد العروض میں بحر ہزج کے وزن (۳۹) کی مثال میں حکیم قاآنی کا یہ شعر پیش کر کے (درختہا ئے باردرچو اشتران بار بر ہمی زپشت یکدگر کشیدہ صف قطارہا) لکھتے ہیں "اس کو رجز مخبون اور کامل موقوص بھی کہہ سکتے ہیں مگر اولیٰ یہیں شمار کرنا ہے" اور پھر بحر رجز کے وزن پنجم کی مثال میں اسی قصیدہ کا دوسرا شعر نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں "بہتر ہے کہ اس کو بحر رجز میں نہ شمار کریں کیونکہ جب مفاعیلن سے پانچواں حرف ساکن گرائیں تو وہ بلا تصنع مفاعلن بن جائے اور وہی مقبوض ہے اور جب مستفعلن سے دوسرا ساکن گرائیں تو متفعلن رہے اور جب متفعلن کو لفظ مستعمل سے تبدیل کریں تو مفاعلن مخبون ہو اس صورت میں دو عمل ہوئے ایک سقوط دوسرے تبدیل اور مفاعیلن میں ایک ہی عمل ہوا یعنی سقوط بدیں سہولت اس وزن کو ہزج مقبوض ہی کہیں گے" لہٰذا سید صاحب کا یہ کہنا کہ فارسی کے عروضی اس کو صرف ہزج میں شمار کرتے ہیں مطلقاً صحیح نہیں ہے ہاں البتہ محقق طوسی کے علاوہ دوسرے عروضیوں نے اس کو دونوں بحروں رجز اور ہزج میں شمار کیا ہے اور ہزج کا وزن قرار دینے کو معقول وجوہ سے

ترجیح دی ہے اور اس میں وہ حق بجانب ہیں۔
اس کے بعد سید صاحب زحاف کے چھٹے معنی کے متعلق لکھتے ہیں جو محقق طوسی کی عبارت میں دوسرے معنی ہیں (دوسرے معنی وہ ہیں جو عوام الناس میں اُنکے موزوں طبع ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں) سید صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے عوام الناس کو ان معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شعراء فارسی کے اصطلاحی معنی ہیں اور ائمہ عروض عرب کی تعریفات سے ماخوذ ہیں۔ فارسی زبان میں چونکہ ارکان شعر میں جو تغیرات ہوتے ہیں اُن کا ابتدا از نظم سے انتہا تک التزام ضروری ہے مگر تسکین ایک ایسا تغیر ہے جس کا ایک ہی نظم میں استعمال اور عدم استعمال دونوں جائز ہیں یا بحر رمل کے وزن مخبون میں صدر و ابتدا سالم اور مخبون لانا جائز ہے یا اذالہ و تسبیغ کا عروض و ضرب میں لانا اور نہ لانا دونوں جائز ہیں۔ اور اسی طرح کے چند تغیرات نقصان عروض و ضرب کیساتھ مخصوص ہیں کہ ان میں سے دو دو کا باہمی اجتماع جائز ہے ان میں سوائے تسکین کے تمام تغیرات کسی نہ کسی خاص رکن کیساتھ مخصوص ہیں البتہ تسکین کا استعمال ہر تین متوالی متحرک حرفوں کے حرف درمیانی میں ہو سکتا ہے خواہ وہ تین متحرک متوالی صدر و ابتدا میں واقع ہوں یا عروض و ضرب میں یا حشو میں اور خواہ تین حرف متحرک متوالی ایک رکن میں ہوں یا دو رکنوں میں اس لئے صرف یہی ایک ایسا تغیر عام رہ گیا جس کا التزام بطور لزوم نہیں ہوتا اور جب اس کا استعمال کیا جاتا ہے تو امر نادر ہونے کی وجہ سے شعر اس زحاف کیساتھ اتنا اچھا نہیں معلوم ہوتا جتنا بغیر زحاف کے اور تسکین کے مختلف اعتباروں سے مختلف نام ہیں ان وجوہ سے فارسی کے بعض عروضیوں نے زحاف کی پہلی تعریف عربوں سے لے لی اور زحاف و علت کی طرف تغیرات کی تقسیم ہی نہیں کی جس کو محقق طوسی نے ان الفاظ میں

بیان کیا ہے "بعضے بجائے تغیر زحاف گویند۔ اور بعض عروضیوں نے خلیل بن احمد اور سکاکی کی رائے کی پابندی کی اور تغیر زحاف صرف تغیرات غیر لازم کا نام رکھا مگر چونکہ ان کی زبان میں تغیر غیر لازم صرف وہی تغیر تھے جن کے نہ لانے کی صورت میں شعر بہتر ہوتا ہے اس لئے انھوں نے یہ تعریف کی زحاف تغیرے را گویند کہ در بنا جائز بود و شعر بے آں نیکو تر بود۔ لہذا یہ تعریف خلیل اور سکاکی کی تعریفوں سے ماخوذ ہے اور اس کی نسبت یہ کہنا کہ عوام الناس میں موزون طبع ہونے کی وجہ سے یہ معنی پیدا ہوگئے ہیں ایک ایسا جرم ہے جو ہرگز قابل معافی نہیں ہو سکتا۔

پھر سید صاحب اپنے قول کی تصریح کے لئے یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے نغمہ بلائے گوش ہے

(اس شعر کو سن کر لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مصرع میں زحاف ہے یا جیسے مصرع "حور ان بہشتی را دوزخ بود اعراف" یہ سن کر کہہ دیتے ہیں کہ ٹوٹتا ہے) بیشک ان دونوں میں زحاف ہے پہلے کا صدر مطوی مسکن ہے اور اس میں زحاف تسکین ہے اور دوسرے مصرع کا حشو دوم شبق ہے اور یہ دونوں زحاف فارسی زبان کے مخصوص زحافوں میں ہیں جو عربی میں موجود نہیں ہیں مگر یہ اصطلاحی زحاف ہیں نہ عوام الناس کے پیدا کردہ اور فارسیوں کی یہ اصطلاح خلیل بن احمد اور سکاکی کی اصطلاح کے موافق ہے کیونکہ یہ حضرات تغیر غیر لازم کو زحاف کہتے ہیں اور یہ دونوں تغیر بھی تغیر غیر لازم ہیں۔ اس کے بعد سید صاحب تحریر کرتے ہیں (یہ دونوں معنی زحاف کے خلاف اصطلاح خلیل بن احمد ہیں) سید صاحب نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں نہ خلیل بن احمد کی کوئی عبارت نقل کی اور نہ کسی دوسری کتاب سے کوئی ایسی عبارت نقل کی جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ خلیل بن احمد نے زحاف کی ایسی تعریف کی ہے جو ان دونوں معنوں میں سے کسی پر نہیں صادق آتی اور کوئی دعویٰ بغیر ثبوت کے قابل تسلیم

نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہم نے یہ ثابت کردیا ہے کہ معنی دوم خلیل و سکاکی کے مذہب سے ماخوذ ہیں اب رہے معنی اول اُن کے متعلق اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ خلیل بن احمد نے بیان کئے ہوں اور ممکن ہے کسی اور عرب عروضی کے بیان کردہ ہوں۔

اس کے بعد سید صاحب معنی پنجم کو جو معیار الاشعار کی عبارت کے لحاظ سے تیسرے معنی ہیں اصطلاح عرب بتاتے ہیں اور اپنے اس دعوی کے ثبوت میں بھی کسی عربی عروض کی کتاب سے کوئی شاہد نہیں پیش کرتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جب اُن کو کوئی شاہد نہیں ملتا تو مجبوراً دعوے کی تعمیم ان الفاظ میں کرکے کہ بعض سبب خفیف کی تخصیص نہیں کرتے بلکہ مطلق سبب کہتے ہیں استشہاد میں عقد الفرید کی عبارت نقل کرتے ہیں اگر عقد الفرید کی عبارت دعوی عام کی شہادت میں پیش کیگئی ہے تو مسلم ہے کہ دعوی خاص ثابت نہیں ہوتا اور اگر دونوں دعوے ثابت کرنے کیلئے نقل کیگئی ہے تو پہلے دعوے پر استشہاد منطبق نہیں ہے

درحقیقت کسی فن کے تمام دقائق و نکات و اسرار اسوقت تک ذہن نشین نہیں ہوسکتے جبتک اُس فن کے حاصل کرنے کو اُستاد کامل الفن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جائے اور پڑھنے کے بعد اس کی تحقیقات میں عمر عزیز کا ایک حصہ نہ صرف کیا جائے۔ استعداد ادبی کی بنا پر مطالعہ کتب سے صرف سطحی معلومات حاصل ہوتے ہیں جو اس قسم کی اغلاط سے نہیں محفوظ رکھ سکتے۔

امید ہے کہ ہمارا یہ جواب امور متذکرہ تحریرات کے متعلق کافی و تشفی بخش ہوگا۔ فقط

محمد عبد الواسع صفا

پروفیسر دار العلوم سرکار عالی

اسلام اور اسکی برکتیں

از برہان الدین حسین صاحب متعلم جادر گھاٹ ہائی اسکول

آج سے چودہ سو سال قبل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں ظلمت اور جہالت کا کیسا تاریک پردہ پڑا ہوا تھا۔ تہذیب یونان وایران فنا ہوچکی تھی۔ تمدن رومہ کا جہاز ڈگمگا رہا تھا۔ حضرت مسیح کے دنیا سے زندہ اٹھا لئے جانیکے بعد عیسائیوں میں عام طور سے توحید کی بجائے تثلیث کی پوجا ہونے لگی تھی اور عیسائی راہب گناہوں اور بدکرداریوں کے مجسمے ہوگئے تھے۔ عرب کی حالت اور بھی بدتر تھی۔ یہاں کے بسنے والے درندوں سے کم نہ تھے۔ دختر کشی ان کی رسم اور قتل وغارت ان کا پیشہ تھا۔ رات دن جوا کھیلتے شراب پیتے۔ کوئی ستاروں کی پرستش کرتا کوئی بتوں کو پوجتا۔ بات بات پر لڑ بیٹھتے۔ فسادوں میں دن بسر کرتے اور یہ فساد ایسے بڑھ جاتے کہ ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں برسوں جنگ وجدال قائم رہتی۔ اب اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ہادی برحق پیدا ہو اور اس حالت کو بدل دے۔ ۶ صدی عیسوی میں مکہ محترمہ میں ایک آفتاب رسالت طلوع ہوا جس کی روشنی تمام عالم میں پھیل گئی اور ایسی پھیلی کہ تمام عالم منور ہوگیا۔ یہ آفتاب عالمتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی اور یہ روشنی مذہب اسلام۔

اس رسول برحق نے بتایا کہ دنیا کی پیدا کرنے والی ذات واحد ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ اس کو کسی نے جنا نہ اس نے کسی کو جنا۔ وہ بے عیب ہے

بے نیاز ہے۔ اگر عبادت کرو تو اسی کی کرو۔ اگر پرستش کے کوئی قابل ہے تو وہی ہے۔ اگر کسی سے ڈرو تو بس اسی سے ڈرو اور بھروسہ کرو تو اسی پر کرو۔ الغرض یہ اسی آواز کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی زمانہ میں تمام عرب میں توحید کا نعرہ گونج اٹھا۔ اسلام میں توحید کے بعد درستی اخلاق اور تحصیل علم ضروری چیز ہے اخلاق کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میری بعثت کی ایک وجہ درستی اخلاق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ جہالت میں عربوں کے اخلاق کیسے تھے اور اس تعلیم کے بعد کیسے بہتر اور وسیع ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ آپ کے خلق عظیم کا آئینہ تھے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم آہا یہ آواز تھی یا سحر سامری (ہم نہیں سمجھ سکتے) کہ مسلمان علم کے ایسے سیکھنے اور پھیلانے والے ہوئے کہ دنیا میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ آجکل دنیا میں سائنس کا زور ہے اور اس کی بدولت انسان کا قبضہ اقتدار زمین سے نکل کر ہوا اور پانی پر ہو گیا ہے حقیقت میں اگر کوئی زمانہ جاہلیت اور آنحضرتؐ کے زمانہ کے بعد کی تاریخ پڑھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جو اسوقت تہذیب انسانی پھیلی ہوئی ہے وہ تعلیم محمدی کی خوشہ چینی کی بدولت ہے۔ ہم اس کا جواب پروفیسر اسکاٹ کی زبانی دیں گے کیونکہ وہی بات بالکل صحیح ہوتی ہے جسکی شہادت غیر قوم والے دیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"عقل انسانی کی یہ آزادی اور تمدنی ترقی کی یہ ہمہ گیر تحریک مسیحی پادریوں کی رہین منت نہیں ہے۔ نہ حروب صلیبیہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے نہ واقعہ اصلاح کلیسا کا۔ مسیحیت کا بھی کوئی اس پر احسان نہیں کیونکہ مذہب عیسوی ہمیشہ حریت اور ترقی تمدن کا مخالف رہا ہے بلکہ اس ترقی کو اس فیاضانہ روش کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیئے جو خلفائے بنی امیہ نے اپنی عظیم الشان سلطنتوں

میں قائم کر رکھی تھی۔ وہ سلطنت جس کا تمدن قرون متوسط کے یورپ کا سرمایہ استعجاب تھا اور جس کے جلال اور جبروت سے یورپ کانپ اٹھتا تھا۔ اس امر میں ذرا بھی شک نہیں کہ زمانہ حال کی سائنس اپنے ہر ایک انکشاف اور تحقیقات کیلئے عربی دماغ کی ممنون ہے۔ ریگستان عرب کے صحرائی بدوؤں کی اطلاعات پر تشبیہوں کے لایعنی انبار سے کائنات کے مختلف اجزائے ترکیبی کے باہمی تعلقات کا علم اور نظام قدرت کے حیرت انگیز کرشموں کی رازداری نکل آئی۔ نجوم نے ترقی کرتے کرتے ہیئت کی صورت اختیار کر لی۔ زمین پر لکیریں کھینچکر غیب کے علم لگانیکا فن نشوونما پاکر جغرافیہ بن گیا۔ کیمیا کے تلاش کرنیوالے ہندسہ فن کمسٹری کے موجد بن گئے۔ سحر کی تقلب ماہیت فلسفہ طبیعیہ میں ہوگئی۔ یہ اصول کہ نظام عالم پابند قانون ہے مان لیا گیا۔ اپنے یورپین پیشروں پر ہر ایک امر میں مسلمانوں کو خصوصیت کیساتھ تفوق حاصل تھا۔ اور وہ یہ کہ رومن اور گاتھ قوم کا سنگ بنیاد محض جبر اور قوت تھا۔ لیکن بخلاف اسکے اسلامی حکومت تابع عقل تھی علمی تحقیقات کا شوق مسلمانوں میں جنون کے درجہ کو پہنچگیا تھا۔ حکومت کا ہر شعبہ۔ زندگی کا ہر ایک مشغلہ تعلیم کی ہر شاخ اس شوق کی جولان گاہ تھی شعر و سخن۔ ادب انشا کا چرچا اور تجربہ و مشاہدہ کے ذریعہ سے علمی تحقیقات کا مشغلہ آٹھ سو سال تک عربوں کی سب سے بڑی خصوصیت اور فرمانروایان اسلام کا سب سے نمایاں وصف رہا۔ زمانہ حال کی تہذیب کیلئے جس کے وجود میں آنیکا باعث ہی مسلمان ہیں۔ نہایت شرم کا مقام ہے کہ محض مذہبی تعصب کی بنا پر اس نے مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کر دیا اور کھلے دل سے انکی جلالت۔ قدرت عظمت کے معترف نہیں۔ یقینًا تمام دنیا کے لٹریچر میں حضرت محمدؐ کے اس قول سے زیادہ پاک اور لطیف خیال کسی مقولے میں نہ پایا جاسکے گا۔ (باقی آئندہ)

برہان الدین حسین

ثمرۃ الادب

خلیفہ منصور عباسی

از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم۔ اے پروفیسر دارالعلوم

عربوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر بہت ہی جلد ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔ مگر اس کا قیام اُسوقت تک ناممکن تھا جبتک کہ عرب اپنے قدیم اوضاع واطوار پر قائم تھے۔ خاندان بنو امیہ کو بہت سے سیاسی اور مذہبی تنازعات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ خود عرب تھے جو صحرائے عرب سے باہر آجانے کے بعد بھی اپنی پرانی خاندانی عادتوں اور قضیوں کو نہ بھولے تھے۔ صرف فرق یہ تھا کہ اب ان کی حمایت وحمیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا تھا بجائے چھوٹے چھوٹے قبایل کے وہ اب اپنے تمام رشتہ دار قبایل کی حمایت اور طرفداری پر آمادہ تھے۔ اگر ایک عامل یمنیوں پر مہربان ہوتا تھا تو بنو مضر یا تو کھلم کھلا اُس کے دشمن

ہو جاتے تھے یا پوشیدہ طور پر اس کی جڑیں کاٹا کرتے تھے۔ اگر ارکان دولت بنو قیس کی طرفداری کرتے تھے تو تمام بنو کلب ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تقریباً ہر ایک با اختیار شخص اپنے قبیلہ کے اُن جرموں اور لغزشوں کو نظر انداز کر دیتا تھا جن کے سبب سے وہ دوسروں کو بجا طور پر سخت سزا کا مورد قرار دیتا تھا۔ ان حالاتوں میں خلفاء بنو امیہ کو شامی عرب جیسے وفادار لوگوں کی خانہ جنگیوں کی روک تھام کرنا بہت دشوار تھا۔ ان کی سلطنت میں امن چین صرف اسی وقت حاصل ہوتا تھا جب عراق اور شام میں کوئی بہت زبردست اور طاقتور عامل یا خلیفہ تخت پر ہوتا تھا۔ کیونکہ شام ہی بنو امیہ کے عروج کا باعث تھا اس لئے اس کو ان کے خاندان سے ایک خاص قسم کا تعلق تھا۔ مگر تمام مشرقی مقبوضات کا نظم و نسق صرف عراق ہی سے اچھی طرح ہو سکتا تھا۔ ولید ثانی (۱۲۶ھ) کے ساتھ سلطنت کا امن و امان بھی رخصت ہو گیا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا اس کا خاتمہ آپس کی خانہ جنگیوں نے کر دیا۔

بنو امیہ کی خلافت کی جڑیں پہلے ہی شیعوں نے کھوکھلی کر دی تھیں۔ بنو علی اہل بیت ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو سلطنت کا اصلی حقدار اور دعویدار سمجھتے تھے اور انہیں لوگوں نے رعایا کے دلوں میں بنو امیہ کی طرف سے بغاوت اور نفرت کا بیج بویا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اہل بیت کے سلطنت پر قابض ہو جانے کے بعد دنیا فسق و فجور۔ ظلم و عناد سے پاک اور عدل و انصاف سے معمور ہو جائے گی۔ اِس کے علاوہ متدین لوگ بھی خلافت بنو امیہ کو پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ یہ محض خلافت ارضی تھی۔ اگرچہ بنو علی کی بغاوت خود انہیں کے سرگروہوں کی غلطی اور حماقت کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ مگر یہ ناکامی بھی بنو امیہ کے لئے نہایت خطرناک تھی اس نے بھی بنو امیہ کی

سلطنت کو کافی کمزور کردیا۔ کیونکہ بنو علی کا ہر فرد جو اس ناکام کوشش میں تلوار کے گھاٹ اترا لوگوں کی نظروں میں شہید ہوا جن کے خون کا انتقام لینا ضروری تھا۔

اس اثناء میں کہ بنو علی کی کوششوں کا خون ہو رہا تھا ایک اور خاندان نہایت خاموشی مگر تیزی کے ساتھ بنو علی کے ان سے کوششوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ لوگ بنو علی کے چچیرے بھائی بنو عباس تھے۔ یہ خاندان اپنے آپ کو آنحضرت (صلعم) کے چچا حضرت عباس کی طرف منسوب کرتا تھا۔ عبداللہ ابن عباسؓ مشہور محدث اور قرآن شریف کے سب سے پہلے مفسر تھے۔ انہیں عبداللہ ابن عباسؓ کا پوتا محمد ادریس کی اولاد و دوسیاسی امور میں نہایت ہوشیار ثابت ہوئے۔ یہ خاندان عامیوں سے دور حمیمہ نام ایک دور دراز قصبہ میں مقیم تھا۔ چونکہ یہ قصبہ شامی حجاج کے قافلوں کے راستے میں واقع تھا اس لیے وہاں سے اسلامی دنیا کے دور ترین مقامات کیساتھ بھی نامہ و پیام ممکن تھا یہاں سے بیٹھ کر انھوں نے نہایت ہوشیاری اور دور اندیشی کے ساتھ اپنے لئے جال پھیلانا شروع کیا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ ان کوششوں کے بارآور ہونے کا بہترین ذریعہ خراسان کا دور افتادہ صوبہ ہے۔ اس صوبہ کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد نے نہایت جوش و خروش سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ بلکہ اسلام کے جھنڈے کے نیچے اپنے ہم وطنوں کے خلاف لڑنے تک سے دریغ نہ کیا تھا۔ مگر ان ایرانی نومسلموں کو عرب فاتح ہمیشہ حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اور موالی[1] ہی سمجھتے رہے۔ اور

---

[1] اس زمانہ میں ایک عجمی نومسلموں کے لئے ضروری تھا کہ وہ خواہ کتنا ہی شریف اور باقتدار کیوں نہ ہو کسی عرب قبیلے کے سایۂ عاطفت میں آ جائے۔ ایسے شخص کو مولا

ان کو وہ حقوق نہ دیتے تھے جو ان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے مل جانے چاہئیں تھے۔ اس کے علاوہ اسی صوبے میں عربوں کی خانہ جنگیوں کا زیادہ زور تھا۔ ایرانیوں کے نزدیک بنو مضر یا یمنی یا ربیعی اقتدار یکساں تھا۔ مگر وہ لوگ اپنے ملک کی تباہی اور اپنی غلامی کو محسوس کر رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی نو مسلم اپنے عرب مسلمان بھائیوں سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔ جس کا اثر تمام تر بنو امیہ پر پڑا۔ کیونکہ اس وقت انہیں کو تمام الحاد۔ بدنظمی اور برائی کا منبع خیال کیا جاتا تھا۔ اور ان کی دنیوی حالت دینداروں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ ایرانی ہاشمی خاندان کے نام پر مٹے ہوئے۔ اور ان روحانی پیشواؤں پر جان تک قربان کر دینے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس کو قبول کر لیا کہ "اہل بیت" ہی خلافت اور سلطنت کے اہل ہیں۔ بنو عباس کے داعیوں نے بھی اس امر میں ان سے ہمدردی ظاہر کی اور طرح طرح کی غلط اور دور از کار احادیث بنو ہاشم یا "اہل بیت" کے لئے جس سے عام طور پر بنو علی مراد لئے جاتے تھے کوشش جاری رکھی۔ رفتہ رفتہ بنو عباسؓ نے بنو علی کو برطرف کر کے خود ان کی جگہ لے لی۔ بنو عباس کے "اہل بیت" یا ہاشمی ہونے میں کس کو انکار ہو سکتا تھا۔ اور خاصکر اس حالت میں جبکہ بنو علی کی نسبت یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ لڑکی (یعنے آنحضرت صلعم کی صاحبزادی) کی اولاد ہونے کی وجہ سے سلطنت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔* (نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۵ پر)

(بقیہ نوٹ صفحہ (۳))

کہتے تھے۔ اس حالت میں یہ اپنے نام کیساتھ ایک اور نام لگانے کا مختار ہو سکتا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تعلق فلاں عرب قبیلہ سے ہے۔ (x)

اصلی بات یہ تھی کہ خراسانی بغیر سوچے سمجھے ان داعیوں کے کہنے پر چلنے لگے جن کا لازمی اثر اور نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر ان داعیوں نے جس طرح چاہا اُن کو چلایا اور جس طرف چاہا اُن کو پھیر دیا۔ طرفدار پیدا کرتے وقت اس بات کی مُطلق پرواہ نہ کی گئی کہ وہ کس مذہب اور کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سازش وشورش کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ سازش نہایت گہری تھی۔ داعیوں کا انتظام اور سلسلہ مکمل تھا اور ہر وقت خراسان سے سازش کے مرکزوں کیساتھ نامہ وپیام جاری رہتا تھا۔ یہ مرکز اول تو کوفہ ہی میں تھا جہاں ان داعیوں کا سرگروہ رہتا تھا اور دوسرا حمیمہ تھا جو بنو عباس کا مسکن تھا۔ ایام حج خاص کر اس سازش کیلئے نہایت اہم تھے۔ کیونکہ اس وقت بغیر کسی رکاوٹ اور شبہ کے یہ لوگ ایک دوسرے سے مل جل سکتے تھے اور آیندہ کیلئے اپنی سازش کے منصوبوں کو مضبوط کر کے تجاویز سوچ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ مشورے زیادہ تر مکہ ہی میں ہوتے ہوں۔ یہ تمام کارروائی مدت تک جاری رہی آخرکار بنو عباس کے خاندان کے بزرگ یعنی محمد جس کا انتقال ۷۴۳ء میں ہوا یا ابراہیم نے اس شخص کو ڈھونڈ نکالا جو اس کی تکمیل بوجہ احسن کر سکتا تھا۔ یہ شخص ابو مسلم خراسانی ایک آزاد شدہ غلام تھا جس کے وطن اور خاندان کا کچھ پتہ نہیں مگر وہ عرب کی نسل سے نہ تھا۔ اس شخص میں ایک مفسد کی بے باکی اور طریق ادب کے انتخاب میں عاقبت اندیشی۔ اور ایک سپہ سالار بلکہ ایک شہنشاہ کی طاقت اور دوربینی یکجا جمع تھیں۔ چند ہی سال

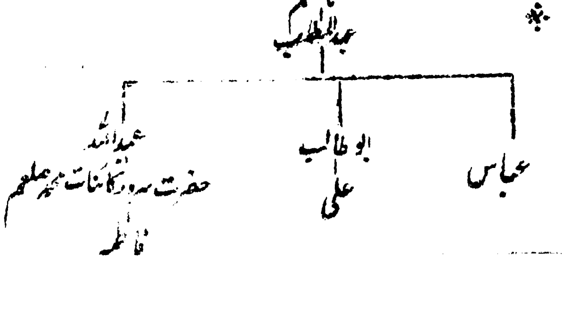

عرصہ میں اس نے یہاں تک کیا کہ عباسی سیاہ جھنڈا کھلم کھلا لہرانے لگا۔ اس کے علاوہ وہ یہ چال چلا کہ اس نے ان عربوں کو جو ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے اکسایا۔ اگرچہ نصر (جو حاکم تھا) اور تمام لوگوں کو اچھی طرح علم تھا کہ اس سے نہ صرف عربوں کی عظمت بلکہ ان کی جانوں کا بھی خطرہ ہے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ ابراہیم نے ابومسلم کو حکم دیا تھا کہ خراسان میں کوئی عرب زندہ نہ رہنے پائے۔ چنانچہ جلد ہی نصر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد نومبر ۷۴۸ء میں مر گیا۔ خراسانیوں کا سیلاب ابومسلم کی سرگردگی میں برابر آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ مگر ابومسلم خود خراسان ہی میں مقیم رہا۔ ایرانیوں کے علاوہ عربوں نے بھی اپنی عادت کے خلاف اس غلام کی ماتحتی میں آنا قبول کر لیا اس میں شک نہیں کہ خراسان کے عربوں کی رگوں میں ایرانی خون سرایت کر چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بہت سی ایرانی باتیں اختیار کر لی تھیں۔

اس عرصہ میں ایک ہاشمی عبداللہ بن معاویہ نے جو حضرت علیؓ کے بھائی جعفر کی اولاد میں سے تھا، عباسیوں کی مدد سے جنوبی ایران کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر جلدی ہی اموی مروان ثانی کے جرنیلوں نے اس پر غلبہ پایا۔ عبداللہ بھاگ گیا اور ابومسلم کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اس شخص نے سلطنت میں فساد اور بدنظمی کی جڑیں اور مضبوط کر دیں اور لوگوں کو اہل بیت کی طرف متوجہ کر دیا۔ ابومسلم نے اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو تباہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔ چنانچہ اس نے اس کو قید کر کے مروا ڈالا۔

سلطنت کے سب سے بڑے اور اہم صوبہ عراق میں عباسی افواج کا دور دورہ تھا جس مقام پر سکندر اعظم نے دارا کی افواج کو شکست دی تھی اسی جگہ ایک اور عظیم الشان معرکہ ہوا۔ بنوامیہ کی فوج کا جزو غالب یمنی قبایل کے عرب تھے

یہ لوگ اس بات پر راضی نہ تھے کہ اپنی جانوں کو مروان کی طرفداری میں ضایع کریں۔ کیونکہ مروان کبھی ان سے اچھی طرح پیش نہ آتا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ مروان کی طرف سے نہ لڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مروان کو شکست فاش ہوئی۔ مزید برآں شام اور مصر میں خانگی تنازعات نے ظہور کیا جس سے بنو عباس کی فوج کا کام بہت ہلکا ہو گیا۔ مروان جیسا آزمودہ کار سپاہی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا پھرتا تھا۔ آخر کار وسط مصر کے شہر بوسیر میں بے یار و مددگار مارا گیا (اگست ۷۵۰ء)

بنو عباس کا سردار اب ابراہیم نہ تھا کیونکہ جب مروان کو معلوم ہوا کہ وہ ابو مسلم کا شریک و ہم خیال ہے تو اس نے اس کو قید خانہ میں بند کر دیا تھا جہاں وہ اپنی فوج کی کامیابی سے تھوڑی دیر پیشتر مر گیا یا مار ڈالا گیا۔ اس کے بھائی کوفہ بھاگ گئے اور وہاں روپوش ہو گئے۔ خراسانیوں کا شہر کو فتح کرنا اور مروان کا شکست فاش پانا تھا کہ ابو العباس کہ جو اس وقت تمام خاندان کا بزرگ تھا خلیفہ مشتہر کر دیا گیا (نومبر یا دسمبر ۷۴۹ء)۔ جامع مسجد میں افتتاحیہ خطبے کے موقع پر اس نے سفاح کا لقب اختیار کیا جس کو اس نے بعد میں سچ کر دکھایا۔ خاندان بنو امیہ کے تمام لوگ نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کئے گئے۔ بنو امیہ کی تلواروں کے مقتول بنو ہاشم کے خون کا انتقام اس کا خاص مقصد تھا۔ یہ ممکن ہے کہ بنو عباس جو خود عرب تھے اس معاملے میں عربی احساسات رکھتے ہوں۔ اور لہٰذا وہ اپنے مقتول رشتہ داروں کا بدلہ چاہتے ہوں۔ مگر اصلی مقصد اور منشا یہ نہ تھا۔ اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ کہ کسی طرح بنی امیہ کو ملحد اور قابل گردن زدنی ظاہر کر کے عامیوں کو ان کے خلاف بھڑکایا جائے۔ اور اس طرح اپنے خاندان کو ہر قسم کے خطرہ و خدشہ

سے محفوظ رکھا جائے۔ اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے میں انہوں نے کوئی تشدد و بے رحمی نہ اٹھا رکھی۔ مفتوح خاندان کے وہ لوگ جو فاتحین کے ہاں پناہ گزیں ہوئے تھے اور جنہوں نے صرف حفظ جان کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیئے تھے سب قتل کر دیئے گئے۔ تمام خاندان بنو عباس یہاں تک کہ خود خلیفہ اس کے چچا اور خاصکر عبداللہ جو منہزم مروان کی تعاقب کرنیوالی فوج کا سردار تھا۔ غرض سب نے اس قتل عام کو اطمینان کی نظر سے دیکھا۔ حالانکہ یہ وہی عبداللہ تھا جو چند لمحہ بیشتر ہی رحم آزما ہو چکا تھا جب کہ وہ جعفریوں کی بغاوت میں مروان کے جرنیلوں کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اس عالمگیر قتل عام کے باوجود بھی بنو امیہ کے چند آدمی بھاگ نکلے۔ ان میں بعض تو روپوش رہے جو رفتہ رفتہ یا تو نظر انداز کر دیئے گئے یا معاف کر دیئے گئے اور بعض مغرب کی طرف دور دراز مقامات میں جہاں خلیفہ کی حکومت نہ تھی چلے گئے۔ بنو عباس کی خلافت کے استحکام کیوقت رعایا میں ہیبت اور رعب پھیلانے کی غرض سے یا اس لئے کہ نیا خلیفہ اپنی فاتح فوج کی خونریزی کی آگ نہ بجھا سکا صرف بنو امیہ ہی کا خون نہیں گرایا گیا بلکہ شام نے بھی بغیر جھگڑے فساد کے اس نئے خلیفہ کی اطاعت نہ کی۔ شروع ہی میں فاتحین کو مختلف بدامنیوں اور فسادوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ اس بغاوت کا فرو کرنا آسان کام نہ تھا جو بنو امیہ کے پہلے دو خلفاء کے خاندان کے ایک شخص ابو محمد کی سرگردگی میں ہوئی۔

مروان کے انتقال کے چند ہی دن بعد اس کے طاقتور مددگار ابن ہبیرۃ نے دریائے دجلہ کے کنارے کے شہر واسط پر قبضہ کر لیا۔ مگر جلد ہی خلیفہ کے بھائی منصور نے مدت تک اس کو محصور رکھا۔ لہذا وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان دونوں بھائیوں نے اس سے نہ صرف حفظ جان کا وعدہ

کیا تھا۔ بلکہ یہ بھی اقرار کیا تھا کہ اس کو اس کی جگہ برقرار رکھیں گے۔ مگر ایسے شخص کا حاکم رہنا جس کے بہت سے طرفدار تھے اور جس نے عراق کی حکومت میں اپنی خودمختاری کا حق ثابت کر دیا تھا نئے حالات میں کسی طرح مناسب نہ تھا۔ چنانچہ منصور نے اپنے بھائی کے مشورے سے اس کو قتل کیا۔ افسوس! ان کے نزدیک حتمی وعدہ اور شرعی قسمیں بالکل لایعنی ثابت ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تمام کارروائی ابومسلم کے مشورے سے ہوئی۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ ابومسلم بنوہاشم کے وزیر ابوسلمہ کے برطرف کرنے میں ممد کار ہو۔ کیونکہ یہ وہی ابوسلمہ تھا جس نے اس تحریک کو عراق سے خراسان میں منتقل کیا تھا اور جس نے حکومت کی تبدیلی میں کارہائے نمایاں کئے تھے۔ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ابراہیم کی وفات کے بعد اس کا رجحان بنوعباس کی نسبت بنوعلی کی طرف زیادہ ہو گیا تھا۔ بہرحال وہ ابومسلم کے لئے سدراہ تھا۔

سفاح ایک بہت بڑا زبردست حاکم معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو سلطنت کو تمام باتیں حاصل ہو جاتیں جو اس کو اس کی جانشینی کی بدولت حاصل ہوئیں۔ خلافت بنوعباس اور خلافت بنوامیہ میں جلد ہی فرق ظاہر ہو گیا۔ اس کا سبب کچھ تو ان دونوں خلافتوں کا طریق استحکام اور کچھ ان کے خلفاء کی ذاتی خصوصیات ہوئیں۔ بنوعباس نے اپنا دارالخلافہ عراق میں منتقل کیا جو کہ خلافت کا اصلی مرکز تھا۔ خلیفہ کی طاقت کا انحصار زیادہ تر ایرانی سپاہیوں پر تھا جو عربوں کی نسبت قواعد و ضوابط کے زیادہ پابند ہوتے تھے۔ خلیفہ قبائل کے باہمی بغض و عناد اور خانہ جنگیوں سے بے پرواہ ہو گیا۔ اگرچہ اس کو کبھی کبھی اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں انکی ضرورت ہوتی تھی۔ اب وہ خلفاء سلف کی نسبت زیادہ خودمختار ہو گیا

اور سلطنت کے مختلف صوبجات پر پہلے کی نسبت زیادہ سیاسی رنگ چڑھ گیا۔ الغرض اس مقام پر جہاں قدیم ایشیائی سلطنتیں پھلی پھولیں ایک اور حکومت کی بنیاد پڑی جو آدھی عرب اور آدھی ایرانی تھی۔

سفاح کی عین حیات ہی میں منصور ایک زبردست صلاح کار اور بڑے بڑے صوبوں کا حاکم رہا تھا۔ مگر یہ امر زرا مشتبہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بالکل اپنے بھائی کے ہاتھ میں دے دیا ہو۔

ابومسلم نے جس کی طرفداری لوگ اندھا دھند کرتے تھے خراسان میں ایک بادشاہ کی طرح حکومت کر رہا تھا ۷۵۳ء میں حج کے موقع پر حجاج کی سرداری کا مطالبہ کیا یعنی اسلامی دنیا کے سامنے خلیفہ کی نیابت کی خواہش ظاہر کی سفاح نے منصور کو اس اعزاز کے حاصل کرنے کے واسطے اکسایا۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ یہ اعزاز پہلے ہی منصور کو عطا ہو چکا ہے لہذا اب ابومسلم صرف منصور کے ساتھی کے طور پر اس کے ساتھ جا سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابومسلم جو اس نئی سلطنت کا گویا بانی تھا اور خلیفہ کے بھائی منصور میں ایام حج میں کچھ جھگڑا ہو گیا مگر ابومسلم ہمیشہ خلیفہ کا خادم ہی رہا۔ اس نے اپنی جود و عطا سے بدوؤں کو اپنی طرف کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسے شخص کو عربوں کا دشمن کہنا مبنی علی العداوۃ ہے۔ یہ منصور اور ابومسلم سفر حج سے واپس آئے تھے کہ ان کو خبر ملی کہ سفاح نے ۹ جون بروز یکشنبہ ۷۵۴ء کو انبار میں انتقال کیا اور یہ کہ منصور اس کی جگہ اسی دن خلیفہ بنا دیا گیا۔

ابوجعفر عبداللہ منصور کی عمر اس وقت چالیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی وہ دبلا۔ پتلا لمبا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ لمبا تھا اور رنگ گندمی۔ اس کے بال نازک تھے اور خشخشی ڈاڑھی تھی۔ اس کی ماں ایک بربری لونڈی تھی۔ کہتے ہیں

کہ جب وہ حاملہ تھی۔ اس نے ایک خواب دیکھا تھا کہ اس نے ایک شیر جنا ہے۔
فی الواقع نومولود ایک شیر ہی تھا جس نے تمام اُن لوگوں کو جنہوں نے اس کو
شہنشاہ تسلیم نہ کیا چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

منصور مشکل سے دریائے فرات کے قریب پہنچا ہوگا کہ اس کو معلوم ہوا کہ ابھی
اس کو ایک بہت بڑے خطرناک دشمن سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے چچا عبداللہ
نے جو شام کی طرف بازنطینیوں کے خلاف مقرر تھا تخت و تاج کا دعویٰ کیا۔ اُس کا
دعویٰ بالکل بے بنیاد نہ تھا۔ کیونکہ یہ امر اتنا یقینی نہیں جتنا کہ بیان کیا جاتا ہے
کہ سفاح نے منصور ہی کو خلیفہ نامزد کیا تھا۔ یہ سلطنت کی بدقسمتی تھی کہ مستحکم ہونے
سے پیشتر ہی جانشینی کے متعلق جھگڑوں کی بدولت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ چونکہ
ابو مسلم منصور کی خراسانی فوج کے ساتھ تھا اس لئے عبداللہ کو مجبوراً شام اور
عراق اور عرب کی فوج پر بھروسہ کرنا پڑا۔ اور اسی سبب سے اس نے ہزاروں خراسانیوں
کا قتل عام کیا۔ عرب جرنیل قحطبہ کا بیٹا حمید جس نے پانچ سال قبل خراسانیوں کو فتح پر
فتح دلوائیں یکبارگی عبداللہ سے علیحدہ ہو کر منصور سے جا ملا۔ اور اس ہی کیسا
اُس نے اس جنگ میں اور آئندہ جنگوں میں کارہائے نمایاں کئے۔ چند ماہ کی
جنگ کے بعد آخر ۲۶ یا ۲۷ نومبر ۷۵۴ء کو ابو مسلم نے عراق عرب میں نمایاں
فتح حاصل کی جس سے جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ عبداللہ نے بھاگ کر اپنے بھائی

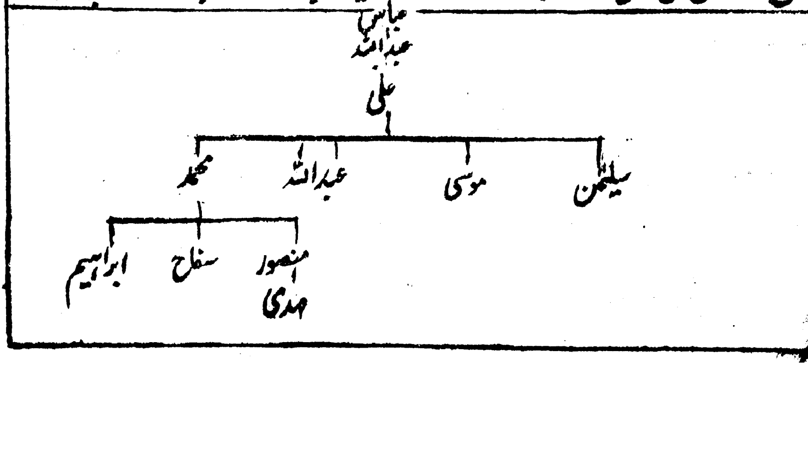

سلیمان کے ہاں پناہ لی جہاں وہ کچھ عرصہ تک روپوش رہا۔

ابومسلم نے نہ صرف خلافت عباسی کو مستحکم کیا بلکہ منصور کو بھی تخت پر مستحکم کر دیا۔ ایسا شخص جس نے اتنا کچھ کیا اور جو بہت کچھ کرسکتا تھا یقیناً اپنے آقا کیلئے باعث خطرہ تھا۔ اسی خیال سے منصور نے اس کو الگ کرنا چاہا۔ کہتے ہیں کہ یہ خیال سفاح کو بھی آیا تھا۔ ابومسلم اور منصور کے سب سے پہلے تنازع کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ خلیفہ نے ابومسلم کو شام اور مصر کے مغربی صوبوں کا حاکم مقرر کیا تاکہ اُس کو خراسان سے جو اُس کی طاقت کا سرچشمہ تھا الگ کر دے۔ ابومسلم اس بات کو تاڑ گیا۔ اور اس پر راضی نہ ہوا۔ اب اُس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ خلیفہ اس کی طاقت اور قدرت کو توڑنا چاہتا ہے۔ لہذا اب اس نے منصور کو مطلع کئے بغیر خراسان کی طرف مراجعت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ گو اپنے سپاہیوں پر پورا اعتماد تھا۔ خواہ وہ خلیفہ ہی کے ساتھ جنگ کرے۔ اس موقع پر ان دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر کار ابومسلم منصور کے وعدوں کے دھوکے میں آگیا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ چند آدمی لے کر خلیفہ سے بلد الروم پر ملنے آیا۔ منصور نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اور اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل کروایا اور اس کی لاش دریائے دجلہ میں پھکوا دی (فروری ۷۵۵ء)

ایسے طاقتور شخص کا الگ کرنا جس کے طرفدار اُس کے لئے جان تک قربان کرنے کے لئے تیار تھے اور جس کی خیر خواہی پر خلیفہ مشکل سے بھروسہ کرسکتا تھا سیاسی ضروریات سے تھا۔ کہتے ہیں کہ منصور کے ایک دوست نے ابومسلم کے خلاف قرآن شریف کی یہ آیتہ " لو کان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا" پڑھی تھی

منصور جیسا خلیفہ اس کو ہرگز گوارا نہ کرسکتا تھا کہ اس کی خلافت میں کوئی اس کا مدمقابل ہو یا ابومسلم کے دردناک انجام پر کسی کو رحم کے آنسو نہ بہانے چاہئیں کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس نے کوئی ظلم و تشدد۔ مکر و فریب نہ چھوڑا تھا جو اپنے دشمنوں کے دشمنوں کے لئے استعمال نہ کیا ہو۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً چھ لاکھ (اس میں شک نہیں کہ یہ عدد مبالغہ سے خالی نہیں) قیدیوں کو تہ تیغ کیا۔ منصور نے اس مکار شخص کو قتل کرنے میں اپنی عقل و فراست کا ثبوت دیا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا یہ طرز عمل اچھا نہ تھا۔

ابومسلم کا قتل منصور کے لئے بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ابومسلم کی فوج تو کسی قسم کا فساد نہ کرنے پائی کیونکہ کچھ تو اس قتل کی اچانک خبر نے ان کے حواس کو مختل کر دیا۔ اور کچھ روپیہ تقسیم کرنے سے ان کی تسلی ہو گئی۔ مگر خراسان میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ وہاں پر اس کے ہزاروں طرفداروں کو اس سے تعلق مذہبی تھا۔ فی الواقع وہاں بہت سے لوگ اس کی وفات پر یقین نہ کرتے تھے۔ ان کو امید بلکہ یقین تھا کہ وہ دوبارہ مسیح کی شکل میں ظہور کرے گا۔ اسی سال سمباذ نامی ایک ایرانی نے خراسان میں ابومسلم کے خون کا انتقام لینے کیلئے لوگوں کو بغاوت پر ابھارا۔ اس شخص کے متعلق یہ روایت کہ وہ قدیم ایرانی مذہب کا عالم تھا بالکل بعید از قیاس ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کا تعلق ان نیم ایرانی فرقوں سے ہو جن کو اکثر لوگ مسلمان ہی خیال کرتے تھے۔ بہرحال سمباذ کی تحریک نے عام طور پر اثر کیا۔ چنانچہ وہ فاتحانہ میڈیا کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ منصور نے جہور کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا جس نے سمباذ کو شکست دی اور اس کو قتل کر دیا۔ اس فاتح جرنیل نے ابومسلم کے خزانوں پر قبضہ کیا اور خود بغاوت کا علم بلند کیا مگر جلد ہی مغلوب ہو کر ۱۳۸ھ/۷۵۵ء یا ۱۳۹ھ/۷۵۶ء میں مارا گیا۔ اس طرح خراسان پھر خلیفہ کے

ہاتھ میں مستقل طور پر آگیا۔

دیگر اطراف نے بھی خراسان کی تقلید کی۔ چنانچہ منصور کو مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خارجی جو اہل بیت کی حکومت کو بنو امیہ کی حکومت سے زیادہ منصف اور احکام الٰہی کے مطابق خیال کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے اس خیال پر ملک کے مختلف مقامات میں خلیفہ کی فوج سے برسرپیکار ہوئے۔ اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر حوصلہ اس قدر رکھتے تھے کہ سوائے موت کے اور کوئی قوت اُن کو اس خیال سے ہٹانے والی نہ تھی۔ چنانچہ ملبد نامی ایک خارجی نے عراق عرب میں خلیفہ کی فوج کا ناک میں دم کر دیا۔ اگرچہ آخر کار منصور کے لائق ترین سپہ سالار ہاظم نے اس کو ۱۳۸ھ میں شکست دیدی۔

۱۳۸ھ اور ۱۴۱ھ میں چند آدمیوں کے ایک گروہ نے خلیفہ کا ناطقہ بند کر دیا۔ ابومسلم کے طرفداروں میں سے راوندی بھی تھے۔ یہ لوگ نہ صرف مسئلہ تناسخ پر اعتقاد رکھتے تھے بلکہ منصور کو خدا بھی مانتے تھے۔ چنانچہ یہ اکٹھے ہو کر دارالخلافہ کی طرف آئے اور خلیفہ کے محل کے ارد گرد آ کر عبادت کرنے کے طریق سے جمع ہو گئے۔ منصور کا خیال تھا کہ اس کی رعایا کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اس اطاعت کی وجہ سے دوزخ کی آگ میں جلیں نہ کہ اس کی نافرمانی کی وجہ سے جنت میں آرام کریں۔ امیرالمومنین کو راوندیوں کا یہ طرز عمل کب گوارا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس سے تمام مسلمانوں کے برخلاف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی خیال سے اُس نے ان جوشیلوں میں سے چند ایک کو قید کر لیا مگر راوندی اس سے اور بھی بگڑ گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو قید سے آزاد کرا لیا اور خلیفہ کی جان کے درپے ہوئے۔ خلیفہ کے پاس اُس وقت چند ہی آدمی تھے۔ مگر پھر بھی اُس نے نہایت بہادری سے ان کا مقابلہ کیا اور ان پر غلبہ پایا۔ اس لڑائی میں ایک شخص خاص طور پر قابل بیان ہے۔ یہ بنو امیہ کے زمانہ میں ایک نامدار جرنیل تھا۔ مگر بعد میں اس نے کنج گمنامی اختیار کر لی تھی۔ اس لڑائی کو اس نے

خلیفہ کی نظروں میں عزت پانے کا اچھا ذریعہ خیال کیا۔ اس بظاہر اجنبی شخص کا نام معن بن زائدہ تھا جو اپنی شجاعت و سخاوت کے لئے مشہور تھا۔ اور جو اپنے دشمنوں سے سخت بیرحمی اور سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ خالص الاصل عربوں اور نیم عرب اور نیم ایرانی جرنیلوں کو یکجا جمع کرنا منصور کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اسی لحاظ سے اس نے معن بن زائدہ کو اپنے ہاں عزت دی۔ کچھ دنوں بعد اس کو یمن بھیجدیا جہاں اس نے اپنی نو سالہ حکومت میں تمام دشمنوں کو سخت خونریزی کے بعد پامال کیا۔ اس کے بعد وہ جنوب مشرقی ایران کی طرف بھیجا گیا۔ جہاں اس کو خارجیوں نے گھیر کر قتل کر دیا۔ (باقی آئندہ) (محمد جمیل الرحمٰن)

ثمرۃ الادب

(از خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب)

ذیل میں ایک مشہور انشاپرداز کا مضمون ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جنہوں نے ہمارے رسالہ کا خیر مقدم اس مضمون سے کیا ہے جس کیلئے ہم مضمون نگار کے نہایت ممنون ہیں۔ (ایڈیٹر)

ادب تاجیست از لطف الٰہی بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی

ہر شجر جو مثمر ہوتا ہے تقریباً ایک ہی قسم کے ثمر دیتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات ایک ہی شجر کے ثمرات میں باعتبار مزہ۔ رنگت۔ قد و قامت کچھ کچھ فرق ہوتا ہے مگر عموماً ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔

شجر ادب کے ثمرات باوجود ایک ہی قسم کے شجر ہونے کے مختلف ہوتے ہیں لذت میں بھی مزاج میں بھی اثر میں بھی۔ پائیداری میں بھی اور انجام میں بھی گویہ شجر باعتبار مختلف نوعیتوں کے یکشکل بار آور ہوتا ہے۔ مگر ہر شخص کی یہ

خواہش رہتی ہے کہ اس کا گھر اس شجر خوش آیند ثمر بخش سے خالی نہ رہے۔
جب کوئی لڑکا۔ بچہ۔ نوجوان ملنے جلنے بات چیت کرنے میں سلجھا ہوا ملتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہ بچہ کیسا ادیب کیسا مودب ہے۔ ادھر یہ اور دوسری طرف یہ کہ ادب سے مراد اندازہ اور حد ہر چیز کی بھی لیتے ہیں اور یہ معنی دانش اور فراست کے بھی آتا ہے۔ اور علمی رنگت میں ادب سے مراد وہ علوم ہیں جو شامل صرف و نحو۔ معانی۔ بیان وغیرہ وغیرہ ہیں۔
دیکھو تو یہی شجر ادب کے ثمرات کس قدر مختلف الذات ہوتے ہیں اور مختلف الانواع و اقسام جو لوگ علمی رنگت میں ادیب ہیں وہ سلک ادبا میں منسلک ہیں اور جو لوگ عملی رنگ میں شعبہ اخلاقیات میں کمال رکھتے ہیں وہ بھی ادیب ہیں۔
جو شعر عنوان کے نیچے لکھا گیا ہے اُس میں شاعر کہتا ہے کہ۔
"ادب ایک ایسا تاج ہے جو لطف اور کرامات وہبی کے تحت ہستی پذیر ہوتا ہے وہ ایک ایسا تاج ہے کہ اُسے ہر شخص پہن کر ہر موقعہ اور ہر جگہ پر جا سکتا ہے جس کے سر یہ تاج ہوتا ہے اُسے ایک قسم کی عزت اور شہرت حاصل ہوتی ہے اور لوگ اس سے جداگانہ رنگوں میں مستفید اور مستفیض ہوتے ہیں یہ بھی گویا من جملہ ثمرات ادب کے ایک ثمرہ ہے۔ ماں باپ ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں لیکن انکی اولاد اور ذریات ہمیشہ مختلف رنگ اور مختلف اعتبارات رکھتی ہے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

سمجھ لو کہ ادب ایک شجر ہے۔ کیسا شجر جو از حد خوشگوار اور خوش آئند ہے جیسے اس کی ٹہنیاں مختلف ہیں ایسے ہی اس کی ہر ٹہنی کو ایک جداگانہ لذت و مزہ کا پھل بھی لگتا ہے۔ وہ لوگ شجر ادب کے ثمرات سے پورے طور پر

مستفید نہیں ہو سکتے جو اُس کے ثمرات میں تمیز نہیں کرتے۔

یہ جو صرف و نحو اور بدیع و معانی کو ادب سے خاص کر دیا گیا ہے میری رائے میں یہ ایک تنگ خیالی ہے۔ یہ تمام علوم و فنون دراصل علمی زندگی کے مبتدیات ہیں یا چند ابتدائی صورتیں ہیں ادبیات میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو اخیر تک اس سلسلہ میں زیر بحث رہتی ہیں جب وہ بچہ بھی مودب شمار ہوتا ہے جو کبھی کبھی جھک کر سلام اور بندگی کر لیتا ہے تو کیوں وہ لوگ اس میں سے نکل سکتے ہیں جو دوسرے رنگوں کے حضور علم و فنون میں زانوئے ادب تہ کرتے اور سرِ تسلیم جھکاتے ہیں۔ فلسفہ بھی ادب میں داخل ہے اور سائنس بھی تاریخ بھی اور دیگر علوم و فنون بھی صرف نحو اور بدیع معانی تو باقی کے علوم اور فنون کی حجابیات ہیں صرف اُن یہی ہے جو سر ختم کر دیں یا پیٹ دیں ایک جلد باری ہے ثمرۃ الادب اگرچہ بلحاظ رنگ و لذت مختلف ہیں اور اُن کی نوعیت بھی جدا جدا ہے مگر ہمیں جو کچھ اس سلسلہ میں علمی اور عملی پہلو سے حاصل ہو رہا ہے یا ہو گا وہ سب ثمرۂ ادب ہی ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ثمرۃ الادب ہے تو اس کا مطلب ہمیشہ یہ ہو گا کہ ہر رنگ اور ہر نوع میں ہی باعتبار جداگانہ کسی وقت وہ ثمرہ ادب ہو گا۔ سب سے پہلا اس دہریا اس سلسلہ میں ثمرۃ الادب کیا ہے اپنی ہستی کا جاننا اور اس کا مطالعہ کرنا جو شخص اس سے ناآشنا یا نابلد ہے وہ اگر نمائشی ادب سے واقف و ماہر ہوا بھی تو کیا ہوا۔

صرف و نحو و بدیع و معانی کے اگر چار باب دیکھ لے یا سمجھ لے تو کیا دیکھا اور کیا سمجھا ادب کا پہلا ثمرہ تو یہی تھا اور وہ بھی گندہ ہو کر گر گیا۔

پڑیں پتھر سمجھ پر جس نے یہ سمجھا

ایک طالب علم کتاب تو سمجھتا ہے اُسے حفظ اور یاد بھی کر لیتا ہے لیکن نہیں سمجھتا کہ وہ کون ہے اور اس کی خلقت کی غرض و غایت کیا ہے اس حالت میں اس کی سمجھ کیا کچھ وسعت رکھے گی بے شک بہت سے لوگ اخیر تک اس مرحلہ سے ناواقف ہوتے ہیں مگر یہ اُن کا تو ذکر نہیں یہ تو اُن کا ذکر ہے جو ثمرۃ الادب پڑھتے ہیں اور جنہیں اس پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(یہ سمجھو تم کہ کیا سمجھے)

ہر طالب علم کا پہلا فرض کیا ہے یہ کہ اس کے دل و دماغ میں غیرت اور حمیت اور خودداری پیدا ہو اور ثمرۃ الادب کی غرض و غایت اس کے صفحہ دماغ پر منقوش ہو کر رہے۔ جو طالب علم خوددار اور باغیرت نہیں ہے وہ لاکھ ادیب ہو لاکھ مودب ہو اُسے کون صحیح معنوں میں ادیب اور مودب کہے گا۔ دُنیا میں غیرت اور خودداری ہی سے عزت و احترام کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں لوگ صرف ونحو بدیع و معانی منطق و فلسفہ پڑھ کر اس ثمرۂ ادب سے بیگانہ رہتے ہیں جو دراصل ایک لذیذ اور قیمتی ثمرہ ہے اور جو ثمرۃ الثمرات ہے اچھی پڑھے ادیب ہو گیا نہ دیکھ عدیم المثیل دعویٰ اس کا فائدہ کیا جب تمہارے دل و دماغ میں غیرت اور خودداری کا مادہ موجود نہیں ہے مضمون کے میوے اور فروٹ کھاؤ جب اُن کا دل اور دماغ اور جسم پر اچھا اثر نہیں تو اُن کے کھانے کا سوائے اس کے اور کیا فائدہ اور اثر ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد فضلہ بن کر خارج ہو جاوے۔

وہ غذا کیا ہے جو فضلہ ہی بنے
وہ دوا کیا ہے نہ ہو جس میں اثر

اگر علوم و فنون کے پڑھنے پڑھانے کے بعد یہ اثر بھی نہ ہو کہ انسان

ایک حد تک اُن کی بدولت دولت برکات سے مستفید ہو کر غیرت مند اور خوددار بن سکتے تو ایسا علم اور ایسا فن کوڑی قیمت بھی نہیں رکھتا۔ سوچو تو مان جاؤ کہ اصل ادب دُنیا میں وہ ہے جس کے ہوتے یا جس کے حاصل کرنے سے انسان غیور اور خوددار بن جائے ایک مایۂ غیرت اور ایک بضاعت خودداری اور لاکھ ادب اور ایک غیرت اور خودداری جو ادیب یہ دونوں چیزیں نہیں رکھتا وہ ادیب کیا ہوا۔ خاک

ادیب دہر کیا ہے جس میں خودداری نہ ہو
وہ وضیع خلق ہے جس میں وضع داری نہ ہو

ثمرۃ الادب سے محبت رکھو۔ ثمرۃ الادب کے کام و زبان کے مزے لو ثمرۃ الادب کی حد آگانہ لذتوں اور متنوع مزوں سے شیریں کام ہو مگر غیورانہ رنگ میں اور خودداری کے ساتھ اگر تاریخ پڑھو تو یہ خیال رکھو کہ تمہارے اسلاف اور بندگان ملت و قوم کی کیا حالت رہی ہے کیوں انہیں ترقی ملی اور کیوں اُن کا تنزل ہوا جو قومیں ترقی پذیر ہیں۔ اُن کی ترقی کے اسباب کیا کیا یا کیا کچھ ہیں۔

منزل اسباب میں بھی جا کے دیکھ
کتنے درجے کتنے زینے اُن کے ہیں

صرف نحو رٹ لینا منطق کے کلیات اور جزیات یاد کر لینا جغرافیہ اور تاریخ سے واقف ہو جانا بے شک موجب افتخار ہے لیکن کتابی رنگ میں نہ عملی رنگ میں اس کا ملک اور قوم کو کیا فائدہ۔ ملت و قوم کے واسطے صرف غیرت اور خودداری ہی کفیل و نصیر ہو سکتی ہے۔ جو سپاہی فن حرب سیکھ کر بھی بزدل اور اپاہج ہے وہ سپاہی نہیں بلکہ ایک ننگ فوج ہے یہی حالت اس شخص کی ہے جو ادیب ہو کر بھی خودداری سے کام نہیں لیتا۔

وہ ادب کیا جس میں خودداری نہ ہو
خواب وہ کیا جس میں بیداری نہ ہو

طالب علم کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ خوددار بنے خودداری سیکھے کیونکہ ثمرۃ الادب کی یہی شیریں ترین قاش ہے۔ یہی قاش ہے جو تمام دوسری قاشوں اور ثمرات کا معاوضہ ہو سکتی ہے۔ جو شخص ادیب ہو کے پھر بھی ضمیر فروش ہے تم خود ہی کہو کہ اس کا حق ہے کہ وہ خود کو ادیب کہے۔

خوددار جو نہیں ہے وہ خود فروش ہے
سنتا نہیں ہے کچھ بھی پنبہ بگوش ہے

کورنشات۔ تسلیمات نمائشی ادب و آداب بھی کسی حد تک ضروری ہیں اور جائز حدود نہیں ان سے بھی کام لیا جا سکتا ہے لیکن اسے سرتاج ادب سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے علمی رنگ میں ادبیات کیا ہیں علوم اور فنون کی غایات سے واقف ہو کر اخلاقی رنگ میں اُن سے کام لینا چاہیئے۔ ایک سائنس دان ایک مشین تیار کر ملک و قوم پر احسان کرتا ہے۔ آرام اور آسائش کے سامان مہیا کرنے سے سہولت کا باعث ہوتا ہے لیکن اگر اس کی اخلاقی جرأت کمزور ہے اور اُسکی سیرت بھدی ہے تو مشین کا بنانا کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ جب اپنی مشین ہی ناکارہ اور شکستہ ہے تو دوسری مشینوں کے بنانے سے سوائے عارضی آمدنی یا شہرت اور نمائش کے اور کیا کچھ نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ادبیات کی ابتدائی ترقی کیا ہے اپنی زبان کی وسعت میں زور دینا جدید جدید اصطلاحات سے کام لینا اور اپنی زبان کو علمی ذخائر سے مالا مال کر دینا یہی باتیں ہیں جو ایک قوم کے ادبیات اور ثمرۃ الادب کو مالا مال کرتی ہیں۔ ثمرۃ الادب سے اور ترقی

کتب اور مقدار صحائف مراد نہیں ہے بلکہ وہ عمل جو ادب اور ادبیات سے روشن میں لایا جاتا ہے کیا اخلاق جلالی کے مسلمات پڑھ کر اور یاد کر کے اُن پر عمل نہ کرنا کسی کو با اخلاق بنا سکتا ہے یا جو شخص بدیع و معانی کے قوانین سے واقف ہو کر اُن سے تحریر میں کام نہ لے وہ ادیب ہو سکتا ہے جب ہم ثمرۃ الادب کی بحث کریں گے تو اُس میں عملی رنگ مقدم ہوگا نہ کہ لفظی اور حروفی الفاظ اور حروف کتابوں کے واسطے ہیں اور عمل دل و دماغ اور جوارح کے لئے۔

دیکھو رسالہ ثمرۃ الادب میں مختلف نمبروں میں جو مضامین درج ہو کر شایع ہوتے ہیں وہ ہر شخص پڑھتا ہے لیکن جب تک اُن سے عملی رنگ میں مستفید نہ ہو تب تک نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں تک عملی اور علمی رنگ میں اس سے حصہ لے سکتے ہیں۔ ادب ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو دنیا میں ایک حد تک خوش رکھ سکتا ہے۔ یہ ادب ہی کا اثر اور نتیجہ ہے کہ آج دنیا اس قدر ترقی کر رہی ہے۔

ادب کا صرف یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئے کہ محض نمایشی رنگ میں عمل ہو بلکہ یہ کہ جو کچھ ادبی رنگ میں کام لیا جا سکتا ہے وہ لیا جاوے۔ ادب ایک بیج ہے اور ایسا بیج جو علی قدر فراست ہر طبیعت میں نشو و نما پا سکتا ہے ہر طبیعت اس سے کچھ نہ کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ ادبیات کا شروع کتابوں اور مختلف صحائف سے نہیں ہوتا بلکہ کائنات کے اُن تصرفات اور اُن امور سے جو وقتاً فوقتاً ہمارے ماحول میں ہستی پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ شجر ادب کا پہلا اور لذیذ ثمرہ کیا ہے۔ احساس اور ادراک جو سرمایۂ ادبی دولت احساس نہیں بخشتا اور جس کی یہ غایت و غرض نہیں وہ ثمرہ ادب نہیں ہے بلکہ ثمرہ حنظل ہے

میٹھا نہیں کڑوا۔ لذیذ نہیں بدمزہ۔ خوب نہیں خراب۔ مفید نہیں مضر۔ خوش آیند نہیں ناگوار۔ مفرح نہیں مضر و مولم۔

قوم جو رکھتی نہیں احساس ہے
سمجھو بس منحوس اُس کی راس ہے

ایشیائی نقطۂ خیال سے ادبیات کا مفہوم صرف لسانی قواعد اور لسانی قوانین تک ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ یورپین نقطۂ خیال سے ادبیات کا یہ مفہوم محض ابتدائی ہے۔ اُن کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ ان ابتدائی قوانین اور ابتدائی ضوابط کی بدولت و بسبب دیگر علوم و فنون سے انسان مستفید ہو صرف گردان کرنے سے ادیب بننا ذرا مشکل ہے جب تک کہ اس گردان سے دوسری گردانیں نہ کرنی آجائیں۔

گردشِ دوراں سے ہم گردش میں آکر رہ گئے

خفا ہونے کی بات نہیں ان گردانوں اور تصریف پیمانوں سے ہم نے سیکھا کیا اس وقت ہم اس کائنات میں کتنی ایجادات کے موجد اور کتنی اختراعات کے مخترع ہیں یہ سمجھنا کہ ادب کی غرض و غایت صرف بدیع و معانی ہی ہے ایک غلط خیال ہے یہ باتیں تو ادب کے راستے میں اب نہیں ہیں۔ جب دوسری طرف ادب کے معنی اندازہ اور نگاہ داشتن کے بھی ہیں تو کیوں علوم و فنون پر بھی وہ محیط نہیں۔ جب ادب ایک تاج ہے تو اس کے تصرفات اور برکات کو کیوں محدود مان لیا جاوے۔

ایک طرف تو کہنے والا کہتا ہے کہ

ادب تاجیست از لطف الٰہی

اور دوسری طرف اسپ ادب کی باگ ڈور کسی طرف موڑتے ہی نہیں۔

وسعت ادبی کا یہ اندازہ ہے کہ

شجر ادب کا ثمرہ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ثمرۃ الادب تمہارے میز پر ہے۔ ہر مضمون اُس کا ایک شیریں پھل ہے اور ہر پھل کا مزہ و لُطف جداگانہ ہے۔ انسان کی طبیعت اخلاق پسند واقع ہوئی ہے۔ کیا ثمرۃ الادب یہ خصوصیّت نہیں رکھتا۔

مختلف ثمرات ہیں فن ادب
کاش ان کی قاش کھا کر دیکھئے

مرزا سلطان احمد

ڈاکٹر مل کا نظام منطق

(مترجمہ مولوی محمد فدا علی صاحب طالب مددگار مدیر رفیق دارالعلوم)

علمائے منطق کی عموماً یہ عادت ہے کہ اپنے رسالوں کو اطراف قضایا اور اُن کے چند ابتدائی اصول کے مباحث سے شروع کرتے ہیں۔ متقدمین نے اِن مباحث میں اطراف اور اُن کے مختلف اشکال کی اتنی کافی توضیح کر دی ہے کہ اگر میں اس عام تقلید میں کچھ کمی کر دوں اور اپنے خاص دلائل اس بحث کی اہمیت میں کچھ نہ لکھوں تو غالباً مجھے فدا بن ہمتن کا اُن لوگوں کی طرح جواب دہ نہ ہونا پڑے گا جو بلا کسی عذر معقول کے عام رواج سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ عادت ایک ایسا رواج ہے جس کی اہمیت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ہر فن میں بلا کسی اختلاف کے

تسلیم کر لیا گیا ہے جو کمی ذریعہ کی تکمیل میں رہ جاتی ہے وہ نفس مقصود کی تحصیل میں ضرور سدراہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ منطق نظریات کی ایک شاخ اور نظریات کا موضوع خیالات ہیں اور زبان اظہار خیالات کا بہترین ذریعہ ہے اس بنا پر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ زبان کے نقائص اور قواعد زبان کا غلط استعمال اظہار خیالات میں یقیناً خارج ہوگا اور ہم صحت کیساتھ نفس واقعہ کے بیان پر کبھی قادر نہ ہوں گے بلکہ ان خرابیوں کی وجہ سے اکثر ہمارے استدلال کا طریقہ خود ایسا پیچیدہ ہو جائیگا کہ نتیجہ ہر پہلو سے یقین کرنا دشوار نظر آئیگا۔

جو دل و دماغ کہ قبل سے الفاظ کے مختلف اقسام اور اُن کے صحیح مفہوم سے باخبر نہیں ہیں اُن کا فلسفہ دلالت پر بحث کرنا بعینہ اُس شخص کے مانند ہوگا جو علم ہئیت کے غوامض دریافت کرنے کا تو شایق ہے لیکن اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ الہ بصریات میں نقطۂ نگاہ کا فاصلہ مناظر سے کس تناسب کے ساتھ ہو کر مرئیات کا پورا انکشاف ہو سکے۔

چونکہ منطق کی اصل غرض استدلال اور نتاج ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اعمال الفاظ ہی کے ذریعہ سے ظہور میں آسکتے ہیں۔ اس لئے ہر وہ شخص جسے الفاظ کی دلالت اور اُن کے اقسام و اغراض سے واقفیت نہ ہوگی وہ یقیناً اپنے قیاس میں صحت اور حقیقت سے کوسوں دُور ہوگا اور اور اُس کے نیتجہ پر کسی گوشہ سے بھی یقین کی روشنی نہ پڑے گی۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر علمائے منطق ابتداً ہی اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کریں۔ اغلاط کے چشمہ کا منہ بند کریں اپنے مستفیدوں کی آنکھ سے وہ دھندلا شیشہ اُتارلیں جو مرئیات کی اصلی شکل و صورت کے مشاہدہ کرنے میں اُن کا حارج ہو رہا ہے اور بجائے اس کے اُن کی آنکھ پر وہ صاف و شفاف عینک لگائیں جو مناظر خیال کے ہر ہر لفظ کو

اُن کیلئے آئینہ حقیقت بنادے اس لئے ضرور تھا کہ زبان کے فوائد سے ابتداء ہی فن منطق میں اس حد تک بحث کر دی جائے جس سے یہ کمی پوری ہو جائے اور طالب فن کو اتنی بصیرت حاصل ہو جائے کہ اپنے استدلال میں دلالت الفاظ کی غلطیوں سے محفوظ رہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب اور بھی ہے جس نے پہلے سبب سے زیادہ اس بات کو ہر منطق کے لئے ضروری کر دیا ہے کہ فن منطق میں سب سے پہلے دلالت الفاظ سے بحث کرے۔ وہ سبب یہ ہے کہ منطقی کو اگرچہ اصل غرض معانی اور مفہوم سے ہے لیکن چونکہ معانی اور مفہوم کی تعبیر انہیں الفاظ سے کیجاتی ہے اس لئے تاوقتیکہ دلالت الفاظ کے تمام اقسام زیر نظر ہوں گے کسی قضیہ کا مصداق ہرگز سمجھ میں نہ آسکے گا۔ اور یہی اندازہ اور اسی کی جانچ دیرتال منطق کا پہلا مرحلہ ہے جس میں قدم رکھنا ہر رہرو کے لئے ضروری ہے۔

مقدمہ میں یہ امر بصراحت مذکور ہے کہ منطق کی تحصیل کا مقصود یہ ہے کہ ہم کو اس بات کا علم یقینی حاصل ہو جائے کہ ہم کس طرح اپنے معلومات نظری سے مجہولات کا اکتساب کریں۔ کس فیصلہ کن دلیل سے ثبوت اور عدم ثبوت میں تمائز حاصل کریں۔ مجہولات اور واقعات نظری میں کس مابہ الانفصال علم سے یقین اور شک اذعان اور انکار میں فرق کریں یہ ہی باتیں ہیں جن کے لئے منطق کی تحصیل کیجاتی ہے۔

مختلف سوالات مختلف شکلوں میں ہمارے ادراک کے آئینہ میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ ان سوالات میں بعض تو ایسے ہیں کہ اُن کا جواب خود اُس صورت کی بداہت سے بلا واسطہ کسی دوسرے علم کے ہیں ملجاتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو ہم اپنے حاصل شدہ نظریات اور استدلال سے اور اکتساب کر کے

اُن کا جواب حاصل کرتے ہیں منطق کو اسی آخرالذکر قسم کے تعلق ہے لیکن قبل اسکے کہ ہم اُن سوالات کے طریقہ تحلیل پر غور کریں ہمیں پیشتر یہ سمجھنا چاہیے کہ خود اُن سوالات کی حقیقت کیا ہے جو مختلف صُورتوں میں ہمارے ادراک کے آئینہ میں چمکتے ہیں۔ اِن سوالات میں کتنے سوال ایسے ہیں جو قابلِ ادراک ہیں اور اس ادراک کے کتنے طریقے ممکن الحصُول ہیں جن پر بنی نوع انسان کے اضافہ معلُومات کا مدار ہے۔ یہ باتیں قضیوں کی جانچ اور اُن کی ترکیب پر غور کرنے سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتی ہیں۔

ہر اُس سوال کا جواب جس کی لفظی تعبیر ممکن ہے لامحالہ کسی نہ کسی قضیہ ہی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ ہر وہ مفہوم جو قابل یقین یا مشکوک ہے جب الفاظ کا جامہ پہنے گا تو کسی نہ کسی قضیہ ہی کی صُورت میں ظاہر ہو گا۔ ہر مفرد مفہوم جو لفظ صدق وکذب کے غلط استعمال سے صادق یا کاذب کہلاتا ہے وُہ درحقیقت صادق یا کاذب قضیہ ہوتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی خبر یا حکایت مضمر ہوتی ہے جو اختصار یا کسی اور وجہ سے لفظاً ظاہر نہیں کی گئی۔ ہر اُس قضیہ کا علم جس کی لفظی تعبیر ممکن ہے درحقیقت اُن سوالات کا علم ہے جو مختلف اوقات میں ہمارے ذہن کے آئینہ میں صُورت پذیر ہوتے ہیں اور جنہیں ہم بعد غور صادق یا کاذب یقین یا مشکوک کہتے ہیں۔ انکشاف اور ادراک کے متعلق وقتاً فوقتاً وُہی سوال ہے جو مختلف شکلوں میں ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ اس سوال کا مفہوم ایک ہے الفاظ مختلف ہیں مثلاً کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ انکشاف کے کتنے طریقے ہمارے لئے ممکن ہیں۔ کبھی ہم یہ سوچتے ہیں کہ تصدیق کی کتنی قسمیں ہیں جن سے ہم مجہولات کا اکتساب کرتے ہیں۔ کبھی ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ قضیوں کی کتنی قسمیں قابل یقین ہیں اور کتنی مشکوک ومظنون۔ چونکہ ہر یقین پر

اکتساب کا مقصود قضیوں ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے نفس قضیہ کی حقیقت اور اُس کی مختلف قسموں پر غور کرنے سے یہ امر بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ انکشاف اور ادراک کے متعلق کتنے سوالات کا انسانی ذہن میں صورت پذیر ہونا ممکن ہے اور اُن سوالات میں کتنے سوال ایسے ہیں جن کی حقیقت اور صحت کو استدلال کے بعد جواب کے پیرایہ میں انسانی دل و دماغ قبول کر سکتے ہیں۔

قضیہ پر سرسری اور ابتدائی نظر ڈالنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قضیہ دو جزو سے مرکب ہوتا ہے یعنی دو اسموں کو باہم ملانے سے ایک قضیہ بنجاتا ہے قضیہ کی عام تعریف جو ہمارے مقصد کیلئے ہی کافی ہے یہ کی جاتی ہے کہ قضیہ وہ قول ملفوظی ہے جس میں ایک چیز دوسری چیز کے لئے ثابت یا اُس سے سلب کی گئی ہو مثلاً اس قضیہ میں کہ سونا زرد ہے زردی کی صفت سونے کے لئے ثابت ہے یا اس قضیہ میں کہ زید انگلستان میں پیدا نہیں ہوا۔ انگلستان میں پیدا ہونے کے واقعہ کی زید سے نفی کی گئی ہے۔

لیکن حقیقتاً ہر قضیہ میں تین جزو ہوتے ہیں موضوع محمول اور رابطہ۔ موضوع اس شخص کا نام ہے جس کے لئے محمول ثابت یا جس سے محمول سلب کیا گیا ہو۔ محمول اُس چیز کو کہتے ہیں جو موضوع کے لئے ثابت یا اس سے سلب کی گئی ہو۔ رابطہ وہ نسبت ہے جو موضوع اور محمول کے درمیان ایجاب یا سلب کا ارتباط قائم کرے۔ یہی رابطہ وہ نسبت ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے سے متکلم اور مخاطب دونوں قضئے اور دوسرے جملوں میں فرق اور تمیز کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس قضیہ میں کہ زمین گول ہے گول محمول ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گولائی کی صفت زمین کے لئے ثابت کی گئی ہے۔

موضوع جس کے لئے گولائی کا ثبوت اس قضیہ میں کیا گیا ہے "ہے" رابطہ ہے جو اس نسبت ایجابی پر دلالت کرتا ہے جو موضوع اور محمول کے درمیان پائی جاتی ہے۔

رابطہ کو فی الحال نظر انداز کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر قضیہ میں کم از کم دو جز ایک خاص نسبت کے ساتھ باہم مرتبط ہوتے ہیں اور انہیں اجزا کا تعین اور اُن کے باہمی ارتباط کی معرفت اُس شاہراہ پر چلنے کا پہلا قدم ہے جس کی ہمیں تلاش و جستجو ہے۔ اس وضاحت سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ حکم کے لئے صرف ایک مفہوم تصوری کافی نہیں ہے بلکہ ہر حکم کے لئے کم از کم دو مفہوم درکار ہیں جن کی لفظی تعبیر قضیوں میں اُن کے نام سے کی جاتی ہے۔ عام طور پر تو اہل فن کا یہی خیال ہے کہ ہر قضیہ میں دو ایسی چیزوں کا ذکر ہونا چاہئے جن کے نام کا تعین ہو سکے جن کو ہم کسی نہ کسی نام سے نامزد کر سکیں اور مخاطب اُن ناموں سے وہی چیزیں مراد لے جو ہمارا مقصود ہیں لیکن ایک گروہ اہل علم کا اس طرف ہی گیا ہے کہ تعین اجزا ہو سکے۔ یہاں یہ اتنی وضاحت بے معنی ہے۔ یہ قید لگانا کہ قضیہ میں دو قابل بحث چیزوں کا ذکر ضروری ہے بیجا طوالت ہے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر قضیہ میں دو تصورات کا پایا جانا ضروری ہے موضوع اور محمول انہیں تصورات کے نام ہیں جن کو ہماری قوت مدرکہ ایک خاص نسبت کے ساتھ باہم مرتبط کر لیتی ہے مثلاً اس قضیہ میں کہ "سونا زرد ہے" سونا اور زرد دو مختلف تصور ہمارے ذہن میں موجود تھے جن میں ہمارے ادراک صحیح نے یہ تصرف کیا کہ ایک کو دوسرے کے تحت میں ہم نے اس طرح داخل کر لیا ہے کہ جو چیز سونا کہلائیگی اُسے زرد ہونا بھی ضروری ہے۔ اس خیال کی صحت پر ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابھی ہم

یہ امر متعین نہیں کر سکتے کہ آیا نفس الامر یہی طریقہ استدلال صحیح ہے یا وہ طریقہ جسے عموماً اہل فن تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارا اصل مقصود یہاں صرف اس قدر ہے کہ یہ امر متعین ہو جائے کہ ہر قضیئے میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے کم از کم صدق میں مساوی ہو یا اُس سے قطعاً متباین ہو (یا ایک عام ہو دوسری خاص۔ مترجم اردو) کوئی دعویٰ اور کوئی سوال دنیا میں ایسا ممکن نہیں ہے جس میں دو مختلف صورتوں کا باہمی ارتباط ملحوظ نہ ہو ان صورتوں میں کوئی صورت بھی ایسی نہیں ہے جو تنہا ذہن کے آئینہ میں نہ چھپ سکے لیکن یہ محال ہے کہ بلا ارتباط دوسری صورت کے ان میں سے کوئی صورت بھی تنہا یقین کا فائدہ دے اور اُس سے کسی قسم کی خبر حکایت یا تصدیق حاصل ہو۔

فرض کرو کہ ہم آفتاب کا نام لیتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ لفظ آفتاب کے معنی بھی معلوم ہیں اور یہ لفظ اپنے معنی مستقل پر دلالت بھی کرتا ہے متکلم اور مخاطب دونوں اس کے مفہوم کو سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم تنہا لفظ آفتاب بول کر مخاطب سے پوچھیں کہ اُسے کسی قسم کا یقین حاصل ہوا یا نہیں تو بلاشبہ وہ یہی جواب دیگا کہ صرف لفظ آفتاب کو سُن کر نہ اُسے کسی قسم کی خبر معلوم ہوئی اور نہ اس لفظ سے اُسے کسی طرح کا یقین حاصل ہوا۔ بہ خلاف اس کے آفتاب کے متعلق جتنی حکایتیں کہ ممکن نہیں اُن میں سے ہر حکایت سے کسی نہ کسی خبر کسی نہ کسی صدق یا کذب کا ضرور پتہ چلتا ہے مثال کے طور پر ہم صرف اُس حکایت کا ذکر کرتے ہیں جس کا ہر واقعی چیز کیلئے صحیح ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے اس حکایت میں ہم اُس چیز کو آفتاب پر محمول کرتے ہیں جس کا ثبوت ہر چیز کے لئے تمام اغراض کے ثبوت کی اصل ہے۔ اس غرض سے ہماری مراد وجود ہے مثلاً جب ہم یہ کہتے

ہیں کہ آفتاب موجود ہے تو البتہ ہم مخاطب اور سامع کو کسی خبر کی اطلاع دیتے ہیں جس سے اُسے ایک قسم کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس [illegible] میں حکایت میں بھی کم از کم دو چیزیں مذکور ہیں تو اور دوسری حکایتوں میں جن کی وضاحت ثبوت اس حکایت سے بدرجہا کم ہے کس طرح صرف ایک ہی مفہوم سے ہم یقین کا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ لفظ موجود جو اس قضیہ کا کہ "آفتاب موجود ہے" محمول ہے صرف تنہا آفتاب کہنے میں ہی اگرچہ صراحت تو مذکور نہیں ہے لیکن ضمناً مقصود ضرور ہے۔ قضیہ مذکور میں محض ایک لفظی اضافہ ہے ورنہ معناً دونوں قول برابر ہیں لیکن یہ اعتراض بجائے خود صحیح نہیں ہے تنہا لفظ آفتاب اُن تمام معانی اور مفہوم پر دلالت نہیں کرتا جن پر یہ قضیہ کہ آفتاب موجود ہے دلالت کرتا ہے۔ فرض کرو کہ ہم آفتاب کو معدوم تصور کریں تو بھی لفظ آفتاب کا اطلاق تو اپنے مصداق پر اُس وقت بھی صحیح ہوگا لیکن یہ قضیہ کہ آفتاب موجود ہے اُس حالت میں صادق نہ ہوگا۔ ہمارے یہ دو قول کہ زید کا باپ اور زید کا باپ موجود ہے معناً بالکل ایک دوسرے سے مغایر ہیں کیونکہ زید کے باپ کے مرجانیکے بعد بھی پہلا قول یعنی زید کے باپ کا تو اطلاق اُس پر اسی طرح صحیح ہوگا جیسا کہ اس کی حالت حیات میں درست تھا لیکن اس کی بابت یہ حکایت کہ زید کا باپ موجود ہے ہرگز اس حالت میں صحیح نہ ہوگی۔

مختصر یہ کہ جب ہم آفتاب۔ زید کا باپ ایک گول مربع وغیرہ مفرد الفاظ بولتے ہیں تو ہم سامع کسی یقین یا عدم یقین کی امید نہیں رکھتے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آفتاب موجود ہے۔ زید کا باپ موجود ہے۔ ایک گول مربع موجود ہے تو لامحالہ ہم سامع کو ان حکایتوں کے ذریعہ سے حصول یقین پر مائل کرتے ہیں جو پہلی مثال میں تو ضروری دوسری میں مشکوک اور تیسری میں محال ہے (باقی آئندہ)

چند کتب اور اخبار

حمایت الاخلاق اس نام کی ایک کتاب اخلاقی اردو نظم میں مولوی محمد عبدالوہاب صاحب عندلیب ایڈیٹر رسالہ واعظ نے لکھی ہے۔ مصنف کو اس کے صلے میں پچاس روپیہ ماہوار اور چار سو روپیہ نقد پیش گاہ اقدس سے عطا ہوئے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی نے اپنے کورس میں اس کتاب کو داخل کرلیا ہے۔ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے مفید ہے قیمت (عہ) ایک روپیہ۔

مینیجر رسالہ واعظ شاہ علیبنڈہ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے

اخلاق رسالت پناہی یہ انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم کے سلسلہ تالیف کی تیسری کتاب ہے انجمن کا یہ ایک جدید اور بہترین کارنامہ ہے ملک کو ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے مؤلف مولوی فاضل محمد مرتضیٰ صاحب سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس ہیں۔ ہمدردان قوم سے امید ہے کہ وہ انجمن کی ہمت افزائی فرمائیں گے تاکہ انجمن اور بھی مفید کتاب ملک و قوم کے سامنے پیش کرے۔ چار آنے میں دفتر انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

رسالہ زمانہ یہ اردو کا بہترین رسالہ نہایت آب و تاب سے زیر ایڈیٹری دیانرائن صاحب نگم بی۔اے کان پور سے شایع ہوتا ہے۔ رسالہ بلحاظ مضامین اور کاغذ وغیرہ کے نہایت عمدہ ہے رسالہ کے متعلق انگریزی اور

اردو کے اخبارات و رسائل نے عمدہ تنقید فرمائی ہے۔ اس کے مضمون نگار ہندوستان کے بہترین اہل قلم ہوتے ہیں۔ نومبر کے پرچہ میں شعرائے حال کے سلسلہ کا دوسرا مضمون شایع ہوا ہے جو ڈاکٹر اقبال کے متعلق ہے۔ اڈیٹر صاحب زمانہ نے آپ کی شاعری کے فلسفہ وغیرہ پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں عالمانہ بحث کی ہے۔ اکتوبر کے پرچہ میں ایڈیٹر صاحب نے مولانا اکبر حسین صاحب کا حال لکھا تھا۔

نومبر ہی میں خنجر وفا کے نام سے ایک عبرت انگیز قصہ لکھا گیا ہے اس کے مصنف اردو کے نامور فسانہ نگار پریم چند صاحب ہیں۔ حصۂ نظم میں مولانا اکبر برق وغیرہ کی پرجوش اور بہترین نظمیں ہیں۔ بہرحال زمانہ اردو کی بہترین خدمت ادا کر رہا ہے اہل ملک کو قدر کرنی چاہیئے قیمت (للعہ) ہے۔

زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

اخبار اہل سنت والجماعت یہ ایک مذہبی اخبار ہے جو مولوی حکیم ابو تراب محمد عبد الحق صاحب کی ایڈیٹری میں امرتسر سے پندرہ روزہ شایع ہوتا ہے۔ اخبار بلحاظ اپنی نوعیت کے اچھا ہے۔ اہل سنت والجماعت کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے قیمت سالانہ (عہ) اشتہاری (عہ) نمونہ (۱ر) دیکھئے

(نفیر ہاشمی) مینیجر اخبار سنت والجماعت امرتسر

تصحیح فیصلہ: ثمرہ صفحہ ۱۳۔ صاحب عقد الفرید نے زمخشری کی تقلید کی ہے" یہ فروگذاشت ہو گی اسلئے کہ صاحب عقد الفرید متقدم ہیں اور زمخشری متاخر۔ ثمرہ صفحہ ۲۲۔ عقل کے بجائے عصب چھپ گیا ہے۔ نوٹ:۔ اس کے سوا اور بعض خفیف خفیف کتابت کی فروگذاشتیں ہیں جنکو ماہرین فن خود درست کر لے سکتے ہیں۔ (مینیجر)

جلد ۱ نمبر ۹ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ ہجری

ثمرۃ الادب

شاعری

(از جناب مولوی فاضل سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین (دار العلوم)

جن لوگوں میں شاعری کا خداداد ملکہ نہیں ہوتا وہ متشاعر ہوتے ہیں بتکلف شعر کہتے ہیں اور بعض کے شعر تو اصول سے درست ہی نہیں ہوتے۔

امین الرشید میں شعر گوئی کا ملکہ نہ تھا۔ ایک دن ہارون اور زبیدہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ امین و مامون کا ذکر آگیا۔ ہارون نے کہا امین ادیب و شاعر نہیں ہے اور مامون ادبی قابلیت میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ زبیدہ نے غصہ سے کہا کیا امین شعر نہیں کہہ سکتا؟ ادیب جیسا مامون ہے ویسا ہی میرا بیٹا امین بھی ہے میں آج ہی اُس سے کہتی ہوں کہ وہ بھی چند شعر کہے اور ابو نواس کو سنائے۔ اصلاح سخن کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے شعر بھی کیسے ہوتے ہیں۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر ہارون اُٹھ کر چلا گیا۔ زبیدہ نے امین کو طلب کر کے ماجرا بیان کیا اور کہا کہ تم آج غور و فکر کر کے چند شعر ضرور کہو اور ابو نواس کو

دکھانے کے بعد صاف کر کے مجھے دے جاؤ۔ میں امیرالمومنین کو سناؤں گی۔ امین نے تخلیہ میں بیٹھ کر چند شعر کہے اور ابو نواس کو طلب کر کے اس کے سامنے پہلا شعر پڑھا۔

محن بنو العباس مجلس علی الکراسی

ابو نواس نے کہا بے شک آپ اس کے اہل ہیں اور بڑی شان و جبروت کے خلفاء ہیں۔

دوسرا شعر پڑھا۔

نقاتل الاعادی بالسیف والمزراق

اس شعر کو ابو نواس نے سن کر کہا۔ آپ نے یہ کیا غضب کیا قافیہ ہی بدل دیا امین نے غضبناک ہو کر ابو نواس کو قید کرنے کا حکم دیا۔ ہارون ابو نواس کو اکثر یاد کیا کرتا تھا وہ محبس میں تھا اور ہارون نے طلب کیا۔ خادم نے عرض کی امیرالمومنین! آج ابو نواس نے امین الرشید کے شعر پر اعتراض کیا اس لئے مقید ہے۔ ہارون سمجھ گیا اور امین کو بلا کر کیفیت دریافت کی۔ امین نے کہا ابو نواس نے میرے شعر پر اعتراض کیا حالانکہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اس لئے میں نے اسے محبس بھیجدیا۔ ہارون نے کہا اچھا تو ہم بھی سنیں کہ تمہارے شعر کیسے ہیں۔ مگر ابو نواس شاعر ہے شعر کی خوبیوں کو اچھی طرح وہی سمجھ سکتا ہے اس کی حضوری ضرور ہے۔ حکم ہوا اور دم کے دم میں ابو نواس ہارون کے سامنے حاضر کیا گیا۔ ہارون نے امین کی طرف مخاطب ہو کر کہا ہاں اب پڑھو امین نے یہ شعر پڑھے۔

یا قاعدۃً فی الاربع ما مثلک فی الابلد

شبھتک بکنا فۃٍ مبسوسۃ بالخردل

والسمن فوقک سائح مثل الحسان ابلق

ابو نواس یہ اشعار سن کر کھڑا ہو گیا۔ ہارون نے پوچھا کہاں؟ عرض کی قیدخانے

اس لئے کہ کچھ عرض کروں بھی تو وہیں جانا ہوگا پھر پہلے ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔ ہارون
یہ سن کر ہنس پڑا۔ اور زبیدہ سے جا کر سارا واقعہ بیان کیا۔

جس میں شاعری کا ملکہ ہوتا ہے مرد ہو یا عورت وہ شعر کہے تو اُس کے اشعار اُصول سے نہایت درست ہوں گے۔ عرب کی عورتیں بھی شاعرہ گذری ہیں معن ابن زائدہ عرب کا ایک امیر تھا۔ ایکدن سیر و شکار کے لئے نکلا۔ رستے میں پیاس لگی۔ خادموں کے پاس پانی نہ تھا۔ مجبوراً مضطربانہ رستہ طے کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر دو تین لڑکیاں پانی کی مشکیں لے جاتی ہوئی نظر پڑیں گھوڑا دوڑا کر اُن کے قریب پہنچا اور پانی مانگا اُن میں سے ایک نے اُسے پانی پلایا چند مصاحب ساتھ تھے۔ پوچھا کچھ دینار ہیں؟ سب نے کہا نہیں۔ یہ سن کر معن ابن زائدہ نے ترکش میں سے چند تیر نکال کر اُن کو دیئے جن کے پیکان سونے کے تھے۔ لڑکیوں نے یہ بذل و نوال جو دیکھا تو آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگیں۔ ہو یہ تو معن ابن زائدہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اس زمانہ میں ایسا سخی کون ہے جو صرف پانی پلانے کے صلے میں۔ سونے کے تیر اُٹھا کر دیدے چاہے وہ ہو یا کوئی اور مگر ہے تو بڑا سخی۔ ہم کو اس سخی کی مدح میں چند شعر ضرور کہنا چاہیئے اس گفتگو کے بعد بداہتہً ایک نے کہا۔

یرکّب فی السّھام نصول تبر ۔۔۔ ویرمی للعدیٰ کرماً وجودا
فللمرضیٰ علاج من جراح ۔۔۔ واکفان لمن سکن اللحودا

یعنے ممدوح تیروں میں سونے کے پھل لگاتا ہے اور ازراہِ جود و کرم اُن سے اپنے دشمنوں کو مارتا ہے۔ یہ تیر مریضوں کے لئے زخموں کا علاج ہیں اور لحد میں رہنے بسنے والوں کے لئے کفن کا ذریعہ۔

دوسری لڑکی نے کہا۔

ومحارب من فرط جود بنانہ ۔۔۔ عمّت مکارمہ الاحبّة والعدیٰ

صیغت نصول سہامہ من عسجد کی لا یعوق الحروب عن الندی

کئی جوانمرد ایسے ہیں جن کی بخشش کی کثرت سے دوستوں اور دشمنوں پر اُن کی مہربانیاں عام ہو گئی ہیں۔ اُن کے تیروں کے پھل سونے کے بنائے گئے ہیں تاکہ لڑائیاں اُن کو جود و کرم سے باز نہ رکھیں۔

تیسری لڑکی نے کہا:

ومن جوده یرمی العداة باسهم | ومن الذهب الابریز صیغت نصولها
لینفقها المجروح عند دوائه | ویشتری الاکفان منها قتیلها

یہ بات ممدوح کے جود و کرم کی دلیل ہے کہ اپنے دشمنوں کو وہ ایسے تیروں سے مارتا ہے جن کے پھل خالص سونے کے بنائے گئے ہیں تاکہ مجروح اُن کو علاج کے لئے خرچ کرے اور مقتول اُن سے کفن خریدے۔

ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "شاعر نثر نہیں لکھ سکتا" اگر کوئی شخص ابن خلدون کی اس رائے پر غور کرے تو ظاہر ہوگا کہ اکثر شاعر شاعری کی بدولت نثر لکھنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعروں کو سوچتے رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی قید اُن کو مکلف بنا دیتی ہے اس لئے صاف، سلیس عبارت اکثر شاعر نہیں لکھ سکتے۔

ہماری اردو شاعری پر تکلف و تصنع کا الزام ہے[1] اور بیجا بھی ہے ایک تو اوزان غیر مطبوع میں ہم شاعری کرتے ہیں دوسرے صنائع بدائع کے شوق نے اور بھی خرابی

[1] یہ پیراگراف اس مضمون میں حالی کے مقدمہ دیوان سے ماخوذ ہے جسمیں اردو شاعری پر اسی قسم کے پوچ اعتراض ہیں جو حالی نے اپنے مقدمہ میں لکھے ہیں چونکہ ان اعتراضوں کے دنداں شکن جواب نقاد او دہنچ میں دیے جا چکے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ حالی کو خود ہی اردو شاعری کا مذاق صحیح نہ تھا اور اُن کے اعتراض ناواقفیت فن پر مبنی ہیں اس لئے ہم اسکے متعلق اب کچھ لکھنا بے کار خیال کرتے ہیں (بقیہ صفحہ ۵)

پیدا کردی ہے مگر ہم ہیں کہ صنائع بدائع کو حسن کلام سمجھے ہوئے ہیں اور اُن کے بہ تکلف استعمال کی ہم کو عادت پڑ گئی ہے۔ غرض ہماری شاعری ایسی ہے کہ ہم اُس کی خدمت کئے جا رہے ہیں اور وہ ہمارے کام نہیں آتی۔ یہ بات نہیں کہ بدیع گوئی مطلقاً مستحسن نہیں ہوتی ہو جن اشعار میں صنائع بدائع بلا تکلف ادا ہو جائیں اُن کا کیا پوچھنا نہ یہ کہ مصنوع و مصنع اشعار کے معنی پوچھنے کی ضرورت داعی ہو۔ ہمارے شعرا کے لئے آمد و آورد کی تمیز مشکل ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ عرب کی طرح اردو فارسی کے بھی ایسے شعرا گزرے ہیں جو فی البدیہہ کہنے میں مشاق تھے؟ یا آج کوئی ایسا شاعر ہے جو ایک ہی جلسہ میں سو پچاس فصیح و بلیغ اشعار کہہ سکے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ غیر مطبوع اوزان میں انکی شاعری ہے اور بدیع گوئی کی ان کو مشق و عادت پڑ گئی ہے۔ پھر اس طرح کی مصنع شاعری سے کیا اہتزاز و نشاط طبیعت پیدا ہو۔

جن لوگوں کا کلام ادب و اخلاق کی جان اور انّ من الشعر لحکمۃ کا مصداق ہے ایسے شاعر بہت تھوڑے ہیں اور ایسے اشعار کا دفتر بہت ہی کم ہے جس میں مناظر قدرت کا سچا فوٹو کھینچکر بتایا گیا ہے اور ایسی مثنویوں کا ذخیرہ نہایت ہی قلیل ہے جس کو صحیح واقعات عالم اور انسانی پاک جذبات کا گنجینہ، برائیوں بھلائیوں کا آئینہ کہہ سکیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴) اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اردو کی شاعری میں بھی سادگی اور رنگینی دونوں ہیں اور فارسی و عربی کی شاعری میں بھی صرف سادگی ہی نہیں ہے بلکہ سادگی اور رنگینی کے دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ محسنات بدیع کے موجد عرب ہی ہیں پھر اُن کی شاعری کو اس سے خالی کہنا چہ معنی دارد۔ اسیطرح اوزان کا غیر مطبوع ہونا یہ بالکل نئی بات ہمکانوں نے سنی ہے کہ اردو اوزان اُردو شاعری کے لئے نامطبوع ہیں ممکن ہے کہ عربی اوزان پر شعر کہنے والوں کو یہ اوزان نامطبوع معلوم ہوں ورنہ اردو شعرا کا تو یہ ظریفانہ مقولہ ہے کہ "انا موزون شعر العربی" (۱۳)

(اڈیٹر)

عرب کے ایک شاعر نے اپنی اونٹنی کی تعریف میں یہ مصرعہ کہا

ترعی العرار الغضّ والجثجاثا

دوسرے مصرعہ کیلئے کوئی قافیہ نہ ملا تو کہہ دیا

وامّ عمرو طالق ثلثا

ام عمرو اس کی جورو کا نام تھا۔ لوگوں نے سن کر کہا کم بخت! بھلا ام عمرو نے کیا قصور کیا تھا کہ تو نے اُس کو طلاق دے دی۔ کہا میں کیا کروں وہ قافیہ میں آگئی۔ ایسے ہی شاعروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے والشعراء یتبعھم الغاوٗن الم تری انھم فی کلّ وادٍ یھیمون ط

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اس میں کچھ کلام نہیں کہ مناظرِ قدرت کی جو خوبیاں ایک شاعر کو نظر آتی ہیں وہ غیر شاعر کو نظر نہیں آسکتیں۔ فطرت جس حسن و جمال کے ساتھ شاعر کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے غیر شاعر کے روبرو نہیں ہوتی۔ جب کوئی چیز شاعر کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہ اُس کے حسن و قبح دونوں کو دیکھ لیتا ہے۔ ایک بُری چیز پیش ہوتی ہے تو اس کے مقابل اُس کی ضد یعنے اچھی چیز کو رکھ کر دونوں کی زشتی و خوبی کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ کس چیز میں کیا خوبی اور کس میں کیا برائی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اشعار میں کوئی لفظ لاتا ہے تو دیکھ لیتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور لفظ تو نہیں ہے۔ ایک شعر میں جن الفاظ کو وہ منظوم کرے گا غیر شاعر اُنہیں الفاظ کو استعمال کر کے نثر میں وہ خوبی ہرگز نہ پیدا کر سکے گا نہ اُن الفاظ سے بہتر الفاظ لا سکے گا۔ شاعر جس طرح انسان و حیوان کے اچھے برے اوصاف کو سمجھنے کی تمیز رکھتا ہے۔ الفاظ کے حسن و قبح کو پہچاننے کی بھی تمیز رکھتا ہے اس لئے شاعر کی زبان مستند اور اُس کی شاعری علم ادب کے کار آمد ہوتی ہے

کیونکہ وہ الفاظ و محاورات کے حسن و قبح کو پہچانکر زبان کی اصلاح کیا کرتا ہے۔

نثر کی نسبت نظم میں یہ خوبی ہے کہ نظم کا حفظ کرنا آسان ہوتا ہے۔ نظم میں لفظ کم ہوتے ہیں اور معنی زیادہ اس لئے نثر سے زیادہ نظم کی طرف طبیعت کو رغبت ہوتی ہے اور غنا بھی نظم ہی سے مختص ہے اور ظاہر ہے کہ فطرۃً غنا سے طبائع کو کس قدر رغبت ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ سنسکرت اور بھاکا زبان کی مذہبی کتابیں نظم میں لکھی گئیں۔ بزم کا حسن اور رزم کا جبروت ظاہر کرنے کے لئے نظم ہی کا میدان تھا کہ عرب و عجم کے مشاہیر شعرا نے طبع آزمائی کرکے اپنی قابلیت کا لوہا منوادیا۔ پرجوش اشعار ہی کی وجہ سے جنگ میں لڑکر بہادروں نے جان دیدی یا فتح پائی۔ سلاطین کبار اور امرائے عظام کے دربار و محافل کی رونق شاعری ہی کے دم سے ہوئی اور ہر زبان کے علم ادب نے شاعری ہی کی بدولت ترقی پائی۔

اکثر شاعر خلاف عقل و فطرت مضامین لوگوں کے مذاق کے موافق اس غرض سے شعر میں نظم کیا کرتے ہیں کہ اشعار کی خاطرخواہ داد ملے۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ شعر سے سامع کو اخلاقی نفع پہنچے۔ غزل میں تو وہی عشق و عاشقی کے مضامین ہوا کرتے ہیں۔ قصائد میں جھوٹی تعریف ہوتی ہے۔ مثنوی ایک ایسی صنف تھی جسمیں تمدنی، معاشرتی، تاریخی واقعات منظوم ہو سکتے تھے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع تھی مگر اردو کی مثنویاں بھی عشق و عاشقی کے جھوٹے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور بعض بعض میں تو ایسے ناپاک جذبات کا اظہار کیا گیا ہے کہ اُن کے دیکھنے سے اخلاق و عادات پر نہایت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ شاعر بھی ایک طرح کا مصور ہے مگر مصور سے شاعر کی شان ارفع و اعلیٰ ہے۔ مصور صرف تصویر کھینچ دیتا ہے جسمیں نہ کوئی حرکت ہوتی ہے نہ قوت گویائی۔ اور شاعر جو تصویر کھینچتا ہے وہ چلتی پھرتی بولتی چالتی دکھائی دیتی ہے۔ جب تک واقعات پر شعر کی بناء ہوتی ہے تو بلبل کی

تصویر میں نغمہ سنجی کا لطف آتا ہے۔ جب اغراق و غلو اور بے محل رعایت لفظی کا رنگ چڑھایا جاتا ہے تو بلبل کی تصویر تو معلوم ہوتی ہے مگر نغمہ کی جگہ ایسی آواز سنائی دیتی ہے جس کو کان سننا گوارا نہیں کرتے۔

عام مذاق کی کچھ عجیب حالت ہے لوگ اس شعر کی ضرور داد دیں گے کیونکہ اس میں ضلع کی عمداً رعایت کی گئی ہے ؎

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانوں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانوں

مگر مندرجۂ ذیل اشعار کی داد وہی لوگ دیں گے جن کو اخلاق و معارف کا مذاق ہو:-

؎ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
؎ مرگئے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا — لیگئی تھی گور میں ذوق تن آسانی مجھے
؎ غلبۂ صافی سے ہے آئینہ کا رتبہ حاصل — جیسا ہووے کوئی ویسا نظر آتا ہوں میں
؎ کہتے جو لوگ وہ نہیں ہم تو سخن میں تہمت — پردہ کچھ ہم سے رہے گا جو کہے گا ہم کو
؎ پاؤں پھیلائے ہیں داماں کی طرح — ہاتھ کھینچا ہے گریباں کی طرح
؎ نثار ہوجیے اس دل پہ جو ہو صاحب درد — وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے
؎ احسان سر پہ لے تو کوئی باوقار کا — بیٹھے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے
؎ عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صدا کے — اک بات اٹھاتا نہیں کہسار کسی کی
؎ یوں مر کہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مردہ — یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی
؎ یہ بے ثباتی ساز طرب پکارتی ہے — کہ نغمہ رنگ حنا ہے کف جلاجل پہ
؎ نوائے شادی و غم دونوں یوں تھے دوش بدوش — کہ پس گیا گل نغمہ کف جلاجل پہ
؎ ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں — ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھا نشتر کوئی کا ہی تو زبان منت — دیکھا سپیر کوئی بھاری تو وہ احسان دکھا

ہمدردیوں پہ اہل زمانہ کی تو نہ جا — یوسف کو بھیجتے ہیں کنوئیں سے نکال کے

سحر کو آفتاب آجائیگا اے بیخبر سر پہ — کہ شب کو بستر گل پہ نہیں تو گل شبنم ہے

جن شاعروں کا کلام علم ادب کی جان کہلانے کا مستحق ہو سب ایسے نہیں ہو سکتے اور نہ مفید علم ادب سمجھ کر لوگ شاعری کر رہے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ اخلاقی و علمی مضامین نظم کرنے کی طرف شعراء توجہ فرمائیں تاکہ خلق خدا کو فائدہ پہنچے۔

ذہین

اسلام اور اسکی برکتیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

"دماغ بغیر علم کے اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو اور سچی عظمت دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ علم سے ہے"

مختصر طور سے تمدنی اور اخلاقی ترقی بیان کردی گئی۔ اگر اب ہم دوسرے رخ پر نظر کریں تو مسلمانوں کی فتوحات ہیں۔ رسول خدا کی رحلت کو ابھی بارہ سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی کوششوں سے پرچم اسلام ان سلطنتوں پر لہرانے لگا جہاں کبھی قیصر و کسریٰ کے پھریرے اڑتے تھے اور تھوڑے سے ہی زمانہ میں اندلس سے چین اور یورپ سے افریقہ تک کے ممالک مسلمانوں کے ہاتھ آگئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان ممالک کو اسلامی فتوحات سے

کیا فائدہ حاصل ہوا۔ مسلمان جس ملک کو فتح کرتے تھے وہاں کے باشندوں کیساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کرتے تھے اگر ذمیوں سے جزیہ لیتے تو اُن کو مساویانہ حقوق عطا کرتے اور اُن کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو ایسے حقوق عنایت فرمائے تھے جس کی نظیر دُنیا میں کم ملتی ہے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے ہمسایہ میں جو سلطنتیں تھیں وہ روم اور فارس کی تھیں۔ ان سلطنتو میں غیر قوموں کے حقوق غلاموں سے بھی بدتر تھے۔ مسلمانوں نے جن ملکوں کو فتح کیا اُن میں عمارتیں بنائیں مسجدیں خانقاہیں اور حمام تیار کئے کنوئیں اور نہریں کھدوائیں۔ سرائیں بنائیں۔ سڑکیں تیار کیں۔ شہر آباد کئے۔ کتب خانے یونیورسٹیاں رصدگاہیں قائم کیں۔ تجارت و حرفت کو فروغ دیا۔ غربا و مساکین کیلئے روزینے مقرر کئے۔ یتیموں کی خبرگیری کی۔ بیواؤں کی سرپرستی کی۔ غلامی کو گھٹایا اور آقا و غلام میں کوئی فرق باقی نہ رکھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

مفتوح قوموں کی جاگیریں بحال رکھیں اُن کو بڑے بڑے ملکی اور فوجی عہدے عطا کئے۔ اُن کے معبد بنا دیئے۔ الحاصل....

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں — ہو گلہ کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذمی اور مسلم کو یکساں — نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھی آپس میں ایسی
زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

اس کے علاوہ مسلمانوں کے خود اخلاق تعلیم محمدی کی وجہ ایسے وسیع اور عمدہ تھے کہ ہر شخص اُن کا گرویدہ بن جاتا تھا۔ مفتوح قوم اُن کے اخلاق

کو دیکھ کر دوڑ پڑتی تھی کہ مسلمانوں کے زمرہ میں داخل ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں چالیس کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ لیکن یہ تلوار کے زور سے مسلمان نہیں کیئے گئے اور نہ ظلم و زبردستی سے کیونکہ ہمارا پاک قرآن اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین۔ مذہب کیلئے کوئی زبردستی نہیں بلکہ اُن کے مسلمان ہونے کی اور اب جو ہو رہے ہیں اُس کی یہی وجہ ہے کہ اسلام ایک سچا سیدھا سادھا مذہب ہے اور وہ ترقی تمدن کا مخالف نہیں بلکہ اُس کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔ الدین عند اللہ اسلام۔

مختصر یہ کہ اسلام نے جو جو فوائد دنیا کو پہنچائے اُن کی گنتی مشکل ہے موسو لیبان کہتا ہے "۵۰۰ برس تک ممالک یورپ کے مدارس مسلمانوں ہی کی تصانیف پڑھایا کئے۔ اور کیا بلحاظ ترقی علمی و عملی وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مہذب بنایا۔ جب اُن کی تحقیقات علمی اور اُن کی ایجادوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قلیل مدت میں اُن سے زیادہ کسی نے ترقی نہیں کی" لیکن مسلمان ۸۰۰ برس دنیا کو اپنی بہار دکھا لینے کے بعد وہ ہو گئے جو ہیں۔ گو اُن کے ہنر مفقود ہو گئے مگر قابلیت باقی ہے۔ اور گو تباہ و تاراج ہو گئے مگر پھر بھی ہر ایک بر اعظم میں موجود ہیں اور اُن کی وسیع سلطنت باقی ہے۔ خدا چاہا تو پھر سنبھل جائیں گے (آمین)

برہان الدین حسین

ہم نہایت مسرت کیساتھ اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ عالیجناب مولوی سمیع اللہ بیگ صاحب میر مجلس عدالت عالیہ نے ازراہ علم دوستی و قومی ہمدردی انجمن کا دوامی معاون ہونا قبول فرمایا ہے

(معتمد انجمن)

ڈاکٹر مل کا نظامِ منطق

(گذشتہ سے پیوستہ)

سابقہ توضیح یقین و اذعان کے طریقہ حصول کے بیان اور اس کے اجزا کی تحلیل کا پہلا مرحلہ ہے جو اگرچہ بے حد واضح ہے مگر انتہائی غیر ضروری بھی نہیں ہے کہ قطعاً معرض بحث میں نہ آسکے یہ ممکن ہے کہ ہم اس ابتدائی مرحلہ کو بلا زبان کی بحث اور قواعد زبان کے علم صحیح کے طے کرلیں لیکن اگر ہم اسی راستہ پر آگے بڑھنا چاہیں اور قضیوں کے اصلی مصداق اور حکایتوں کے حقیقی محکی عنہ سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں سب سے پہلے اسما اور الفاظ کے مفہوم اور اُنکے افراد سے بحث کرنا ناگزیر نظر آتا ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ ہر قضیہ میں دو اسم ہوتے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کے لئے ثابت یا اُس سے سلب کیا جاتا ہے۔ لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے تصور کے بعد ہمارے ذہن میں وہ دوسری کیفیت اور کونسی ایسی پیدا ہوتی ہے جس کی بنا پر ہم ان دونوں مفہوم کو باہم ایک دوسرے سے ایجاباً یا سلباً مرتبط کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہمیں اُن چیزوں کی حقیقت ذاتی پر غور کرنے سے ملتا ہے جن کی صورتیں ہمارے ذہن کے آئینہ میں کھنچتی ہیں اور جن کی لفظی تعبیر ہم اُن ناموں سے کرتے ہیں جو قضیوں اور حکایتوں میں موضوع اور محمول کے نام سے مذکور ہیں۔ دو تصورات کو باہم مرتبط کرنا۔ اُن پر ایجابی یا سلبی حکم کرنا۔ درحقیقت اُن چیزوں کی حقیقت اور ماہیت کے جاننے پر موقوف ہے جن پر موضوع اور محمول کا حقیقتاً اطلاق ہوتا ہے۔ نہ کہ اُن چیزوں کے اسماء پر جو قضیہ میں

موضوع اور محمول کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

یہ تقریر تیسری وجہ معقول اس بات کی ہے کہ منطق کی تحصیل میں طالب فن کو سب سے پہلے اسما کی دلالت اور نیز ان اسما اور ان کے معانی مدلول کے باہمی تعلقات سے بحث کرنا حصول مقصد کا پہلا مرحلہ ہے جس کو طے کیے بغیر صراط مستقیم پر چلنا دشوار نظر آتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اسما کے معانی اور مفہوم کا علم ہمیں صرف ان غلط رایوں سے بچا امکان محفوظ رکھ سکتا ہے جو ناقص الفہم لوگوں نے ان چیزوں کی بابت قائم کی ہے جن کی تعبیر لفظی ان ناموں سے کی جاتی ہے لیکن چونکہ فلسفہ کا مقصد حقیقت واقعی کا حاصل کرنا ہے نہ کہ ان خیالات کا جن سے تعین اور عدم تعین کا کچھ بھی پتہ نہ چلے اس لیے ہم الفاظ کو نظر انداز کر کے صرف ان چیزوں کو زیر بحث رکھ سکتے ہیں جن پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں ہم بجائے الفاظ کے خود ان چیزوں پر کیوں غور و فکر نہ کریں تاکہ ہم اس امر کو صحت کیساتھ متعین کر سکیں کہ کتنے سوالات ان چیزوں کے ادراک اور انکشاف کے متعلق ہمارے ذہن میں گذر سکتے ہیں اور کن طریقوں سے ہم ان سوالات کے جواب ادا کر کے ان چیزوں کا صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ مسلک جس کی تائید دنیا میں کسی شخص کے امکان میں نہیں ہے) درحقیقت اسلاف کی تمام کوششوں پر پانی پھیرنے والا اور خرمن علم کو تباہ و برباد کرنے والا ہے۔ اس معترض کے سوا اور کوئی شخص اس بات کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ خدا نے صرف اسی ایک شخص کو ایسی قوت ادراک عطا کی ہے کہ اپنے تنہا مطالعہ سے عجائبات عالم میں ہر شے کی حقیقت واقعی سے اسے پوری اطلاع ہو گئی ہو ورنہ ہر ذہن سلیم اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اضافہ معلومات اپنی تنہا کوشش سے کہیں زیادہ اسلاف اور ہمعصر فضلا کی تصنیف اور تالیف کے مطالعہ پر موقوف ہے۔ یہ امر کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے کہ اگر ہر شخص کے خزینہ معلومات سے ہم ان گراں بہا علمی جواہرات کو علحدہ کر دیں جو اس نے دوسروں سے حاصل کیے ہیں تو خود اس کی دولت علم کی وقعت ہماری نگاہوں میں ہو سکتی

ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ایک منفرد شخص اپنے ذاتی تجربات سے اتنا علم بھی حاصل کر لے جتنا کہ اُس کے ہمعصر فضلا نے دوسروں سے اخذ کیا ہے تو بھی وہ تمام تصورات جو تنہا اس شخص کے ذہن میں محفوظ ہیں ہرگز اُن مجموعی تصورات کی طرح جو تمام اقوام عالم کے دل و دماغ میں جگہ پائے ہوئے ہیں ایک کامل فہرست اسباب علل کی پیش نہیں کر سکتے چیزوں کی ہر ترتیب و تقسیم جو وضع الفاظ کے ذریعہ سے نہ کی گئی ہو ہرگز اُن مختلف قسموں پر اس طرح دلالت نہ کرے گی کہ دنیا انہیں آسانی سے سمجھ لے بلکہ ایسی تقسیم صرف اُسی ایک شخص کے ذہن میں اختلاف مراتب کا فائدہ دے گی جس نے اس قسم کی تقسیم کو جائز رکھا ہے۔ اور جب کبھی کہ اُس سے دوسروں کی تعلیم مقصود ہوگی تو پھر اُسی قدیم رواج کی طرف عَود کرنا پڑے گا اور ہر تقسیم ہر فرد کو اس طرح جداگانہ ناموں سے نامزد کرنا پڑے گا کہ اُن کی تعریف اپنے تمام افراد کو حاوی اور غیر کو اُس گروہ میں داخل ہونے سے مانع ہو۔ لیکن اگر ہم ابتدا ہی سے ہر تصور ذہنی کو وضع لفظی کے ساتھ متعین کر دیں اور ہر ہر صورت کو جدا جدا ناموں سے نامزد کر دیں اور پھر اس کے بعد ہم جنس چیزوں کی ترتیب و تقسیم کا تعین کریں تو یہ فعل ہمارا علاوہ اپنی آسانی کے دوسروں کی سمجھ میں بھی آجائیگا اور تمام عالم کو اِس سے یکساں فائدہ پہنچیگا۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ یہ امر ممکن ہے بلکہ ایسا ہوا بھی ہے کہ لوگوں نے اختلاف مدارج کے تعین میں بلا ضرورت اس درجہ بھی غلو کیا ہے کہ اسما کے اختلاف کے ساتھ اُن چیزوں کی حقیقت میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے جو ذات اور ماہیت کے اعتبار سے بالکل متحد ہیں۔ لیکن یہ غلطی ایسی نہیں ہے جس پر ہم آغاز کتاب میں کچھ تنقید کریں۔ ابتدائے بیان میں ہمیں اپنے فن کی ترتیب اور تقسیم کو بھی اہل نحو کی ترتیب اور تمایز سے مطابق رکھنا چاہیے تاکہ تعلیم کے راستے میں استقامت اور آسانی پیدا ہو اگر کہیں دقت نظر ہمیں اس بات پہ مجبور کرے گی کہ ہم نحو کی ترتیب سے اختلاف کر کے اپنی تقسیم جداگانہ مرتب کریں تو بضرورت

خاص ایسا کرنا ہمارے لئے بیجا نہ ہوگا۔ جانچ و پڑتال کے پہلے ہی مرحلہ میں واقعات کی گردن میں نظریات کا جوا ڈالنا کسی منطقی کا فرض نہیں ہے۔ دراں حالیکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس قسم کی جکڑ بندیاں کرنے کے موقع بعد کو آئندہ چل کر آئینگے جہاں یہ قیود اپنی اصل جگہ پر ہونے کی وجہ سے مناسب اور موزوں خیال کی جائیں گی۔

دوسری فصل

اسما

نام کی تعریف اور اس کے مصداق کی تحقیق

مسٹر ہاب نام کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ نام آواز کے اس لفظی نشان کو کہتے ہیں جو اس لئے بالقصد وضع کیا گیا ہے کہ جب ہم اسے بولیں تو پھر ہمارے ذہن میں وہی صورت چھپ جائے جو وضع کے وقت ذہن میں موجود تھی اور جسے سنکر ہمارا مخاطب بھی اسی چیز کا تصور کر سکے جو تکلم کے وقت ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس تعریف میں متکلم اور مخاطب دونوں پہلوؤں پر جس خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ حقیقتاً بیحد واضح اور بے مثل ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسمار کی وضع کا مقصود اس تعریف کے مفہوم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے اور بھی فوائد مدنظر ہیں جو اس تعریف میں صراحۃً مذکور نہیں ہیں لیکن تعریف ہے اس قدر جامع اور مانع کہ ان تمام فوائد کو ضمناً حاوی ہے۔

اس مقام پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسما ان چیزوں کے نام ہیں جو ذہن میں متصور ہیں یا ان چیزوں کی صورتوں کے نام ہیں جو علم کے وقت آئینۂ ادراک میں چھپتے ہیں۔ پہلا مسلک تو عام اہل فن کا ہے دوسرا مشرب چند علمائے نفسیات کا ہے جنکی رائے یہ ہے کہ اس مشرب کے جاننے سے ایک خاص تمایز اسمار میں ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے مسلک پر چلنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ ایک محقق مصنف اسی مشرب کی حقیقت بیان

اپنے ایک رسالہ میں لکھتا ہے کہ نام جن کو ہم روزانہ تقریر و تحریر میں استعمال کرتے ہیں اُن چیزوں کے نام نہیں ہیں جن پر وہ خارج میں صادق آتے ہیں بلکہ چیزوں کی اُن ذہنی صورتوں کے نام ہیں جو تکلم کے وقت ہمارے آئینہ ادراک میں چھپتی ہیں۔ لفظ پتھر کے تکلم کی آواز کا نفس پتھر کا نشان ملفوظی نہ ہونا اس سے زیادہ اور کچھ معنی نہیں رکھتا کہ اس آواز کو سن کر سامع اس بات کا اندازہ کر لیتا ہے کہ متکلم کے ذہن میں اُسوقت پتھر کی ماہیت کا تصور ہے۔ اگر اس تحقیق سے یہ مراد ہے کہ نام کے تلفظ سے صرف مسمی کے بہت تصور کا اعادہ اور افادۂ متکلم از سامع کو ہوتا ہے اور نفس ذات مسمی کے بابت کوئی اضافہ اور اطلاع نہیں ہوتی تو اسمیں شبہ نہیں کہ یہ تحقیق ہر طرح پر قابلِ قبول ہے لیکن اگر دوسرے مشرب کی حقیقت اس تحقیق سے ثابت ہوتی ہے تو پہلے مسلک کی قبولیت کے بھی چند قوی دلائل ایسے ہیں جن کی ماہیت کو بلا اس کے کہ ہم قبول کریں اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

لفظ آفتاب کی نفس ذات آفتاب کا نام ہے نہ کہ تصور آفتاب کا۔ نام سے صرف یہ ہی مراد نہیں ہے کہ لفظ کو سُن کر سامع بھی متکلم کا صرف ہم خیال ہو جائے بلکہ اس کے علاوہ اس کا اصل مقصد یہ بھی ہے کہ سامع کو اس بات کی اطلاع بھی ہو جائے جس کا متکلم کو یقین ہے مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ طلوع آفتاب دن ہونے کی علت ہے تو ہماری غرض یہ نہیں ہوتی کہ تصور آفتاب سے ہمارے ذہن میں دن کی صُورت بھی چھپ جاتی ہے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک واقعہ نفس الامری جسے طلوع آفتاب کہتے ہیں دوسرے واقعہ نفس الامری کی علت ہے جس کی تعبیر دن کے نام سے کی جاتی ہے۔ اس بنا پر یہی امر قرین قیاس ہے کہ نام سے ہمیشہ وہی چیزیں مراد لینی چاہئیں جو اُن ناموں کے بولنے سے سمجھی جاتی ہیں جن کی بابتہ ہم کسی واقعہ کے ثبوت یا عدم ثبوت کی حکایت کر سکیں جیسے ہم یہ الفاظ مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر لفظ کا حقیقی مدلول دراصل وہ چیز ہے جس کی بابت ہم کوئی خبر یا اطلاع دے سکیں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر اس رسالہ میں جہاں کہیں کہ اسما کا ذکر ہوگا وہاں اُن

اسمائے خود وہ چیزیں مراد ہوں گی جن کے نام یہ اسما لغت میں وضع کئے گئے ہیں نہ کہ اُن چیزوں کی ذہنی صورتیں جو ذہن کے آئینہ میں چھپی ہیں۔

فدا علی

یادداشت دربارۂ ترقی صنعت ممالک محروسۂ سرکارعالی

(از ڈاکٹر جی جے فولر صاحب پروفیسر آف اپلائڈ کمسٹری انڈین انسٹیٹیوٹ آف بنگلور)

سرکار نظام کی درخواست پر جمعہ ۲۳ جون کو میں حیدرآباد پہنچا۔ مختلف طریقوں۔ کارہائے رفاہ عام کو دیکھتے ہوئے حکام سے ملکر اور عموماً ممکنہ صنعتی ترقیوں کی اطلاع بہم پہنچاتے ہوئے قریب ایک ہفتہ قیام کیا۔

اب میں مذکورۂ ذیل یادداشت پیش کرتا ہوں جسمیں

(۱) قابل غور خاص صنعتی ترقیات

(۲) وزی عمل کے متعلق ہدایات بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) صنعتی ترقیات

صنعت مہوہ | ترقی کا سب سے بڑا اصل ذریعہ اُن پیداواروں سے وابستہ ہے جو گلمہوہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ جس کی نامحدود مقدار ریاست میں موجود ہے۔ صدر ناظم صاحب مال کی معیت میں میں نے حیدرآباد کی بڑی ڈسٹلری دیکھی اور اُن طریقوں سے اچھی طرح واقف ہوگیا۔ جو وہاں عمل میں لائے جاتے ہیں۔

ہر قسم کے اُبالنے اور نتھارنے کے آلات چند گیالن کی گنجائش سے لے کر دس ہزار

گیالن کی گنجائش تک کے مع ساز وسامان کے اسوقت مستعمل ہیں۔ یہ ڈسٹلری الکحل کی بڑی مقدار تیار کرسکتی ہے۔ فی الوقت روزانہ ۰۰۰۰ ۱ گیالن تیار ہوتے ہیں۔ اور اسی اسپرٹ کی اقتصادی استعمال کی ہدایت پر غور کرنا ہی پہلے درجہ کی اہمیت رکھتاہے۔ اولاً موجودہ طریقہ میں ترقی کے یقینی امکانات بتائے جاتے ہیں۔

(۱) موجودہ طریقۂ ڈسٹلری میں ممکنہ ترقیات

(الف) یہ ممکن ہے کہ اگر مہوہ ایک ہی کل میں ریسٹ پر بیبا جائے اور اکٹھا ہی جمع کیا جائے تو اس ذخیرہ سے شکر کا نقصان کم ہوگا اور لگدا آسانی اور مستعدی سے بنایا جاسکیگا مزید براں چیتہ اُبالے جانے کے بعد آسانی سے حاصل کیا جاسکے گا اور استعمال کے قابل ہوگا۔ بحالتِ موجودہ تمام مہوہ ابتدائی چیتہ بنانے کے حوض پر بہتار ہتاہے اور چونکہ اس کو مسلسل ہلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور شراب کے ساتھ ملانا پڑتا ہے اِس لئے اخیر میں اُس کا بہانا مشکل ہوجاتاہے۔

(ب) فی الوقت مہوہ کو اُبالنے کے آلات اور اُن کے پرزوں کے ٹھیک طریق عمل سے بہت کم واقفیت ہے۔ اور چونکہ چیتہ رس نکالنے سے پہلے اُبالا جاتاہے اور کوئی تازہ خمیر اضافہ نہیں کیجاتی یہ ظاہر ہوگا کہ اسمیں جوش ہوا کے تقدیہ سے واقع ہوتاہے۔ ہوشیاری جسے علم جراثیم کی تعلیم بظاہر یہاں پسندیدہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ٹھیک نگرانی کرنے کی صورت میں زیادہ صاف پیداوار بڑی مقداریں حاصل ہوسکے۔ بحالت موجودہ بہتے ہوئے مادہ کو صاف کرنے کی نسبت ٹھوس اجزا کو صرف حوضوں میں ٹھہاکر علیحدہ کرنے کے سوائے اور کچھ نہیں کیا جاتا۔ جو میں سمجھتاہوں ندی میں پہنچنے پر بے حد بدبو کا باعث ہوتاہے۔ اس تعفن کے دفعیہ اور قیمتی ٹھوس مادہ کو کھاد کے طور پر کام میں لانے کیلئے وسائل سوچنا چاہیئے۔ متفرق طور پر طریقہ کشید شراب کو ترقی دینے کے لئے کوشش سے نئے ذرائع داخل کئے جاسکتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

اسٹیک ایسڈ اور اس کے مشتقات کی تیاری

ڈائلموٹ الکملک ورٹ کیڈ سے پہلے، اسٹیک ایسڈ کی بناوٹ میکوڈرما سیٹی کے ذریعہ اسٹیک ایسڈ میں جوش دیا جا سکتا ہے۔ اس کی تکمیل کا معمولی طریقہ جو سریع طریقہ کے نام سے موسوم ہے اور الکملک ورٹ کو بیچ وڈ شیونگس پر ہوا کی موجودگی میں جبکہ الکمل تیزی سے سرکہ میں بدل رہا ہو ڈرانے میں مستعمل ہے۔ یہ یقینی ہے کہ ہوا کے ذریعہ نالیاں صاف کرنے کے موجودہ طریقہ پر جدید اور ترقی کردہ طریقہ کو رواج دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت زیادہ پیداوار حاصل ہو سکے گی مگر یہ کام خاص تحقیق کا محتاج ہے۔

اسٹیک ایسڈ سے چونہ۔ الومنیم اور لوہے کے اسٹیٹ جو رنگنے کی حیثیت سے قیمتی چیزیں ہیں حاصل کئے جا سکتے ہیں کلشیل اسٹیک ایسڈ اور دوسری قیمتی کیمیائی چیزیں بھی اسٹیٹ سے حاصل ہوتی ہیں۔

موٹر کے اغراض کے لئے مہوا اسپرٹ کا استعمال

میرے قیام حیدرآباد کے زمانے میں عملی شہادت میرے سامنے یہ بتانے کے لئے پیش کی گئی کہ مناسب اضافہ کیساتھ مہوہ اسپرٹ پٹرول کے قائم مقام کی حیثیت سے اطمینان بخش طور پر اندرونی طور پر چلنے والی کلوں خصوصاً موٹر کار میں استعمال ہو سکتی ہے یہ نتیجہ دریافت بہت بڑی اقتصادی اہمیت رکھتا ہے اور اسپرٹ کے موثر نہ ہونے کے حالات اور اس کو ایک مہتم بالشان چیز بنا کر استعمال کرنے کے طریقوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

(۴) راب کو صاف کرنا اور اُن سے رنگ نکالنا

جبکہ کنکی ہونے کے قابل شکر قند کی کچھ مقدار اُس راب میں موجود ہے جو مہوہ پانی میں ڈبونے کے وقت حاصل ہوتی ہے تو اسمیں شبہ ہوتا ہے وہ قابل عمل ہو سکیگی

کنکری نہ ہوسکنے والی "الورٹ" یا "گریپ شکر" بہر حال مٹھائیوں کے بنانے میں اور مربہ بنانے کے لئے مستعمل ہوسکتی ہے۔ اس لئے راب کو صاف کرنے اور رنگ نکالنے کا کوئی ذریعہ دریافت کرنا ضرور ہے اس بارہ میں جو تحقیق کی جائیگی وہ نفع بخش ثابت ہوگی

(۵ متفرق) عطریات ٹنکچرس اور رس بنانے کے لئے مہوہ اسپرٹ بہت کارآمد ہے مگر اس کے لئے اُس کو ہوشیاری سے صاف کرنا اور اس کا رنگ نکالنا چاہئے اور یہاں تحقیق کی ضرورت ہے۔

تیل کی صنعت ریاست حیدرآباد میں روغندار تخم کی بڑی مقدار موجود ہے مخصوص تخم مہوہ بنولہ۔ ولایتی مونگ۔ تخم ارنڈ۔ ان بیجوں سے تیل نکالنے کے لئے گھنے پیسنے والی کل کی ضرورت ہے جس کی نسبت انگلستان میں تحقیقات ہورہی ہے۔

بعض تیلوں سے جو اس طرح حاصل کئے جائیں عمدہ مارگرین (گھی) نیز صابون اور گلیسرین تیار کرنا ممکن ہوگا۔ اور دوسرے تیل راست فروخت کئے جاسکتے ہیں۔ ضروری کل کے آنے تک مارگرین کے ملاپ اور صابون سازی کے مسائل پر اُن تیلوں سے جو ہم دست ہوسکیں قیمتی تحقیق کا کام لیا جاسکتا ہے۔

جنگلی پیداوار ناظم صاحب جنگلات سے معلوم ہوا ہے کہ دباغت کے لئے اشیاء مہوہ اور رنگ کی لکڑی یہاں مل سکتی ہے اسمیں بغور تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے چمڑے کی بہت بڑی مقدار دریافت کے لئے فراہم ہوسکتی ہے۔ لاک اور وارنش کی صنعت میں مہوہ کو گلانے والے کے بجائے مہوہ کا الکحل استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ باور کرنے کی عمدہ دلیل موجود ہے کہ دیسی رنگ اگر اُن کی قیمت مقرر کردی جائے اور ایسی شکل میں بنائے جائیں جنہیں رنگریز فوراً استعمال کرسکیں تو مقامی دوکانوں میں نظر آئیں گے۔

لاک کی کاشت ہے چونکہ اس الکحل کی بڑی مقدار ہمدست ہوگی جو لاک کے منفعہ کو

گلائیگی۔ محنت کا پورا صلہ مل سکے گا۔ فی الوقت بہت کم لاک کی ریاست میں بہت کم کاشت ہوتی ہے مگر لاک کے کیڑے کی نشوونما کے لئے مناسب درخت بڑی تعداد میں یہاں موجود ہیں لاک کی بڑی صنعتوں کے قطع نظر مجھے خاص ہنرمندانہ "بیائل" کا کام جو حیدرآباد میں ہوا دکھایا گیا اس کے لئے لاک ایک اہم مادّہ ہے۔

نیشکر | ریاست حیدرآباد میں نیشکر کی اقتصادی افزائش کی صورتیں بغور مطالعہ کی ابتک محتاج ہیں مگر کوئی ایسا سبب نہیں معلوم ہوتا کہ کیوں شکر کی بڑی مقداریں یہیں پیدا نہ کی جائیں۔ اہم سوال زمین کو ٹھیک طور پر درست کرنا ہے تاکہ نیشکر مضبوط جڑ لے سکے اس مسئلہ کے حل میں کہ وہ کونسی صورتیں ہیں جو زمین کی طبعی حالت پر موثر ہوں۔ دارالعمل کی تحقیق سے مدد لی جا سکتی ہے مجھے کہا گیا ہے کہ شکر صاف کرنے کے کارخانے کے قیام میں جو مشکل ہے وہ اس کا کفایت خرچ کرنا ہے۔ یہ تجویز کی جا سکتی ہے کہ انہیں ابال کر حیدرآباد کی ڈسٹلری میں الکحل اور دوسری پیداوار کے بنانے کے لئے بھیجا جائے جبکہ جاوا سے راب اس طریقہ پر بنگلور بھیجی جاتی ہے تو بظاہر حیدرآباد میں نقل وحمل کیلئے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

نمکیات | سوڈا یا کھار کے بڑے بڑے ذخیرے لسونار جھیل برار میں جو جالنہ سے ۳۰ یا ۴۰ میل ہے موجود ہیں اس طرف میری توجہ منعطف کرائی گئی ہے۔ ایسا ذخیرہ اگر اچھی خاصیت کا ہو تو بہت سی صنعتوں خصوص صابون۔ کانچ یا کاغذ کے لئے ایک ضروری مادہ ثابت ہوگا۔ موجودہ واقفیت کے لحاظ سے میری یہ رائے ہے کہ ریاست کی کھاری باولیوں کی نسبت جنہیں نیٹریٹ آف پوٹاش شامل رہنے کی اطلاع دی گئی ہے۔ فوری تحقیقات عمل میں لائی جائے۔

مختلف ریشوں سے جو ریاست میں اگتے ہیں کاغذ بنانے کا مسئلہ بغور توجہ کا محتاج ہے۔ ایسے ریشوں میں رس نکالی ہوئی نیشکر یا "لیگاسشے" روئی کے ڈنٹل

(اور میں مطلع کیا گیا ہوں) وہ ریشہ بھی جو "اسپارٹو گراس" کے مماثل ہیں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اس کام کے مذکورہ بالا ہدایات ہر طرح حیدرآباد میں ممکن ہیں مگر کچھ عرصہ تک ان کیلئے زیادہ محنت درکار ہوگی۔

فوری کام کی نسبت ہدایت

قبل اس کے کہ حقیقی صنعتی کاروبار میں کوئی حصہ لیا جائے۔ ایک چھوٹے نمونہ پر دارالعمل کی تحقیق کے ذریعہ ابتدائی مراتب مسلمہ قائم کئے جانا چاہیے۔

دارالعمل کی تیاری اور کیمیاگروں کی تربیت

اس لئے یہ معلوم کرنا نہایت اطمینان بخش ہے کہ فی الحال ایک دارالعمل ڈسٹلری میں بنایا جارہا ہے جس کی بنا پر اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ قیمتی تحقیق اور با اصول کام کیا جائے گا۔ تاکہ وہ لوگ جو آئندہ اس دارالعمل کو استعمال کریں گے بہترین نفع سے کام لے سکیں۔ اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ ایسے طلبہ انڈین انسٹیٹوٹ آف سائنس میں ایک عرصہ تک زیر تربیت رہیں انسٹیٹوٹ میں نہ صرف دارالعمل تحقیقات کیمیاوی وحیاتیی کی سہولت اور ان کا سازوسامان ہے۔ بلکہ اسمیں کارخانہ برقی اور نجار کی طاقت بھی موجود ہے۔ تاکہ جو تجربے کارخانے اور دارالعمل کے متعلق ہیں تجربہ کی جا سکیں۔ اس لئے کہ طلبا انڈین انسٹیٹوٹ آف سائنس میں اپنا وقت منفعت سے خرچ کریں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اس سے پہلے کم از کم ٹھیک ابتدائی تعلیم پائے ہوں یعنے وہ کسی مسلمہ جامعہ کی سند رکھتے ہوں جسمیں کیمیا مضمون خاص ہو۔ ایک یادداشت جس سے ابتدائی پسندیدہ تعلیم کی نوعیت ظاہر ہوگی اس کے ساتھ دی گئی ہے۔ گو پہلے پہل میں ایسے طالب العلموں کو حاصل کرنا ناممکن ہو مگر امید ہے کہ درخواست پر ضرور اس میں کامیابی ہوگی۔

ریاست حیدرآباد ان طلبہ کے تمام اخراجات ادا کرے گی اور خاص سازوسامان

کی قیمت جو انسٹیٹیوٹ کے موجودہ سامان کے سوا ہو اور اُن کی تحقیقات بڑھانے کیلئے ضروری ہو۔ قیمت بھی ادا کرے گی۔ یورپ کے وظیفہ تعلیمی کی بابت میری رائے پوچھی گئی ہے۔ میرے تجربے سے اور انگلستان میں ہندوستانی طلبہ کی نسبت میرے معلومات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے وظائف اگر اُن طلبہ کو دیئے جائیں جنہوں نے ابتدائی دفن تعلیم ہندوستان یعنے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس میں اور کارخانہ میں نفع بخش پائی ہے۔ بہت زیادہ قیمتی ثابت ہوں گے۔ یہ طلبا تجربہ سے اول چند مشکلات کو جو ہندوستان میں صنعتی کیمیاگر کو پیش آتی ہیں معلوم کرلیں گے۔ اور کسی چیز سے جیسے وہ انگلستان میں یا جہاں کہیں برٹش ریاست میں دیکھ سکیں قیمتی نفع اُٹھانے کے زیادہ قابل ہوں گے۔

خاتمہ پر میں اُن تمام حضرات کا جنہوں نے مہربانی سے میرے مختصر زمانہ قیام حیدرآباد میں معلومات حاصل کرنے میں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ بلا تاخیر ریاست حیدرآباد کے قدیما نامحدود ذرائع کو ترقی دینے کے لئے ضروری ابتدائی کام جاری کرنے میں مستعدی سے حصہ لیا جائیگا۔

مترجم۔ ا۔ م

خلیفہ منصور عباسی

(از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم۔ اے پروفیسر (دارالعلوم)
(گذشتہ سے پیوستہ)

بنوامیہ کی تباہی کے بعد بنو علی کو معلوم ہوا کہ اُن کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ ان کے نزدیک بنو عباس※ اور بنوامیہ دونوں کی خلافت میں کچھ فرق نہ تھا کیونکہ دونوں انکے رشتہ دار تھے۔ اگرچہ بنوامیہ سے ذرا دور کا رشتہ تھا۔ مگر یہاں پر صرف ہاشم ہی کا نام کافی نہ تھا کیونکہ جب اہلبیت کے لئے خلافت کی کوشش کی جارہی تھی تب سب کو آنحضرت (صلعم) کی اصلی اولاد کو یہ منصب دلائی جانے کا خیال تھا جو بجا طور پر اب اس کو اپنی حق تلفی خیال کرتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ عباسیوں نے بھی پوشیدہ نامہ و پیام کے ذریعہ شروع ہی میں محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسین بن علیؓ کو تمام خاندان کا سردار اور خلیفہ تسلیم کرلیا۔ حضرت علی کی تمام اولاد میں اس شخص کے انتخاب کی وجہ ہم کو معلوم نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ ایسے وقت میں جبکہ اہل بیت کے دعوے کے طرفدار بہت لوگ تھے اس شخص کے انتخاب میں ایک فائدہ ضرور تھا۔ کہ اس کے شجرہ نسب میں تمام عورتیں عرب کے شریف خاندان کی تھیں اور یہ کہ محمد بن عبداللہ اپنے دادا کی طرف سے حسین

※

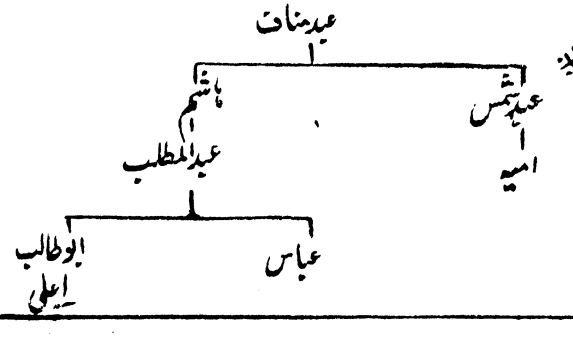

کی بھی اولاد میں سے تھا۔ اور اس طرح آنحضرت* (صلعم) سے دو طرف کا تعلق تھا۔ اس کا باپ جس کا دعویٰ اس سے بھی زیادہ پختہ تھا یا تو حد سے زیادہ بزدل تھا یا لالچی نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے تخت خلافت کا دعویٰ بالجہر نہ کیا۔

بنو عباس کو خوب معلوم تھا کہ کس طرح وہ لوگ تخت کے مالک بنے۔ اور اسی لئے وہ اپنے چچیرے بھائیوں کے موروثی حق سے جلتے نہ تھے۔ وقتاً فوقتاً بنو علی میں سے ایک آدھ شخص صورت حالات پر کھلم کھلا اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ منصور اپنے بھائی سفاح کی عین حیات ہی میں حج کو گیا۔ محمد مذکور الصدر۔ اور اس کا بھائی محمد ابراہیم اس وقت منصور کے پاس نہ آئے۔ اُسی وقت سے منصور کو ان پر شبہ تھا۔ منصور کا محمد بن عبداللہ کا حق خلافت تسلیم کرنا ہی موخر الذکر کی قید کا باعث بن گیا۔ منصور نے ان دونوں بھائیوں کو دھمکیوں سے ڈرایا اور وعدوں سے امید دلائی۔ مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ یہ دونوں بھائی عرب کے مختلف مقامات میں پوشیدہ رہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس سے بھی دور دور گئے۔ منصور نے بار بار اِن کے باپ سے ان کی نسبت دریافت کیا۔ مگر اس نے ہمیشہ اپنی لاعلمی ہی ظاہر کی۔ آخر کار جب منصور ۷۵۸ء میں حج کو گیا تو اس نے اس کو قید میں ڈال دیا مگر اس ترکیب سے بھی عقدہ کشائی نہ ہوئی۔ مدینہ کے حاکم ان پناہ گزینوں کی یا تو دیدہ دانستہ تلاش نہ کرتے تھے اور یا وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اہالی شہر بنو علی کے اہلبیت اور اُن کے ہم وطن ہونے کی

*

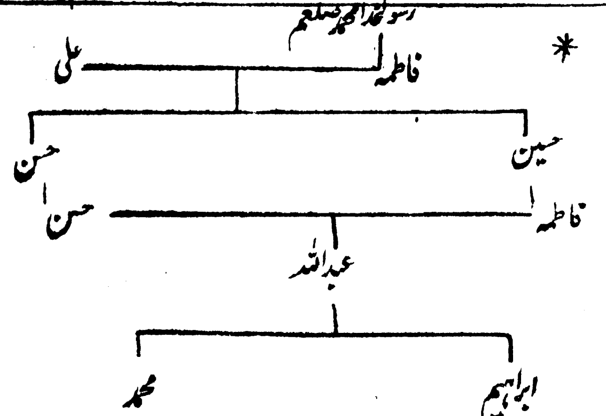

وجہ سے اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور اکثر عہدہ دار تو ان کا حوالے کرنا گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے۔ مگر ریاح جو ۲۷ دسمبر ۷۶۱ء میں مدینہ کا حاکم مقرر ہوا ان تمام کمزوریوں سے مبرا تھا اس نے لوگوں کو دھمکیاں دیں اور اہلبیت کے قریبی رشتہ دار اور اُن کے طرفداروں کو قید کیا اور چند جہنیہ بدوین کو پکڑ لیا۔ کیونکہ یہ قیاس تھا کہ تخت کا چھوٹا دعویدار مدینہ کے مغرب کیطرف ان کے پہاڑوں میں پوشیدہ ہے۔ جب ۷۶۲ء میں دوسرے حج کے بعد منصور مدینہ گیا تو وہ ان بنو علی کے قیدیوں کی اُن دونوں بھائیوں کے باپ اور چند بڑے بڑے آدمیوں سمیت پابزنجیر عراق لے آیا۔ ان اسیروں میں عبداللہ کا سوتیلا بھائی بھی تھا۔ اس نے اپنے وعدے کے خلاف اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے (جو تخت کا دعویدار تھا) سے کر دی تھی۔ علاوہ ازیں حضرت عثمان کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ منصور کے لئے بڑا خطرناک تھا۔ محمد کا ایک بیٹا والیٔ مصر کے ہاتھ آیا جس کو اُس نے فوراً خلیفہ کے پاس بھیجدیا۔ مؤرخوں کا یہ بیان کہ منصور ان قیدیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا ایک حد تک قابلِ تسلیم ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض تہ تیغ کیے گئے اور بعض قید خانہ ہی میں مر گئے۔ عوام کے تخیل اور ذاتی نفرتوں نے اسمیں اور رنگ آمیزی کی اور اس کو ایک اہم واقعہ بنا دیا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ منصور نے ان تمام مقتول بنو علی کی لاشیں ایک بڑے مکان میں محفوظ رکھیں اور ان میں سے ہر ایک کے کان میں اُس کے شجرہ نسب اور نام اویزاں کیا۔ اس کمرے میں سوائے منصور کے کوئی نہ جانے پاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بیٹے مہدی نے اس کو کھولا مگر ہیبت زدہ ہو کر بند کر دیا اور بعد میں حکم دیا کہ تمام لاشیں نکالکر دفن کر دی جائیں۔

ریاح کی تلاش سے خائف ہو کر محمد نے قبل از وقت ۷۶۲ء میں علم بغاوت بلند کیا۔ محمد خلیفہ مشتہر کیا گیا۔ تمام قید خانے مسمار کر دیئے گئے اور والیٔ شہر اور منصور کے اور عاملوں کو قید کر دیا گیا حضرت مالک ابن انس نے فتویٰ دیدیا چونکہ بنو عباس نے لوگوں سے بالجبر بیعت لی ہے لہٰذا یہ لازمی نہیں کہ لوگ اُنکی طاعت کریں مالک ابن انس کے اس فتویٰ نے بارود پر آگ کا کام کیا چنانچہ ابوبکر کی اولاد اور قبیلہ کے آدمی جنہوں نے عباس کی خلافت

کارہائے نمایاں کئے تھے۔ محمد کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ ان ہی لوگوں میں ابوالولی ذی الال بھی تھا جو بنو امیہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا اور جس کو خاندانی نفرت بنو عباس کے خلاف کشاں کشاں لے آئی تھی۔ ان لوگوں کو تدبیر اور فوجی لیاقت اپنے آبا و اجداد سے وراثت میں کم ملی تھی۔ عقلمند لوگ شروع ہی سے تاڑ گئے تھے کہ اس میں کامیابی کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ جب ایک قاصد منصور کے پاس کوفہ میں نو دن کے غیر معمولی عرصہ کے بعد پہنچا اور اُس کو اس بغاوت کی خبر سنائی تو وہ بالکل نہ گھبرایا بلکہ کہنے لگا کہ "آخر کار میں نے لومڑی کو اس کے بل سے نکال لیا"۔ تمام شہروں میں مدینہ اس بغاوت کے لئے بڑا خطرناک اور ناموزوں شہر تھا کیونکہ تمام علاقہ مصر کی درآمد کا دست نگر رہتا تھا۔ منصور نے فوراً اس درآمد کو بند کر دیا اور اُسی وقت اپنے بھتیجے بھائی عیسیٰ بن موسیٰ کو چند بیکار آزمودہ سپاہیوں کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔ محمد اور دوسرے بنو علی دعویداروں کی طرح اس کام کے لائق نہ نکلا اس کو چاہئے تھا کہ آزمودہ کار لوگوں کی صلاح سے کام کرتا اور حملہ آوروں کے خلاف جارحانہ کارروائی اختیار کرتا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو مدینہ میں بند کر لیا کیونکہ اُسے خیال تھا کہ مدینہ کی حرمت ہی سب سے اچھی محافظ ہو سکتی ہے۔ مزید حفاظت کے خیال سے اس نے آنحضرت کی خندق کو درست کروایا۔ یہ ایسا کام تھا جس نے محمد کے تمام عرب ساتھیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ کھلے میدان کی لڑائی یا لگاتار جنگ کے عادی نہ تھے اس کے خلاف خراسان کے خرانٹ سپاہیوں کے نزدیک یہ سب بازیچہ اطفال سے زیادہ نہ تھا۔ عیسیٰ نے شروع میں نامہ و پیام کے ذریعہ محمد کے بہت سے کارگذار آدمی اپنی طرف کر لئے تھے اور محمد کے دیگر طرفداروں نے غنیم کو آتے دیکھ کر اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عیسیٰ خط و کتابت کے ذریعے صلح ہونے کی امید پر تین دن کے قریب مدینہ کے سامنے پڑا رہا مگر آخر کار حملہ کر دیا اور خندق کو مکانوں کے دروازوں سے پاٹ دیا۔ بنو عباس کی ایک عورت ایک بڑا سیاہ کپڑا لے کر شہر کے سب سے اونچے مینار پر آویزاں کر آئی۔ اس کو دیکھ کر

شہر کے معتمد آدمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ خراسانیوں نے پیچھے سے آکر شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ وہاں بنو عباس کا سیاہ جھنڈا نصب کر دیا گیا ہے۔ جہینہ بدوین کے علاوہ چند اور آدمی محمد کے ساتھ رہے باقی سب بھاگ گئے۔ محمد جو ایک لمبا اور خوبصورت آدمی تھا، دسمبر ۷۶۲ئہ کو تیسرے پہر بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس نے چند لمحہ پیشتر ہی ریاح کو مروا ڈالا تھا۔ محمد کی شہادت سے بنو علی کے شہدا کی تعداد میں ایک اور شہید اضافہ ہو گیا۔ اہلبیت کے طرفداروں نے محمد کو النفس الزکیہ کا خطاب دیا۔

عیسیٰ نے منصور کے حکم کے مطابق مقابلۃً رحم سے کام لیا۔ بنو عباس کو مدینۃ الرسول کی حرمت کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ اسی کی طرف وہ لوگ اپنے تمام حقوق کو منسوب کرتے تھے۔ اس بغاوت کے سرگروہ قتل کئے گئے۔ کچھ قید کر دیئے گئے۔ اور کچھ نے بدنی سزائیں بھگتیں۔ بنو علی کی اُس شاخ کا مال و اسباب جس سے محمد کو تعلق تھا تمام ضبط کیا گیا۔ اور اُس زمانہ کی رسم کے مطابق باغی کا سر خلیفہ کے پاس لایا گیا۔ جس نے قاصدوں کے ذریعہ عبرت کی غرض سے تمام صوبوں میں بھیجا اور آخر کار ۷۶۳ئہ میں مصر پہنچا اور جس کی وجہ سے وہاں بنو علی کے ایک گروہ کی بغاوت فرو ہوئی۔

ابھی مدینہ میں پوری طرح امن نہ قائم ہوا تھا کہ خلیفہ کو معلوم ہوا کہ ابراہیم نے بصرہ میں اپنے بھائی کی طرف سے علم بغاوت بلند کیا ہے۔ منصور کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ ابراہیم چھپا ہوا ہے۔ مگر اس نئی بغاوت کی خبر سُنکر وہ گھبرا گیا۔ بصرہ صرف ایک مالدار تجارتی شہر ہی نہ تھا بلکہ جنگ کے لئے مدینہ سے زیادہ اہم تھا۔ یہاں سے دجلہ و فرات کا راستہ بند کیا جا سکتا تھا اور مشرق کی طرف کے ساحلی صوبے آسانی کے ساتھ مسخر ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کوفہ بھی اس کے قریب تھا جو خلیفہ کا دارالحکومت تھا۔ کوفہ کا رجحان بھی بنو علی کی طرف تھا۔ اگر ایک علوی کچھ جماعت کے ساتھ اس کے قریب نمودار ہوتا تو بغاوت ہونا لازمی تھا۔ مزید برآں تمام وسطی صوبہ میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ منصور

کے پاس اسوقت صرف گنتی کے آدمی تھے۔ اور جیسا کہ اس نے بعد میں اعتراف بھی کیا یہ اسکی سخت غلطی تھی کہ اس نے اپنے پاس کچھ فوج نہ رکھی۔ اس کے بعد سے اس نے عہد کر لیا تھا کہ اپنے پاس ہمیشہ کم از کم تیس ہزار آدمی رکھیگا۔ منصور نے اس قلیل فوج کو جو اس کے پاس موجود تھی اس طرح منتظم کیا کہ کوفیوں کو اس کا اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی۔ اس کے علاوہ کوفیوں کی تمام بہادری محض زبانی جمع خرچ تھی۔ منصور ابھی ابراہیم کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ ابراہیم سوسیانہ اور پیرسس پر قابض ہو گیا اور بصرہ کا خزانہ بھی اس کے ہاتھ لگا۔ واسط نے بھی ابراہیم کی فوج کے واسطے اپنے دروازے کھول دیئے۔ اس شہر کے قریب ہی اس کی مڈبھیڑ منصور کے ایک افسر سے ہوئی اور اسی جگہ دونوں فوجیں جنگ کے اختتام تک مقابلہ پر تلی رہیں۔

ابراہیم پہلے ہی اپنے آپ کو بادشاہ مان چکا تھا۔ وہ اپنا تمام وقت اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ اس کے برخلاف منصور نے جنگ کے اختتام تک عورت کی شکل تک نہ دیکھی۔ ایک ہمعصر شاعر نے منصور کی مدح سرائی ایک فصیح و بلیغ قصیدے میں کی ہے اور بتایا ہے کہ منصور کس طرح اس اڑے وقت میں مستقل مزاج رہا۔ کوفے کو بغاوت پر اکسانے کی صلاح ابراہیم نے مسترد کر دی کیونکہ اس کو بچوں۔ عورتوں اور کمزور لوگوں کے نقصان کا خطرہ تھا۔ اسی خیال سے اس نے مفرورین کا تعاقب بھی نہ کیا۔ یہ تمام باتیں نہایت اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر وہ شخص جو اپنے فائدہ کے لئے بغاوت پر تلا ہوا تھا۔ اور اس لئے جسکو خونریزی لازم تھی اور وہ شخص جو اسی وقت فتحیاب ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ اپنے حواس کو مجتمع رکھے۔ ایسی باتوں کے لئے بالکل نااہل تھا۔ یہ رحمدلی نہ تھی بلکہ کمزوری تھی۔ کسی نے اس سے بجا طور پر کہا تھا کہ "تو خلافت کا خواہاں ہے اور قتل کرنے سے گریزاں"

اواخر دسمبر ۷۶۲ء میں ابراہیم کو اپنے بھائی کی وفات کی مایوس کن اطلاع ملی۔ اگر وہ اب بھی آگے بڑھ جاتا تو منصور کا ناطقہ بند کر سکتا تھا۔ مگر جب تک دس ہزار کو لے کر

آگے بڑھا عیسیٰ ایک لشکر جرار لے کر اس کی سرکوبی کو آموجود ہوا۔ دوسری طرف خلیفہ نے مدینہ سے تمام فوج ہٹا کر سوسیانہ کی طرف بھیجدی جس نے وہاں پہنچکر ابراہیم کے دار السلطنت اہواز پر قبضہ کر لیا۔ کوفہ سے ۱۶ گھنٹے کی مسافت پر مقام باخمرا پر ابراہیم (جو اب "خلیفہ" بن چکا تھا) کی فوج عیسیٰ کے لشکر سے مقابل ہوئی۔ منصور کے عقب کی فوج کو شکست ہوئی۔ مگر عیسیٰ برابر مقابلہ پر جما رہا۔ اس کو اس طرح جمے دیکھ کر منصور کی منہزم فوج بھی واپس آگئی۔ منصور کے چچیرے بھائی سلیمان کا بیٹا ابراہیم کی فوج کے عقب پر حملہ آور ہوا۔ آخر سخت جنگ کے بعد ابراہیم کے ایک تیر آکر لگا جس کی وجہ سے وہ جان بحق تسلیم ہوا خلیفہ نے اس کے سر کی بھی رسم کے موافق سر بازار نمائش کی مگر یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی اس کی ہتک کرے۔ چنانچہ اس نے ایک شخص کو اس بات پر سخت بے رحمی کے ساتھ سزا دی کہ اس نے ابراہیم کے منہ پر تھوک دیا تھا

عام خیال تھا کہ ابراہیم ہی کو فتح ہوگی۔ مشہور نابینا شاعر بشار نے ابراہیم کی مدح اور منصور کی ہجو میں ایک نظم لکھ کر ابراہیم کے پاس بھیجی تھی مگر جب ابراہیم کو شکست ہوئی تو اس نے اپنی اس نظم کو اس طرح بدلا کہ وہ اس کی پرانی تصنیف معلوم ہونے لگی اور جس میں سے ابو مسلم کی ہجو نکلتی تھی۔

محمد کی نسبت ابراہیم کی وفات سے منصور کو بہت اطمینان حاصل ہوا۔ اب اسکو ایک طرح کا یقین ہو گیا کہ آئندہ کوئی علوی دعویدار اس کیلئے خطرہ کا باعث نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اس تمام خاندان کی سخت نگرانی کی مگر اب بھی وہ ان میں سے ہر شخص کو اپنی ملازمت میں لینے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ قابل اعتماد ہو۔ یہ ممکن ہے کہ عربوں کا اپنے قبیلے کا لحاظ بھی اس کا سبب ہو۔ بہر حال منصور کی اس روش نے لوگوں کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا اور ان کو دکھلا دیا کہ ہاشمیوں کے دونوں بڑے خاندان اب بھی ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں۔

ان جنگوں کے بعد مدینہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایرانی سپاہیوں نے امن پسند اہالی شہر پر ظلم وستم توڑنے شروع کئے۔ لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی مگر شنوائی نہ ہوئی۔ آخر کار ان لوگوں نے تنگ آکر اپنی حفاظت کیواسطے ان مفسدوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کی۔ شہر کے بوچڑوں نے ایک سپاہی کو مار ڈالا۔ پھر کیا تھا تمام شہر میں بلوہ ہوگیا۔ حبشیوں کی ایک جماعت نے فوج کے کچھ حصہ کو قتل کر ڈالا۔ والی شہر بھاگ گیا۔ ان بلوائیوں نے فوج کے ذخیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس تمام واقعہ سے اعلیٰ مرتبہ کے لوگ منصور کے ڈر سے تھرتھر کانپنے لگے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس بلوہ کو فرو کرنے میں ایک اموی اور ایک محمد کے ساتھ کے افسر نے بہت مدد کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بلوہ ان ہی دو باغیوں کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ بڑے بڑے آدمیوں نے رعایا کی فرمانبرداری اور وفاداری پر نہایت زور دیا اور اس طرح لوٹا ہوا ذخیرہ واپس لے لیا اور اس کا عوض بلوائیوں کو دلوایا۔ حبشیوں کو بڑی مشکل سے الگ ہٹایا۔ اب یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی تھی کہ یہ محض بلوہ تھا نہ کہ کوئی بغاوت۔ والی شہر بڑی خوشامد کے بعد شہر میں واپس آگیا۔ چالیس سرغنوں کا ایک ایک ہاتھ کاٹ ڈالا گیا جو چوروں کی سزا تھی۔ بلوائیوں کا سردار اعلیٰ قید خانے ہی میں مر گیا۔

نوٹ

جناب مولانا مولوی محمد عبدالواسع صاحب پروفیسر دارالعلوم کے "معرکۃ الآرا فیصلہ فن عروض" کے متعلق ایک مطبوعہ مضمون سید نوازش علی صاحب لمعہ کے نام سے ہمارے پاس و نیز حضرت مولانا مدظلہ العالی کے پاس اس استدعا کیساتھ آیا ہے کہ وہ رسالہ میں طبع کیا جائے اور اس کا جواب لکھا جائے۔ حضرت مولانا مدظلہ العالی کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے

کہ اُن سے اس قسم کے معمولی مضامین کے جوابات لکھنے کی استدعا کی جائے البتہ اُس مضمون کا طبع ہو جانا ممکن ہے۔ کیونکہ اصولاً ثمرۃ الادب میں مطبوعہ مضامین دوبارہ طبع نہیں کئے جاتے۔

چونکہ اس ماہ کے پرچہ کی کاپی ہو چکنے کے بعد مضمون پہنچا ہے اس لئے آئندہ پرچہ میں انشاء اللہ تعالیٰ مضمون شایع کر دیا جائیگا اور دار العلوم کا کوئی طالب العلم اس کا جواب دیکر مضمون نگار صاحب کی تسکین بھی کر دے گا۔ فقط

تصیر مینیجر

زمانہ بابتہ جنوری ۱۹۱۹ء

رسالہ زمانہ بابت جنوری غیر معمولی شان و خاص اہتمام کیساتھ شایع کیا گیا ہے حجم زیادہ کرنیکے علاوہ تصاویر میں بھی زیادتی ہوئی ہے۔ مضامین بھی اعلیٰ پایہ کے ہیں۔

پروفیسر اقبال بہادر ایم۔اے نے ہندوستانی صنعتی دور کے پیشروؤں پر ایک نہایت مفید اور دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ قربانی کے عنوان سے منشی پریم چند صاحب نے ایک دلکش قصہ لکھا ہے جس سے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔ قصہ نہایت رقت انگیز اور عبرتناک ہے اور اسکی دلچسپی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری نے نہایت دلاویز مضمون "مطربہ فلک" کے عنوان سے لکھا ہے حصہ نظم میں پروفیسر اقبال پنڈت لشن ترائن درد کی قابل قدر نظمیں ہیں۔ غرض زمانہ کا یہ نمبر بحیثیت مجموعی نہایت عمدہ اور غور سے پڑھا جانے کے مستحق ہے۔ اس نمبر سے زمانہ کی نئی جلد شروع ہوتی ہے۔

قیمت سالانہ (للعمر) چار روپے

ملنے کا پتہ

زمانہ کانپور سے طلب فرمائیں

ثمرۃ الادب

خلیفہ منصور عباسی

از مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم۔ اے پروفیسر دارالعلوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

بنو علی کی بغاوت کی وجہ سے منصور کا ایک بہت بڑا کام معرض التوا میں پڑ گیا۔ یہ کام تعمیر بغداد تھا۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اس زبردست سلطنت کے حاکم کا دارالسلطنت جس کی سرحد ایک طرف روسی ترکستان اور دریائے سندھ اور دوسری طرف عدن۔ الجیریا اور مشرقی ایشیائے کوچک تھی عراق میں ہو۔ اب تک اس کا کوئی مستقل دارالحکومت نہ تھا۔ منصور زیادہ تر ہاشمیہ میں رہا کرتا تھا۔ یہ جگہ کوفہ کے قریب تھی اور کوفی عباسیوں کے دشمن تھے اس لئے ان کا پڑوس خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ابراہیم کی وفات کے بعد منصور نے جامع مسجد میں ایک وعظ کیا جس میں اس نے اُن بے گناہوں کو گنوا دیا اور تعجب کا اظہار کیا کہ بنو امیہ نے اس کفر و ضلالت کی کان کو کس طرح صفحہ روزگار پر باقی رہنے دیا۔ منصور کو اپنی ایجاد کے سوا

کسی چیز سے تسلی نہ ہو سکتی تھی۔ بہت غور وفکر کے بعد اس نے دار الخلافہ کے لئے دجلہ کے مغربی کنارے پر اس مقام کا انتخاب کیا جہاں ایک چھوٹا سا قصبہ بغداد نام آباد تھا۔ جہاں تک ہم اس وقت اندازہ لگا سکتے ہیں اس صوبے کا فرات کے ساتھ نہروں کے ذریعہ سلسلۂ آمدورفت جاری ہو گیا تھا۔ منصور نے ان راستوں کو وسیع اور مضبوط کرایا اس مجوزہ شہر کا نام مدینۃ اسلام رکھا گیا مگر عام طور پر اسی پرانے نام بغداد سے موسوم ہوتا رہا چنانچہ آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس شہر کا محل وقوع جس کو منصور عدم سے وجود میں لایا اس قدر موزوں ہے کہ یہ جلدی ہی دنیا کے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا۔ قسطنطنیہ کے سوائے کوئی مقام اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس کے گردونواح کے تمام ملکوں کے انحطاط اور منگولوں کے ہاتھوں اس کے لوٹے جانے کے باوجود اب دجلہ وفرات کے علاقہ میں یہ سب سے بڑا اور اہم شہر ہے۔ تعمیر کا کام اوائل ۷۶۲ء میں شروع ہو گیا تھا مگر جب محمد کی بغاوت کی خبر پہنچی تو اس کی دیواریں مشکل سے چھ فیٹ اونچی تھیں۔ جب ابراہیم نے بغاوت کی اور وہ آگے بڑھتا چلا آیا اور شہر میں خبر مشہور ہوئی کہ اس کو ایک بڑی فتح ہوئی ہے تو داروغہ تعمیرات نے تمام ذخائر کو اس خوف سے آگ لگا دی کہ مبادا کہ یہ تمام سامان غنیم کے ہاتھ لگ جائے۔ جب خلافت میں امن قائم ہو گیا تو اس کی تعمیر بھی از سرِ نو شروع ہو گئی خلیفہ نے اپنے اور اپنے متعلقین۔ اپنے رشتہ داروں اور آزاد شدہ غلاموں کے محلات کے لئے بہت روپیہ خرچ کیا۔ اس نے فوج اور افسران فوج کیلئے بہت سی زمینیں چھوڑیں۔ شاہی خاندان کے لوگوں اور شرفاء کو اپنے اپنے مکان تعمیر کرنے کے لئے زمینیں دیں۔ دستکاروں۔ تاجروں اور دیگر لوگوں کے گروہ کے گروہ اس نئے شہر کو آباد کرنے کی غرض سے اُمنڈ آئے۔ دھوپ سے خشک شدہ اینٹوں سے مکان بنانے میں لاگت ہی کیا آتی تھی۔ اسی سبب سے ہر شخص کو مکان بنانے میں وقت نہ معلوم ہوئی اور ممکن ہے کہ اکثر لوگوں کو یہ روپیہ خزانے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مل گیا ہو۔ تاجر دنیا کی اپنی دوکانوں پر ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ ۷۶۶ء میں شہر تقریباً مکمل ہو گیا۔ اگرچہ اس کی دیواریں ۷۶۸ء

پوری : ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ منصور کا یہ شہر دریا کے مغربی کنارے پر واقع تھا مگر اس نے دوسرے کنارے پر بھی شہر آباد کرنے کا حکم دیا۔ آج کل شہر کا زیادہ حصہ اسی طرف آباد ہے اس کے بیٹے مہدی کا کیمپ بھی اسی طرف تھا۔ اس طرف ایک فوج رکھنی بھی ضروری سمجھی گئی تاکہ عندالضرورت یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کی مدد سے ملک کو محفوظ رکھ سکیں بعد میں منصور نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے منڈی شہر کے باہر منتقل کر دی گئی کیونکہ منڈی ہی میں اجنبیوں کی کثرت ہوتی تھی جن کی نگرانی کا کام آسان نہ تھا۔ بغداد کی ہر طرح سے حفاظت کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اور شہروں میں بھی زیادہ فوج رکھی گئی تاکہ یہ معمولی بغاوتوں کو بغیر کسی دوسری فوج کی مدد سے دور کر سکے۔

منصور کی اپنے دارالخلافہ کی تعمیر میں نگرانی سے اس کی طرز حکومت پر روشنی پڑتی ہے جو ایک حد تک شخصی تھی۔ تمام بڑے بڑے عہدے اب بھی عرب شرفاء کو دیئے جاتے تھے۔ یہ لوگ اب بھی قوم کی جبلی خود سری اور حب الوطنی کا اظہار کر ہی جاتے تھے۔ مگر منصور بھی ان کی طرف سے بیفکر بیٹھنے والا نہ تھا چنانچہ اس نے کبھی ان کو سر اونچا نہ کرنے دیا۔ بڑے بڑے صوبوں کے حاکم صرف خاندان شاہی کے لوگ ہوتے تھے جن کا خاص لحاظ کیا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان سب کو نہایت سختی کے ساتھ اپنے قابو میں کیا جاتا۔ اور بعض اوقات ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کو اپنے آزاد شدہ غلاموں اور باہر کے لوگوں پر بہت اعتبار تھا چنانچہ خودسر عربوں کو ڈرانے اور غیرت دلانے کی غرض سے وہ انکو بڑے بڑے عہدے دیتا تھا۔ حاکموں اور دیگر بااختیار و باقتدار لوگوں کی نگرانی پر خاص آدمی مقرر ہوتے تھے جو خلیفہ کو برابر ان کے متعلق رپورٹیں بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ منصور کو ان ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ والی حضرموت شکار کا اس درجہ شوقین ہے کہ اپنے فرائض کے انجام دہی سے لاپرواہ ہے تو اس نے فوراً اس کو معزول کر دیا۔ ولیعہد یعنے مہدی پر بھی مشرقی صوبوں کا حاکم ہونے کی حیثیت سے اسی قسم کی نگرانی ہوتی تھی۔ چنانچہ منصور کو معلوم ہوا کہ اس نے ایک شاعر کو ایک

قصیدے کے صلے میں بہت انعام و اکرام دیا تو اُس نے شاعر کو انعام کا بڑا حصہ واپس کرنے پر مجبور کیا اگرچہ بعد میں مہدی نے پھر اُس کو واپس دے دیا۔ ان لوگوں کا کام صرف افسران اعلیٰ کی نگہداری ہی نہیں ہوتا تھا اس کے علاوہ یہ لوگ اہم قانونی مقدمات۔ خاص خاص واقعات اور اشیاء خورد و نوش کے نرخ سے منصور کو مطلع کرتے تھے کیونکہ عام امن و حفاظت کیلئے یہ ضروری تھا کہ کسی طرح قحط و گرانی کو رد کا جائے۔ منصور اپنے صوبوں اور مقبوضات سے اس قدر باخبر تھا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے پاس ایک جادو کا آئینہ ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی مہدی کو نصیحت تھی کہ "سو مت کیونکہ جب سے تیرے باپ نے تخت خلافت پر قدم رکھا ہے وہ بھی نہیں سویا۔ اور جب کبھی نیند نے اسکی آنکھوں کو بند کر بھی دیا۔ اسکی روح ہمیشہ جاگتی رہی" انہیں الفاظ سے اس کی حالت اور ملکی انتظام کا ڈھنگ صحیح طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ معاملات خزانہ میں منصور یگانہ روزگار تھا۔ وہ روپیہ کے معاملہ میں اس قدر سوچ کر چلتا تھا کہ لوگ اُس کو لالچی اور بخیل کہنے لگے تھے اور اس کو ابو الدراہم کے نام سے یاد کرتے تھے۔ مگر یہ الزام زیادہ اُن لوگوں کی طرف سے تھے جو اپنی جود و سخا کے ذریعہ اپنا نام روشن کرنا چاہتے جیسا کہ اکثر مشرقی امراء کے ہاں ہوتا تھا منصور کی روپیہ کے معاملہ میں سختی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اُس نے تعمیر بغداد کی لاگت اور خرچ کا حساب ایک ایک کوڑی کا لیا۔ اس نے اپنے افسروں کو مجبور کیا کہ وہ تمام تحفے جو ان کو حاصل ہوتے ہیں خزانہ میں داخل کریں۔ وہ اپنے ٹکس جمع کرنے والوں کی سخت نگرانی کرتا تھا۔ زمینوں کے ٹکس کی جمع میں اُس کا حکم تھا کہ بنو امیہ کے صرف وہ سکے قبول کئے جائیں جو وزن میں پورے اتریں۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ مشرقی بادشاہوں کے قدیم اُصول پر بھی کاربند ہوتا تھا جس کی رو سے بڑے بڑے آدمی جو لالچ کے ساتھ روپیہ جمع کرتے تھے اپنا تمام اندوختہ خلیفہ کو دیئے جانے پر مجبور کئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایرانی خالد ابن برمک (جو یہ کی طاقت اور قوت کا سرچشمہ تھا) جیسے عالی مرتبہ شخص کے خلاف بھی

اسی اصول پر عمل درآمد کیا گیا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جس نے خلافت عباسی کے استحکام کیلئے قیمتی
کارہائے نمایاں کئے تھے۔ اس سے تھوڑے سے وقت میں تین لاکھ درہم حاضر کرنے کو کہا گیا
اگرچہ آخر کار خلیفہ صرف دو لاکھ ستر ہزار پر ہی راضی ہو گیا۔ اسی طرح خلیفہ کا بھائی عباس تمام
وہ روپیہ خزانہ عامرہ میں داخل کرنے پر مجبور کیا گیا جو اُس نے اپنی عراق کی حکومت میں جمع
کیا تھا۔ اس کی صرف اسی پر رہائی نہ ہوئی۔ بعد میں اُس کو قید میں ڈال دیا گیا۔ ان تمام
سختیوں کے باوجود کوئی مشرقی حکومت اس بات میں کامیاب نہ ہوئی کہ چھوٹے بڑے
عہدہ داروں کو ناجائز طور پر اپنے خزانہ بھرنے سے روکے۔ بصرہ کی زمین کی پیمائش
کے وقت معلوم ہوا کہ آنحضرت (صلعم) کے ایک آزاد شدہ غلام کے خاندان نے اپنی جائداد بہت
وسیع کر لی ہے۔ منصور نے ورثا ان کی جائداد کا دسواں حصہ چھوڑ کر باقی تمام ضبط کر لی
منصور نے ہر کوفی کو پانچ درہم (تقریباً دو شلنگ) ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی سب نے
تعمیل کی۔ منصور کی یہ چال نہایت زبردست تھی۔ اس طریق سے کوفیوں کی تعداد کا صحیح
اندازہ لگا کر منصور نے سب پر چالیس درہم کا جزیہ مقرر کر دیا۔ یہ تمام روپیہ شہر کی حفاظت
میں خرچ کیا جاتا تھا۔ منصور کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ کسی طرح مالگذاری جہاں تک ممکن
ہو بڑھ جائے۔ مگر یہ روایت محقق نہیں بہرحال اسمیں شک نہیں کہ اس نے اپنے جانشین
کے لئے ایک بھرپور خزانہ چھوڑا۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان گراں ٹکسوں کی تلافی
امن عامہ نے کی جسمیں منصور ہر وقت کوشاں رہتا تھا۔ یہ دکھانا کہ منصور کے ایام خلافت
میں عیسائیوں کے تشدد مال کی شکایت کس حد تک درست تھی ہمارے مضمون سے باہر ہے
بہت ممکن ہے کہ یہ شکایات صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہوں کہ منصور نے معابد وغیرہ
پر بھی ٹکس لگا دیا تھا اور یہ کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ اس کا اہالی قبرس کے ٹکس کو گھٹانا ایک حد تک
انصاف پرستی نہ تھا بلکہ ایک سیاسی چال تھی۔ کیونکہ یہ ضروری تھا کہ قبرس جیسے دور افتادہ
مقبوضات سے اچھا سلوک کیا جائے۔

منصور خواہ زمانۂ خلافت میں کتنا ہی سخت اور بیرحم کیوں نہ رہا ہو مگر اسمیں کسی کو شبہ نہ ہوگا
کہ اس کا وجود سلطنت کے لئے خدا[1] کی رحمت تھا۔ وہ حق طور پر اپنی نسبت یہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے
حامیوں کے لئے وہ کچھ کیا جس کی ان کو ضرورت تھی۔ اُس نے اپنے تمام ملازموں اور عہدہ داروں
کو انصاف پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کیا۔ اُن کو حاسدوں کی سخت ملامتوں سے محفوظ رکھا
اور ملکی امن وامان قائم کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اسکی تمام
کوششوں اور حکمت عملی سے اس کے جانشینوں نے فائدہ اٹھایا جو ہرگز اُس کے ہم پایہ نہ تھے
ہارون الرشید کے زمانہ میں سلطنت کی بہبودی اس کے دادا منصور کی کوشش ہی کا نتیجہ تھی۔

فن عروض کے معرکۃ الآراء فیصلے کے متعلق ایک مضمون

ہم ذیل میں سید نوازش علی صاحب تمنا کا مضمون اس کے اغلاط پر ریمارکس کئے بغیر بجنسہ
شایع کرتے ہیں۔ اس کا جواب ہمارے پاس ایک صاحب نے بھیجا ہے جو کہ گنجایش نہ ہونے سے
اس پرچہ میں شایع نہ ہوسکا۔ آئندہ پرچہ میں شایع کیا جائیگا۔

مہتمم

جناب عالی

آپ نے رسالہ ماہ صفر بابت ۳۳ھ میں فن عروض کے متعلق جو فیصلہ شایع کیا ہے اور قبل از وقت اُس کا
نام معرکۃ الآرا رکھا ہے یعنے ہنوز اُس فیصلے پر کسی نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ اگر

---

[1] مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے منصور سفاکی ظلم وبیدردی کی مجسم تصویر تھا۔ اس نے خاندان بنی امیہ اور خاندان
رسالت کے مردوں ہی کو صرف تہ تیغ نہیں کیا بلکہ ان کی عورتوں بچوں کو بھی اپنی سفاکی کا نشانہ بنایا۔

ایڈیٹر

اس کے ہر ایک فقرہ سے تعرض کیا جائے تو افسوس ہے کہ مضمون طولانی ہو جائے گا اور شاید اس کو ایک مرتبہ میں طبع کرنے کی آپ کے رسالہ میں گنجایش نہ ہو گی اس لئے جو ضروری باتیں ہیں وہ گذارش کرتا ہوں۔

صفحہ ۱۵ میں آپ کا یہ فقرہ کہ "سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ علامہ سکاکی صرف نقص فی الاسباب کو زحاف کہتے ہیں" یہ فقرہ سید صاحب کے مطبوعہ رقعے میں کہیں نہیں پایا جاتا اور اسی فقرہ کو آپنے بنائے بحث قرار دیا ہے۔ جب یہ فقرہ اُن کے رقعے میں نہیں ہے تو سارا فیصلہ ہی منسوخ ہو گیا اس فقرہ کو بنائے بحث بنانے کے پیشتر جو بات آپ نے لکھی ہے کہ یہ محض نزاع لفظی ہے بس وہیں فیصلہ ختم ہو گیا تھا کہ نزاع لفظی میں بحث ہی بیسود ہے لیکن اس نزاع کو نزاع معنوی بنانے کے لئے آپنے یہ فرض کر لیا کہ سید صاحب کا یہ دعویٰ ہے الخ حالانکہ سید صاحب کا دعویٰ خود آپ کے چھاپے ہوئے رقعہ کے اس فقرہ سے صاف صاف ظاہر ہے وہ لکھتے ہیں کہ "زمخشری و ابن عبد ربہ و سکاکی وغیرہ ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے" یہاں وغیرہ کے لفظ سے تمام آئمہ فن مراد ہیں مثلاً صاحب لسان العرب صاحب شفاء العلیل فی علم الخلیل صاحب قصیدہ خزرجیہ او صاحب ابیہ شا دالشافی شارح کافی و صاحب تاج العروس شارح قاموس وغیرہ ان میں سے زمخشری اور ابن عبد ربہ کی نسبت صفحہ ۱۳ میں آپ فرماتے ہیں کہ "ابن عبد ربہ صاحب عقد الفرید نے زمخشری کی تقلید کی ہے۔ ہماری رائے میں یہ تعریف ہرگز قابل قبول نہیں ہے یہ تعریف مقاصد فن سے دور و ناموزوں ہے" اسی صفحہ میں آگے چلکر ارشاد ہوتا ہے کہ "اس بنا پر زحاف کی جو تعریف کی گئی ہے وہ لغو اور لاطائل ہے"

جناب عالی زمخشری کا نام آئمہ مفسرین و محدثین و لغویین و اہل ادب میں آفتاب کی طرح روشن ہے۔ اگر ابن عبد ربہ زمخشری کے ہمعصر یا اُن کے بعد ہوتے تو بے شک اُن کی تقلید کرتے ان کی تقلید ہر ایک کے لئے باعث فخر ہے لیکن ابن عبد ربہ تو زمخشری

سے تقریباً دو سو برس پیشتر اندلس میں خلافۃ امویہ کے زمانہ میں گذرے ہیں تو پھر انہوں نے زمخشری کی تقلید کیا عالم ارواح میں کی تھی یہ کیا تحقیق ہے اسی پر آپ سید صاحب کے مقابلہ میں آتے ہیں۔

اسکے بعد صفحہ ۱۴ میں محقق طوسی کی نسبت کہ وہ بھی آئمہ فن عروض میں سے ہیں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ تعریف بھی ناقابل قبول ہے اور علامہ سید شریف کو آپ نے پہلے ہی صفحہ ۱۲ میں مقدوح کردیا کہ ہم اس تعریف کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ آپ کے فیصلے کے منسوخ ہوجانے کی دوسری وجہ پیدا ہوئی یعنے سید صاحب ان سب آئمہ فن کے اقوال سے احتجاج کرتے ہیں اور آپ ان میں سے کسی کے قول کو نہیں مانتے آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔

اسکے بعد تعجب ہوتا ہے کہ آپ سکاکی کی تعریف کو پسند فرماتے ہیں حالانکہ سکاکی کی تعریف سے صاف صاف ظاہر ہے کہ تغیرات عروض وضرب کو علل کہتے ہیں اور اسکے ماسوی زحاف ہیں۔ یعنے وہ بھی ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے اس لحاظ سے اذالہ بھی زحاف میں داخل نہیں ہوسکتا۔ آپ نے ہر تغیر کو زحاف ثابت کرنے کیلئے مولوی عبدالنبی صاحب کو ان تینوں آئمہ فن کے مقابلہ میں کھڑا کیا کہ انہوں نے جامع العلوم میں ان مشاہیر محققین کے خلاف لکھا ہے جناب عالی جامع العلوم تو امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ہے۔ مولوی عبدالنبی صاحب (جن کا دوسرا نام شاید رحمۃ اللہ ہے یا آپنے عامیانہ لہجہ کی طرح علیہ کو حذف کردیا ہے) کون بزرگ ہیں جنہوں نے امام رازی علیہ الرحمہ کا بھی مقابلہ کیا ہے ہم ان سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن آپ نے جس عظمت وشان سے ان کا نام لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدما سے ہیں شاید خلیل بن احمد کے معاصرین سے ہوں گے یا ان کے استاد یا شاگرد ہوں گے جبھی تو ان پر بھروسہ کرکے آپ تمام آئمہ فن کو رد کرتے ہیں۔

پھر صفحہ ۸ اپر آپ نے شفاء العلیل فی علم الخلیل تصنیف محمد بن علی متوفی ۷۶۲ھ اور شرح رسالہ کافی سے کچھ فقرے اپنے مفید مطلب سمجھ کر لکھے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آپ نے شفاء العلیل کے اس فقرہ کو چھوڑ دیا شاید ظاہر نہ کرنے ہی میں مصلحت سمجھے۔

"والزحاف تغییر مختص بثوانی الاسباب خاصۃ"

اور کافی کے متن کی اس عبارت کو بھی ظاہر نہ فرمایا

"الزحاف مختص بثوانی الاسباب مطلقاً"

کیوں جناب عالی یہ کیا طریقہ ہے افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض
پھر شرح خزرجیہ سے بھی آپ نے کہیں کہیں نقل فرمایا ہے تو خزرجیہ کے اس شعر کو آپ کیوں چھپاتے ہیں

وتغییر ثانی احرف السبب ادعُہ
زحافاً۔ فاوج الجزء من ذلک احمی

لفظ اوج سے بحساب ابجد رکن کا پہلا اور چھٹا اور تیسرا حرف مراد ہے جسمیں کبھی زحاف نہیں ہوتا اور خرم پہلے ہی حرف میں ہوتا ہے۔

کیوں جناب زحاف کی عدم تعمیم کے متعلق اس سے بڑھ کر اور کیا صراحت چاہیے جو آپ ہی کی پسند کی ہوئی کتابوں سے ظاہر ہے۔ اساس البلاغہ میں لغت زحاف کو آپ نے دیکھا ہے اور اُس سے نقل کیا ہے تو لسان العرب اور تاج العروس کو کس لیے چھوڑ دیا۔ یقیناً اُن کو بھی آپ نے ضرور دیکھا ہے لیکن ان کو دیکھ کر آپ کو ندامت ہوئی ہو گی ایسی زحاف کی تعریف آپ کی مرضی کے موافق نہیں ہے۔

جناب عالی۔ آپ پر کیا موقوف ہے زحاف کے معنی عوام میں یہی مشہور ہو گئے ہیں کہ ہر تغیر کو زحاف کہتے ہیں اور میں اور آپ اور ہمارے ہمعصر سبھی اسمیں بھلکے ہوئے ہیں مولوی عبدالغنی صاحب کو بھی ہمیں میں شمار کر لیجئے چنانچہ میرے عنایت فرما جناب کیفی صاحب مجھ سے

زحاف کے معنی پوچھنے کے لئے تشریف لائے تھے تو میں نے بھی یہی کہہ دیا تھا کہ ہر تغیر کو زحاف کہتے ہیں لیکن کتابوں کو دیکھ کر دوسرے روز اُن کی خدمت میں اطلاع دیدی کہ ایسا نہیں ہے۔ جناب عالی ہم کو سید صاحب کا ممنون ہونا چاہئے یہ ان کے افادات میں سے ہے کہ اُنہوں نے حقیقت حال سے آگاہ فرمادیا اور بتادیا کہ علمائے قدیم زحاف کے کیا معنی لیتے ہیں اور عروض عرب کی کتابوں میں اسکے کیا معنی لکھے ہیں ایسے اُن کے افادات عروض کے متعلق بہت سے ہیں جن میں سے اکثر رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں مثلاً (۱) اوزان رباعی کا سلجھانا ان کا ایک کارنامہ ہے (۲) وزن مخلع کی تحقیق (۳) ماہیت خرم کا بیان (۴) ان کا یہ کہنا کہ فارسی والے کفن کا قافیہ مدفن اور قلم کا ادھم کے ساتھ لایا کرتے ہیں یہ عروض عرب کے خلاف ہے غرض ان نکات کی قدر کرنا چاہئے کہ کسی نے اس طرح صراحت سے نہیں لکھا ہے، قدر کرنے کے عوض درازی زبان اور سخت کلامی کیا معنی خصوصاً ایسے پرچہ میں جو اخلاقی سمجھا جاتا ہے اس قسم کی خلاف تہذیب باتیں بالکل نازیبا ہیں کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑنے کو کھڑے ہو جانے اور سخت سست کہنے اور کوسنے پیٹنے سے دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔

جناب عالی۔ خرم کو آپ نے صدر کی چونچ اور سینگ تجویز کیا ہے اور نکیل کو قبول کئے جو اس لفظ کے لغوی معنی ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ خرم کو ارکان سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ زیادتی بیت پر ہے رکن پر نہیں ہے علمائے فن کا مطلب یہی ہے کہ اگر بیت ایک اونٹ ہے تو خرم اُس کی نکیل ہے جس طرح نکیل جزو شتر نہیں ہے اسی طرح خرم جزو بیت نہیں ہے پس جبکہ خرم وزن بیت میں داخل نہیں ہے تو اُسے زحاف کہنا کیا معنی۔

صفحہ ۱۵ میں آپ نے سکاکی کے اس فقرے سے احتجاج کیا ہے کہ (والسالم من الزحاف غیر الخزم والخرم بالشرط المذکور تختص باسم السالم) حالانکہ یہاں استثنائے متصل نہیں ہے۔ ورنہ سکاکی پر خرم کو زحاف کہنے کا الزام آئے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو رکن زحاف سے سالم رہے اگرچہ اسمیں خزم و خرم بھی پایا جائے

جب بھی اُس کو سالم ہی کہیں گے اس سے صاف مترشح ہے کہ خزم و خرم زحاف میں داخل نہیں ہے ورنہ کیا معنی کہ خرم و خزم والے وزن کو سالم ہی کہیں پس جس قول سے آپ احتجاج کرتے تھے وہی آپ کے خلاف نکلا۔ فی الحقیقت بات بھی یہی ہے کہ جس طرح خزم بیت پر زیادتی ہے اُسی طرح خرم بیت سے ایک حرف کی کمی ہے ان دونوں کا شمار زحاف میں کیوں کیا جائے۔

محقق طوسی نے تو اس کے متعلق یہاں تک تخصیص کر دی ہے کہ فرماتے ہیں "ایں تغیرات در اول بیت خاصہ در اول قصیدہ واقع شود" حقیقت حال یہ ہے کہ سکاکی نے باب الہزج میں پہلے بحر کے عروض و ضرب اور اس کے ضمن میں علل کو بھی بیان کیا ہے اس سے فارغ ہو کر زحاف کا بیان شروع کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ باب الہزج :- ۱ اصل الھزج مفاعیلن ستّ مرات و انہ فی الاستعمال مجزو مربع ۲ ولہ عروض سالمۃ و ضربان اولھما سالم و ثانیھما محذوف ۳ زحافہ یجری القبض والکف فی مفاعیلن الاتی الواقع ضرباً و یجری الکف فی ما کان عروضاً دون القبض و عن الاخفش رحمۃ اللہ جواز قبضھما و فی بعض الروایات عن الخلیل ایضاً ۴ و یجری فی مفاعیلن الصدر و الحزم والخرب والشتر و بین یاء مفاعیلن و نونہ معاقبۃ۔ اس عبارت کے چوتھے فقرے میں و یجری کو بھی آپ نے صفحہ ۱۶ میں زحافہ کے تحت میں لیا ہے اور لطف یہ کہ شتر کو شطر لکھا ہے اس اعتبار سے تو معاقبہ بھی زحاف کے تحت میں آیا جاتا ہے گویا آپ کے خیال کے مطابق سکاکی کے نزدیک معاقبہ بھی زحاف تھا حالانکہ معاقبہ کی ایک صورت یہ ہے کہ مفاعیلن میں کچھ تغیر ہی نہ ہو اور تعمیم اس بات کی مقتضی ہے کہ معاقبہ کی ہر ایک صورت زحاف میں داخل سمجھی جائے پس ہرگز سکاکی کا یہ مذہب نہیں ہو سکتا کہ مفاعیلن قبل از تغیر مزاحف ہوگا

اور یہی مفاعیلن اصل بھی ہو اور فرع بھی ہو۔ جناب عالی اصل بات یہ ہے کہ تمام عروضیوں کا طرز بیان اس طرح پر جاری ہے کہ ہر بحر کے اعاریض وضروب کو پہلے بیان کرتے ہیں اور ان کے ضمن میں اُن کے علل بھی آجاتے ہیں اُس کے بعد اُس بحر کے زحافات کو بیان کرتے ہیں اُسکے بعد اُن امور کو بیان کرتے ہیں جو زحافات وعلل سے متعلق ہیں پس ان امور کو زحافات کے تحت میں لیکر آپ نے خلط مبحث کر دیا۔ متن خزرجیہ میں معاقبہ کے بیان میں دیکھئے ؎

اذا السببان استجمعا بهما التجا۔ او الفرد حتما فالمعاقبۃ اسمذا

اس کی شرح میں علام نقشبندی کہتے ہیں لما فرغ من بیان جمیع انواع الزحاف شرع فی امور قد تعرض للزحاف تدماکی جن کتابوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے اُن سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے اس کے سوا جو کتابیں مثل قسطاس و مختصر وغیرہ آپ کو ملیں گی اُن میں بھی یہی دیکھئے گا کہ زحاف اسباب کے ساتھ مختص ہے تا مدمیں جو زحاف مثل عصب و اضمار ہے وہ بھی سبب ہی کا تغیر ہے اور اذالہ اس لئے زحاف نہیں ہو سکتا کہ وہ عروض و ضرب کے سوا کہیں نہیں ہوتا جن پر بیت کی بنا قائم ہے پس اذالہ کو علل میں شمار کرنا واجب ہوا۔ اب بتائیے وہ کونسا تغیر ہے جو سبب کے سوا کسی رکن کے وتد میں ہو اور اُس کو زحاف کہہ سکیں۔ قول سکاکی بھی تو آپ کے کام نہ آیا

صفحہ ۱ میں آپ لکھتے ہیں کہ تشعیث تغیر وتد کا نام ہے یہاں سکاکی کے اس قول کو آپ چھپاتے ہیں والاصحاب اختلفوا فی کیفیۃ وقوع التشعیث اس کے آخر میں اپنا قول مختار بیان فرماتے ہیں ومنھم من یسقط الساکن قبلہ بالخبن ویسکن اول الوتد وینقل المشعث فعلاتن لبسکون العین لفر ینقل۔ اور محقق طوسی فصل ششم میں تشعیث کے بیان میں لکھتے ہیں "زجاج گفتہ است کہ ایں تغیر مرکب است اول خبن کردہ اند و بعد از اں تسکین حرف اول وتد کردہ و ایں تصیاس نزدیک تر است آپ نے عمداً محقق کے اس قول کو بھی چھپا ڈالا غرضکہ یہ تشعیث

تغیر سببی ہے ان دونوں محققوں اور زجاج کے نزدیک بھی تین متحرکوں کے اجتماع سے
عمل تسکین کیا گیا ہے یعنے فاعلاتن میں خبن کرنے سے فعلاتن حاصل ہوا اور فعلا فاصلہ
ہے اس میں اضمار جاری کیا اور اضمار بھی تغیر سببی ہے ان تمام قدما کے اقوال سے
ثابت ہو گیا کہ خرم و خرم زحاف نہیں ہے[1] اور عصب و اضمار جو ہے
وہ بھی فاصلہ کے سبب ہی میں ہوا ہے اور اذالہ اس لئے زحاف نہیں
ہو سکتا کہ وہ عروض وضرب کے سوا کہیں نہیں ہوتا جن پر بیت کی بنا قائم ہے
اس لئے اس کو علل میں شمار کرنا واجب ہوا اور تشعیث بھی بقول سکاکی
وزجاج ومحقق تغیر سببی ہے اس تمام بحث کے بعد بتائیے کہ وہ کونسا
تغیر ہے جو سبب کے سوا کسی رکن میں ہو اور اُسکو زحاف کہتے ہوں۔
فارسی کے جن عروضیوں نے زحاف کو تغیر عام لکھا ہے اُنہوں نے تنہا تغیر فی الاسباب کا
بھی ذکر کر دیا ہے محض تغیر عام لکھ کر بس نہیں کیا ہے۔ یوسف عروضی جس نے ابتداءً عروض
فارسی کو عروض عرب کا تابع کیا اسی نے زحاف کے یہ معنی مشہور کئے ہیں جو اس وقت معرض
بحث میں ہیں۔ محقق طوسی نے جو زحاف کے جو تین معنی بیان کئے ہیں اُن میں سے پہلے اور
دوسرے معنی فارسی کے عروضیوں کے مطابق بیان کر دیئے ہیں عرب کے عروض میں ہرگز یہ معنی
نہیں ہے۔ تیسرے معنی سید صاحب کے دعوی کے مطابق عروض عرب سے مخصوص ہیں صفحہ ۱۲
میں آپ نے جو لکھا ہے کہ "یہ تعریف ہم نے معیار الاشعار کے سوا کسی اور کتاب میں نہیں دیکھی"
یہ محقق سے سوءظن ہے غرض سکاکی وغیرہ کے قول سے آپ کا یہ دعوی کسی طرح ثابت
نہیں ہوتا کہ ہر تغیر کو زحاف کہتے ہیں حال آنکہ اس کے ثابت کرنے کے لئے آپ نے علمائے
فن کی شان میں بہت گستاخانہ جملے لکھے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے زبان آپ کے منہ میں ہے
جس کو جو چاہئے کہہ لیجئے لیکن اس سے دعوی کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب پر

[1] کما مر فی قول السکاکی

حملہ کرنے کے لئے قصور معاف پہلے آپنے اُن پر اتہام کیا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سکاکی نے نقص سببی کو زحاف کہا ہے پھر اسی فرضی دعوے کو باطل کرنے کے لئے سکاکی کی عبارت میں عمداً غلط مبحث کرکے اور قدما کے قول کو ادھورا بیان کرکے ثمرۃ الادب کے صفحات کو سیاہ کیا اور سید صاحب کے خلاف شان بعض باتیں کہدیں انظر الیٰ ما قال ولاتنظر الیٰ من قال اس میں شخصی بحث کا کیا موقع تھا۔ لیکن چونکہ اس رسالہ کے ایڈیٹر بھی آپ ہی ہیں اس لئے آپ ہی اس اخلاقی رسالہ میں بداخلاقی کی نظیر بھی قائم کرسکتے ہیں اس پر آپ کو ہر طرح کا حق حاصل ہے۔

اسمیں بعض ضمنی باتیں ایسی ہیں کہ ان کے متعلق زیادہ لکھنا موجب تطویل سمجھتا ہوں مثلاً بحر ہزج کا ابن مرزوق کے قول سے شاذ و نادر واتی مستعمل ہونا بیان کرکے اس سے عام حکم نکالنا اور اس کے متعلق خلیل و اخفش وغیرہ آئمہ فن پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں وزن بحر ہزج کے بھی ہوسکتا ہے ان اقوال میں جو اضطراب ہے وہ ظاہر ہے اوزان جو ہر زبان نفس الامری حقایق ہیں اُن کو محض اعتبارات سمجھنا کیا معنی اگر کوئی کہے کہ یہ شخص زید بھی ہوسکتا ہے اور عمرو بھی ہوسکتا ہے یہ صدا نغمۂ بلبل بھی ہے اور نوحۂ قمری بھی ہے تو اس کو سُن کر سب یہی کہیں گے کہ اس نے نہ زید و عمرو کو کبھی دیکھا ہے نہ بلبل و قمری کو کبھی سنا ہے ایسے مضطربانہ اقوال کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی یہ تذبذب جادۂ تحقیق سے کوسوں دور اور عدم وثوق کی دلیل ہے آپ کا یہ فرمانا کہ "سید صاحب نے نئی بھیرویں چھیڑی" یہ خود صدائے بے آہنگ اور بے وقت کی راگنی ہے۔ اُنھوں نے تو ایک پردہ اُٹھا دیا اور عقدہ حل کردیا کہ فارسی والے غیر زبان کے عروض کا اتباع کرکے بعض مقامات پر غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں فارسی اردو والے ہی اس طرح کی مضطربانہ باتیں کیا کرتے ہیں چنانچہ محقق طوسی علیہ الرحمہ نے (اگر بدائی کہ بے تو چونم) کو چار بار مفاعلاتن سے تقطیع کی اور دوسرے عروضیوں نے

اسی وزن پر (گرم بجوانی ورم برانی) کو تقارب مقبوض اثلم سے بتا کر فعول فاعلن فعول فعلن سے تقطیع کی جس کے متعلق قدر بلگرامی نے بڑی بحث کی ہے۔ سید صاحب نے آج سے تقریباً بیس برس قبل اس راز کو کھولا ہے اور اس کو بحر منسرح سے ہونا ثابت کیا ہے چنانچہ دبدبۂ آصفی میں یہ مضمون طبع بھی ہو چکا ہے۔ یہی ایک بات نہیں بلکہ ایسے بیسیوں نکات سید صاحب نے بتائے ہیں جو ہندوستان کے متفرق پرچوں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔

جناب عالی آپ صفحہ ۲۴ میں خواجہ حافظ علیہ الرحمہ کا یہ مصرع لکھ کر پوچھتے ہیں کہ "اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا" کس بحر کا ہے کہ اگر اس کو بحر وافر یا ہزج کا مصرع کہیں تو مثمن ہونے کے سبب سے دائرے سے خروج لازم آتا ہے۔ اے جناب ذرا غور و فکر سے کام لیجئے مجھ سے سنئے یہ دو مصرعوں کا ایک مصرعہ ہے مربع کو مثمن کر لیا ہے بحر ہزج سے ہے یعنے فارسی والے اکثر مربع کو مثمن اور مثمن کو شانزدہ رکنی کر لیتے ہیں مثلاً بیدل سے

مے و نغمۂ مسلم جو صلا کہ قدح زن گردش سر نشود
بحل است سبکسری انقدرت کہ دماغ جیون دہ تر نشود

اسیر سے امشب یارم آمد از در دیش دیدم حیران گشتم + قرباں کردم دل بر دلبر چوں جاں آمد بیجاں گشتم۔ یا یہ شعر سے زہے دو چشمت بخون مردم کشادہ تیر و کشیدہ خنجر + رُخ چو ماہت صباح دولت خطِ سیاہت شبِ معنبر۔ بتائیے یہ کس دائرے سے ہیں ان کو مضاعف کہنے کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس کو بھی چھوڑیئے خود بحر وافر ہی کو لیجئے (شجرۃ العروض) بپہنشہ ضالہ سو کہ بکشم وفائی نگری + ز رسم جفائی گزری طریق وفائی سپری۔ بتائیے کس دائرے سے ہے بس اس کے متعلق جو جواب آپ کا ہے وہی جواب سید صاحب کا ہے اس میں کو نسے کاٹنے کی کیا بات ہے ہر ایک بات کو آپ سید صاحب سے ملکر پوچھ سکتے ہیں یہ کیا معنی کہ بن مرزوق کے قول کو خود ہی شاذ و نادر بھی کہیں اور خود ہی اُس سے احتجاج بھی فرمائیں اور بحر ہزج کو تام الارکان مانیں یہ تو الغریق یتشبث بالحشیش کا

مصداق ہے۔

صفحہ ۷ میں آپ نے سید صاحب کی منطق دانی پر اعتراض کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ "سید صاحب کی منطق دانی کی قلعی کھل گئی"، لیکن اس سے خود آپ کی منطق دانی کی قلعی کھلتی ہے جسے آپ صغریٰ سمجھے ہیں اسمیں شرط ایجاب کا خیال نہیں فرمایا اور نتیجہ نکال کر اعتراض کر دیا واہ جناب۔ آپ ہی کے قول سے ارسطو اور بو علی تو اس کے سمجھنے میں بیشک سرگرداں رہتے مگر آپ سمجھ گئے اُن دونوں کی روح کو خوب شاد کیا۔

سید صاحب نے یہ جملے یہ سمجھ کر لکھے تھے کہ اُن کے مخاطب کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اذالہ اس تغیر کو کہتے ہیں جو عروض و ضرب کے وتد آخر میں ہوتا ہے اور اسی پر بیت مبنی ہے اس لئے اس تغیر کو زحاف نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کا شمار علل میں ہوگا۔ سید صاحب نے کوئی قیاس نہیں ترتیب دیا تھا اب اگر آپ ہندی کی چندی چاہتے ہیں تو اس کی ترتیب کو مجھ سے سنئے۔

اذالہ وہ تغیر ہے جو عروض و ضرب کے وتد آخر میں ہوتا ہے (صغریٰ)

جو تغیر عروض و ضرب کے وتد آخر میں ہوتا ہے اس پر بیت مبنی ہے (کبریٰ)

اس لئے اذالہ وہ تغیر ہے کہ اس پر بیت مبنی ہے (نتیجہ)

اس کے بعد دوسرا قیاس اس طرح مرتب کیجئے۔

اذالہ وہ تغیر ہے جس پر بیت مبنی ہوتی ہے (صغریٰ)

وہ تغیر جس پر بیت مبنی ہوتی ہے زحاف نہیں ہے (کبریٰ)

اس لئے اذالہ زحاف نہیں ہے (نتیجہ)

اب بتایئے ان دونوں قیاسوں میں آپ کو کس حیثیت سے اختلاف ہے اگر اختلاف نہیں ہے تو آپ اذالہ کو زحاف سمجھتے ہیں یا علل میں شمار کرتے ہیں۔

جناب عالی۔ سید صاحب کے مضامین علمیہ جس زمانہ میں فن منطق پر دبدبۂ آصفی میں مدتوں چھپا کئے ہیں اور مولوی نادر الدین صاحب مرحوم جو دار العلوم کے شیخ الفلسفہ والمنطق تھے اُن مضامین

کو کاغذ زر کی طرح جمع کرتے رہے ہیں اسوقت آپ نے قلم اٹھانے کی جرأت نہ کی۔ تیسکل اول
بدین الا شاج اس کی ترتیب طبیعی ! اس کے متعلق آپ سیدہ اصب پر اعتراض کر رہے ہیں۔
میں امید کرتا ہوں کہ عالیجناب میری اس تحریر کو اپنے رسالہ میں طبع فرما کر ماہرین فن کو اوج
غور کرنے کا موقع دیں گے۔
اور مہذب طریق پر اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرمائیں گے۔ اگر کوئی ٹھکانے کی بات ہو گی
تو میں ہر وقت اپنے خیال کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوں اگر جناب نے اس کو طبع نہ فرمایا اور
اس کا کوئی جواب نہ دیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ جناب نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے میرا مقصد
مکابرہ یا مجادلہ نہیں ہے۔ فقط

سید نوازش علی لمعہ

اس مضمون کے طبع کے بعد ثمرۃ الادب نمبر ۸ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اپنے فیصلہ کی ابعض غلطیوں
کا خود آپنے اعتراف کر لیا ہے لیکن اس محاکمہ کے مضامین اس سے پیشتر ہی یار لوگ اڑا لے گئے
ہیں اب اس کے متعلق آپ کا کچھ لکھنا مشت بعد از جنگ ہے یا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے

معذرت

علاوہ طاعونی پریشانی کے چند دیگر امور بھی باعث التوا پرچہ ہوئے امید ہے کہ
معزز ناظرین معاف فرمائیں گے۔
ممکن ہے کہ آئندہ پرچہ بھی دیر سے شائع ہو کیونکہ خاکسار کا امتحان قریب ہے

منیجر

حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا راز

(ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد)

(از جناب مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے صدر دار العلوم)

حضرت مسیح کے کلام اور نبوت کی خصوصیت

(۱) حضرت عیسیٰ کی ہستی کے متعلق عیسائیوں میں نہایت سخت اختلافات پیدا ہوئے ان کے حالات زندگی۔ اُن کی ولادت، ان کی رحلت، اُن کی تعلیم، بلکہ طرز تعلیم۔ غرض ہر چیز عجیب وغریب تھی۔ پس ان کی نسبت اختلافات کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، البتہ تعجب اور افسوس اس امر کا ہے کہ یہ اختلافات سخت گمراہی کا باعث ہوئے۔ اور جو بات ان کی تعلیم کے بالکل خلاف تھی وہی اُن کی امت کا مذہب ہو گیا۔ اُن کی رحلت کے بعد ایک زمانہ تک اصلی تعلیم کا اثر قائم رہا مگر جب بت پرست اقوام کا عنصر اس ملت میں بڑھا تو اس کی نرم اور نازک بنیاد اس بوجھ کا تحمل نہ کر سکی۔ وہ لطیف نکتے جن کو وہ بطور معما بیان کیے گئے تھے اصلی شاگردوں نے بھی ایسا ہی سمجھا تھا کہ ایک اور سمجھانے والے کی حاجت باقی تھی۔ مگر بت پرست ملت جس نے کہ روحانی غذا اپنائی تھی یا اُسے راس نہ آئی تھی مغز سخن کو نہ پہنچی اور بہت جلد تاریکی میں جا پڑی۔ اس گروہ کو پال نے نئی سمت میں داخل کیا تھا اور ان کے عقائد اور اعمال میں صرف اس تبدیلی پر قانع تھا کہ وہ مسیح کو مانتے ہیں۔ اصلی شاگردوں

نے حضرت شمعون صفا کو (جن کے لیے مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ میں اس چٹان پر اپنے مذہب کی بنیاد قائم کروں گا) اپنا امام بنایا اور مسیحؑ کی امانت کو محفوظ رکھا لیکن بہت جلد بیرون یا کی کثرت ہوئی اور بدعات و شرک کا دروازہ کشادہ ہو گیا تا آنکہ آہستہ آہستہ مسیحیت بت پرستی کے سانچہ میں ڈھل گئی۔ حضرت عیسیٰ کو یہ باتیں معلوم تھیں اور انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا، مگر آخر وقت میں ان پر منکشف ہو گیا تھا کہ یہ تمام کوششیں اعمال اور نتائج کے سلسلہ کو توڑ نہیں سکتیں۔ آخری گریہ وزاری میں انھوں نے خدا سے کہا کہ "اے پروردگار اگر ممکن ہو تو یہ زہر غم کا پیالہ جو میرے لب تک آ گیا ہے ہٹا لے" مگر اس وقت کہ نا امیدی کا استیلا تھا، صبر و تسلیم کا دامن پکڑ فرمایا "مگر میری مرضی نہیں بلکہ جو تیری مرضی ہو"

پیغام مسیحؑ ایک امانت گراں اور راز نہاں تھا

(۲) وہ رات جس کی صبح کو ان کا سفر تھا عجیب رات تھی۔ نبی اپنا آخری پیغام سناتا ہے اور کلام الٰہی کی امانت کو اپنے شاگردوں کے سپرد کرتا ہے، بلکہ وہ خود اپنی ہستی دے جاتا ہے جس طرح موسیقار اپنی آخرین انفاس میں شیریں ترین راگ گاتا ہے، اور وہی راگ اس کو کھا جاتا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا آخرین پیغام خود ان کی حقیقت کا سر مکتوم تھا۔ وہ کلمۃ اللہ تھے اور یہ کلمات برق خاطف کی چمک تھی، چمکی اور غائب ہو گئی۔

یوحنا کے انجیل کے سوا دیگر اناجیل متعارفہ اس کلام سے تقریباً ساکت ہیں۔ دیگر اناجیل میں صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری ہے اور اس کی علامات کا بطور تمثیل ذکر ہے۔ مگر یوحنا کی انجیل میں یوحنا ان کے جانی دوست تھے اور اس لئے استاد کے فیض باطن کا حصہ ان کو زیادہ ملا تھا وہ ان اسرار کو کچھ کچھ سمجھے اور یاد رکھ سکے دوسرے ان کو سنکر ششدر رہ گئے۔

پیغام مسیح کی حقیقت اور وقعت

(۳) وحی الٰہی مثل باران آسمانی کے اپنی موسم کی راہ دیکھتی رہتی ہے پس وہ جانگداز اور درد انگیز الفاظ ایسی ہی وحشت خیز رات اور دل خون کن واقعات کے منتظر تھے جس میں حضرت مسیح کا وداع تھا یا بلکہ نبوت بنی اسرائیل کا چراغ گل ہو رہا تھا مسیح کا جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا یہ امت بنی اسرائیل کی آخری کوشش تھی ایک دور گذرتا ہے اور دوسرا دور شروع ہوتا ہے ایک امت مٹتی ہے اور دوسری امت آباد ہوتی ہے الٰہی عہد بنی اسرائیل سے ہمیشہ کو ٹوٹتا ہے اور بنی اسمٰعیل سے باندھا جاتا ہے - آسمانی دعوت سے ایک گروہ رخصت کیا جاتا ہے اور دوسرے گروہ کے لئے جگہ خالی ہوتی ہے، بلکہ ایک درخت خشک کاٹا جاتا اور ٹھونٹھ ٹھہرایا جاتا ہے - اور دوسرا نہال بارآور سرسبز ہوتا ہے اور تمام عالم کی برکت اس کے حوالہ کی جاتی ہے، یہاں خزاں اور بہار دونوں ساتھ نظر آتی ہیں، زہر ہلاہل اور آب حیات کی نہریں پہلو بہ پہلو بہہ رہی ہیں - کیسی ڈراونی غم کی رات ہے مگر کتنی بڑی خوشی اس کے پیچھے خاموش کھڑی ہے -

شب وداع

(۴) پس اس رات میں کہ یاس و حسرت اور درد و غم کی مجسم تصویر تھی - مسیح اپنے فرض کا آخری حصہ ادا کرتے ہیں - کوہ زیتون میں رات بھر مناجات میں بسر کرکے مرضی الٰہی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں - ہر طرف سے ناامیدی کا ہجوم ہے مگر پھر بھی اسی اندوہ و ناامیدی کی کالی گھٹا میں امید کی بجلی بھی کوند جاتی ہے - تسلی ملتی ہے اگرچہ وعدہ تسلی سے چند وابستہ دامان جو اس غمناک ساعت میں شمع سحری کے پروانوں کی طرح کہ صبح ہوتے ہی ادھر ادھر غائب ہو جانے والے تھے، آس پاس حاضر تھے ان سے وداعی گفتگو کی - انہوں نے کہا ہمیں کیا دے چلے فرمایا -

آخری پیغام مسیح علیہ السلام

(۱) میں اس بزم کا چراغ تھا۔ جب تک زندہ رہا جلتا رہا۔ اب میرا کام تمام ہوچکا
(۲) رات تھوڑی باقی ہے۔ صبح کی آمد آمد ہے۔ کوئی دم تاریکی ہے پھر روز روشن ہے۔
(۳) میں تمہیں اس سے زیادہ کیا دیتا۔ کہ تمہارے لئے جلکر تمام ہوگیا۔
(۴) میری زندگی شبستان عالم میں قمر کی آخری ساعت تھی میرا جانا نوید صبحدم ہے۔ میرا کوچ ہی قدوم نیر اعظم ہے۔
(۵) میں کاہش کی تصویر تھا وہ کمال کی آیت ہے۔ میں درد تھا وہ تسلی ہے۔ میں ہمہ تن زخم تھا وہ سراسر مرہم ہے۔
(۶) اب تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ میں چلا جاؤں۔ میں جاؤں گا تو اُسے بھیجوں گا۔ وہ میرا منتظر ہے تم اُس کے منتظر ہو جاؤ۔
(۷) اور اگر دیدہ حقیقت بیں رکھتے ہو تو مجھی کو آتے دیکھو گے۔
(۸) میں نور تھا وہ بھی نور ہے۔ میں اس کا پرتو تھا وہ میرا ظہور ہے۔ میں اور وہ ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں بلکہ دو پھولوں کی ایک شمیم ہیں۔
(۹) میں یہاں تھا تو وہ تھا۔ اور وہ ہوگا تو میں ہوں گا۔
(۱۰) شمع کے نور کی قدر کرو نہ فانوس کی۔ میرے معنی سے کہ غذائے روح اور آب بقا ہے سیراب ہو، میری صورت میں کیا دھرا ہے ع

پای معنی گیر صورت سرکش ہست

(۱۱) اگر مجھے سمجھو تو میں خود معنی مجسم ہوں، کلام الٰہی میری حقیقت ہے، میں اُس کلمہ کے سوا کچھ نہیں۔
(۱۲) میرا کلام اُسی کلمہ کا ایک شرارہ ہے۔ اور میرا ہر لفظ میرے جگر کا پرکالہ ہے۔

(۱۳) جو میرے کلمہ سے معمور ہوا اُس کو مژدہ ہو کہ لحات لحمی ودملک دمی۔

(۱۴) وہ ایسا ہی مجھ سے لبریز ہوا جیسا کہ میں خود اپنے معنیٰ کا چھلکتا ساغر ہوں۔

(۱۵) اگرچہ میں ایک موج مضطرب ہوں، مگر شورش دریا کی خبر ہوں، میرا اُٹھنا قیامت کا اُٹھنا ہے اور میرا آنا قیامت کا آنا ہے۔ میں سراپا جلوۂ محشر ہوں " وانہ لعلم للساعۃ "

حضرت مسیحؑ کی نبوت صرف یہی بشارت تھی

(۵) نبی کی تعلیم روز اول بھی وہی ہوتی ہے جو روز آخر ہوتی ہے، مگر اولاً اجمال ہوتا ہے اور آخر میں کمال تفصیل وہ جس نقش کو جماتا ہے پہلے ہی دن اُس کا خاکہ ڈالتا ہے اور پھر رنگ آمیزی کرتا جاتا ہے۔ نبی اپنی امت کی تربیت مہربان اور دانشمند اُستاد کی طرح کرتا ہے، جوں جوں امت استعداد پیدا کرتی جاتی ہے اس کو تعلیم دیتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی استعداد کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پھر وہ دور تمام ہو جاتا ہے، اور دوسرے نبی کیلئے کام اُٹھا رکھا جاتا ہے، تا آنکہ فطرت انسانی یا انسان کی حق بین فطرت الٰہی جسے احسن تقویم کہا گیا ہے اس استعداد تک پہنچ جائے کہ اس بار گراں کے متحمل ہو جو کمال فطرت آدم ہے، پس اس وقت تعلیم الٰہی اکمال کو پہنچتی ہے، نوک پرکار نقطہ اولیٰ پر آجاتی ہے۔ اور نبوت کا دائرہ کامل ہو کر خاتم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر افزائش کے لئے ایک نقطہ کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس بشارت کا دوسرا نام آسمانی بادشاہت ہے

(۶) حضرت مسیح نے آغاز نبوت اس طرح پر کیا کہ آسمانی بادشاہت بہت قریب ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً تمثیلات کے ذریعہ سے اس آسمانی بادشاہت کی علامات بتلاتے رہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ حجاب کلام سننے کے لوگ متحمل نہ ہونگے یہی علامات اُن کے لئے ایک دلیل راہ ہیں جس سے اُنہیں

منزل مقصود کا پتہ ملنے کی امید ہے، بالآخر اُن کو یہ بھی بتادیا کہ میری تعلیم ہنوز ناتمام ہے، مگر میرے بعد آنے والا تم کو پوری تعلیم دیگا، اور اس کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ پس یہ تصریح اور تفصیل آخری پیغام اُن کی نبوت کا تھا، اور اپنے حواریوں کو یہی مژدہ دیکر روانہ کیا کہ جاؤ اور آسمانی بادشاہت کی منادی کرو۔

آسمانی بادشاہت کی اہلیت

(۷) تدبیر الٰہی نے جو ہر شے کو حسب استعداد فیض بخشتی ہے، اولاد ابراہیمؑ کو خاص طرح آسمانی بادشاہت کے لئے تیار کیا تھا، اس خاندان کی دو شاخیں دو جگہ نصب کی گئیں۔ بنی اسحٰق کو مثل انگور کے باغ کے نہایت سیراب اور شاداب زمین میں لگایا جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں، مگر بنی اسمٰعیلؑ کو مثل صحرائی درخت کے نہایت سخت اور خشک زمین کے حوالہ کیا تاکہ ایسے تناور اور مضبوط درخت پیدا کرے جس سے نجات عالم کے لئے سفینۂ نوحؑ بنایا جائے۔

مسیحؑ کی تعلیم ایسی نہ تھی کہ قدیم بت پرست قومیں اس کی متحمل ہوسکتیں، اس لئے انہوں نے تاکید فرمادی تھی کہ تم غیر بنی اسرائیل کو تعلیم نہ دینا۔

برکات گذشتہ

(۸) پس جو تخم حضرت مسیحؑ بو گئے تھے وہ یوں بارآور ہوا کہ گروہا گروہ مسیحیان شام وعرب اس آسمانی بادشاہت میں داخل ہوئے اور جس معلم کا مژدہ حضرت مسیحؑ سنا گئے تھے اس کی طرف خود بخود درجوق آئے۔ مدینہ کے انصار اکثر وہی تھے جو اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے اور پال کے متبع نہ تھے، پیغام مسیحؑ جو پالی اثر سے ان کے دلوں میں کچھ بے جان سا ہوگیا تھا آنحضرتؐ کی دعوت بالغہ کی آواز سے پھر زندہ ہوگیا، اور حضرت مسیحؑ کی کوششیں بحیثیت

ایک واقعہ تیار کرنے والے کے ٹھکانے لگی۔

برکات آئندہ

(۹) اگرچہ پال نے اصلی نصرانیت کو پامال کرکے عیسائیوں کو اسلام سے بہت دور ڈالدیا ہے
مگر جوں جوں علم کی روشنی بڑھتی جاتی ہے پالی بدعت کی قلعی کھلتی جاتی ہے۔ یہ امر مسلم ہوچکا
ہے کہ اناجیل مروجہ بے سند روایات کا ایک مجموعہ ہے اور جو کچھ اسمیں حضرت مسیح کی تعلیم ہے
وہ بہت کچھ اپنی اصلی صورت سے بدلگئی ہے اور صرف اسی طرح پر سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن کی
روشنی میں اسکو دیکھا جائے۔ اور اب وہ زمانہ بہت دور نہیں کہ بقول ڈاکٹر لائیٹنر محمدؐ کو ماننے والے
مسیحی اور زیادہ پکے مسیحی ہو جائیں گے۔ فقط

آداب الکلام

(از ابو حامد سید محمد صاحب سردار)

عام انداز گفتگو ہم میں عموماً یہ عادت پائی جاتی ہے کہ جب کسی شخص سے گفتگو کرتے ہیں
تو کلام میں اکثر سبقت کیا کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس کے چند وجوہ ہیں مثلاً ہمیں
یہ خیال رہتا ہے کہ:۔

گفتگو کی چار صورتیں (۱) جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مخاطب (ہم سے پہلے)
کہہ گذرے۔

(۲) یا مخاطب کے سلسلہ کلام کو قبل از وقت کسی الزام عائدہ کی تردید کے لئے منقطع

کردیا جائے۔

(۳) یا اس کی تقریر کے اثناء میں بلا انتظار اختتام تقریر کوئی استفسار کر بیٹھیں۔

(۴) یا بے سمجھے اثناء تکلم میں ٹپک پڑیں۔ گفتگو میں یہ چاروں صورتیں ادباً اور اخلاقاً مکروہ ہیں۔

ان کے اثرات | (۱) صورت اول اس وجہ سے بری ہے کہ اس میں اپنی شخصیت کو مخاطب کی ذات پر فوقیت دینے کی نیت مضمر رہتی ہے اور اس کی تہ میں خود پسندی پوشیدہ جس کا نتیجہ امید کے خلاف نکلتا ہے کیونکہ مخاطب کے دل میں اس کا اثر برا ہوتا ہے۔

(۲) صورت ثانی کا بھی یہی حال ہے اس میں بیجا عجلت سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے سوء ادبی کے سوائے الزام منسوبہ بعوض اٹھنے کے گاڑھا جائے اور گہرا رنگ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ جو شخص حقیقتاً ملزم نہیں ہوتا وہ مطمئن رہتا ہے اور تعجیل اس میں دخل نہیں پاتی مگر ہم نادانستگی اور ناتجربہ کاری سے باوجود بے لوث ہونے کے اکثر قبل از وقت الزام منسوبہ سے بری ہونا چاہتے ہیں اور کلام میں سبقت کر جاتے ہیں مگر اس کا نتیجہ برعکس برآمد ہوتا ہے۔

(۳) صورت ثالث بھی رسم کلام کے خلاف اور باعث شکست سلسلۂ تقریر ہوا کرتی ہے نیز مستفسر کی نسبت مقرر کے دل میں تنفر پیدا کر دیتی ہے اور اکثر حالتوں میں عدم حصول جواب سے اپنا ہی دل کھٹا ہو جاتا ہے۔

(۴) صورت رابع سننے والوں پر بہت شاق گذرتی ہے اور ایسے شخص کی وقعت نظروں سے گھٹ جاتی ہے کیونکہ یہ حرکت جہالت کی نشانیوں سے ایک کھلی نشانی ہے۔

تحریر کا ماحصل | اس تشریح و توضیح کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں کسی حالت میں کسی کے سامنے کلام میں بیجا سبقت نہ کرنی چاہئے خواہ مخاطب اپنا بزرگ یا برابر والا یا خورد ہی کیوں نہ ہو چنانچہ حضرت مصطفےٰ محمد مجتبیٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں بوقت

وعظ و بیان کلام میں سبقت کرنے والے مسلمانوں کی ہدایت اور قیام ادب کے لئے ارشاد باری نازل ہوا کہ :-

اللہ کا حکم

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (پارہ ۲۶ سورہ ۴۹ آیۃ ۱)

اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کے سامنے کلام میں سبقت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو وہ سننا جانتا ہے۔

سبقت فی الکلام بے ادبی ہے

اس آیۃ شریفہ میں رسول کے سامنے لوگوں کو کلام میں سبقت کرنے سے منع کیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلام میں سبقت کرنا گستاخی ہے جب گستاخی ہے تو کیا بزرگ اور کیا برابری والا اور کیا چھوٹا کسی کی مخاطبت میں بوقت کلام سبقت نہ ہونی چاہئے کیونکہ آدمی کو چاہئے کہ ہر حال میں ادب کو ملحوظ رکھے اور بے ادبی کو کہیں جائز نہ رکھے۔ چونکہ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک نصیب نہیں ہوا اور نہ ہم بہ حیثیت موجودہ اس قابل تھے کہ صحبت رسول کے قابل ہوتے اس لئے ہم پر اپنے زمانہ کے بزرگوں کا ادب و احترام واجب ہے۔

رسول اللہ کی تعلیم اور آنحضرت کا عمل

کیونکہ حضرت رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں اور اللہ پاک نے آپ کو مجسم خیر بنایا ہے اُن لوگوں کو جو سیدھے راستے کے متلاشی اور حریص الخیر ہوتے ہیں آپ نے اللہ کی جانب سے سچی تعلیم دی اور اور اچھا عمل سکھایا ہے چنانچہ آپ نے جو کام کرنے کو فرمایا اوس کو خود کرکے بتایا اور ثابت کر دیا کہ جو شخص اس پر چلنا چاہے اور آمادۂ عمل ہو برابر کر سکتا ہے غرض باوجود ایسی عظیم الشان حیثیت رکھنے کے آپ تمام اقوام سب قبیلوں اور جملہ فرقوں کے بزرگوں کا احترام علی مراتب فرماتے تھے تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے خلق عظیم کا ایک ذرہ بھی اپنے اندر نہ رکھ کر بزرگوں کی تعظیم میں لاپروائی کریں یا اسمیں اپنی کسر شان

آنحضرت سب کے بزرگوں کا احترام فرماتے تھے

یا کم و بیش ہمیں اور اُن کے احترام سے جی چرائیں تو ہمارا یہ ایک نہایت مبتذل اور شرمناک خیال ہے۔

عام تجربہ شاہد ہے

عام تجربہ شاہد ہے کہ جب ہم کسی خورد کو اپنے سامنے کلام میں سبقت کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہمارے سینوں میں ایک قسم کا انقباض شروع ہو جاتا ہے اور ہم بہت دلگیر ہو جاتے ہیں یہی حال ہمارے اُن بزرگوں کا ہوتا ہے جن کے سامنے ہم سابق الکلام ہوتے ہیں اگر ہم اپنے بزرگوں کا لحاظ کر کے اس گستاخی اور خدا کی قرار دی ہوئی بے ادبی کو اپنے اندر سے نکال

با ادب با نصیب — بے ادب بے نصیب

پھینک دینگے تو نہ صرف بزرگوں ہی کی نظروں میں وقار حاصل کرینگے بلکہ چھوٹوں کے دلوں میں بھی معزز جگہ پائیں گے اور انہیں با ادب بنا دیں گے۔ جو با ادب ہو گا با نصیب ہو گا اور بے ادب تو بے نصیب ہوتا ہی ہے اس کا کیا ذکر؟

نتیجہ تحریر

جب عام مخاطب کے سامنے کلام میں سبقت کرنا مذموم ٹھیرا تو اس میں ہر درجہ کا آدمی آگیا بزرگ بھی ساوی بھی اور خورد بھی پس لازم ہے کہ ان میں سے جو کوئی جبتک اپنی بات ختم نہ کرے ہم اپنی زبان نہ کھولیں اس کی تقریر کے اثنا میں بات نہ کریں یا وہ کچھ بولنے والا ہے تو اُسے روکیں نہیں۔

ایک اور گستاخی کا بیان

جس طرح اللہ جل شانہ نے سبقت کلام کو بے ادبی قرار دی ہے اور اس سے مومنوں کو منع کیا ہے اسی طرح اونچی آواز سے بات کرنے کو بھی مذموم ٹھیرایا ہے اور اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ فرماتا ہے رب ذو المنن۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ط

(پارہ ۲۶ سورہ ۴۹ ع ۱ آیۃ ۲)

مومنو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور اس کے ساتھ اس طرح زور زور سے باتیں نہ کرو جس طرح آپس میں ایکدوسرے سے زور زور سے باتیں کرتے ہو مبادا تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اونچی آواز اور اس کے مقاصد و نقصانات | سبقت کلام کے جو برے اثرات اوپر بتلائے گئے ہیں اور ان کے جن نتائج کا استخراج کیا گیا ہے وہ بلند آہنگی کے نتائج سے بہت کچھ مماثل ہیں بلکہ ان سے

زیادہ نقصان رساں نتیجے اونچی آواز سے بات کرنے میں پیدا ہوتے ہیں۔

آیۂ کریمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کے وقت رفع صوت کی نہی کی گئی ہے

کیونکہ اونچی آواز سے بات کرنا بھی خالی از علت نہیں ہوتا مثلاً۔

(۱) یا تو مخاطب پر رعب ڈالنا مقصود ہوگا

(۲) یا اس پر اپنی فوقیت جتانا یا ثابت کرنا مطلوب ہوگا۔

(۳) یا بحالت غصہ بے عقلی سے زور زور سے چلا کر بات کرنا

(۴) یا مخاطب کا ادب ملحوظ رکھے کر اونچی آواز سے بات کرنا

یہ چاروں مقاصد و لاپروائیاں بنظر شائستگی انسان کے لئے نازیبا ہیں۔ قرآن مجید میں

ایک جگہ اونچی آواز کو گدھے کی آواز سے شباہت دی گئی ہے اونچی آواز سے بات کرنا نہ فقط

آداب مجلس و کلام کے منافی ہے بلکہ بنظر اعتبار اکثر موقعوں پر باعث ندامت و خفت ہوتا ہے

اسی واسطے سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:۔

دیوار گوش دارد آہستہ لب بجنباں

تشریح مقاصد | غرض مقصد اول اور مقصد ثانی دونوں میں خود نمائی اور خود پسندی ہے اور

مقصد ثالث و رابع میں جہالت اور بے ادبی اور یہ سب صفتیں ظاہر ہے کہ انسانیت کے خلاف ہیں

پس یہ صفتیں اگر اپنے میں موجود ہوں تو ان کو دور کرنا ضرور ہے اور نہ ہوں تو ان سے احتراز

لازمی تاکہ ہم اخلاق حمیدہ سے متصف ہوں اور اوصاف شنیعہ سے بری۔

محفل نبی اور ختم مضمون | حضرت رسالتمآب کی محفل مبارک اور مجلس مقدس نہایت متین اور سنجیدہ

ہوتی تھی ایسی معززو و موقر مجلس میں جو لوگ بجالت کفر یا نو مسلمی خلق رسولؐ سے پوری طرح

متصف نہ ہوتے تھے بوجہ جہالت و ناشناسی اونچی آواز سے باتیں کرتے تھے جو اس پاک عظمت

جلال محفل کے شایاں نہ ہوتی تھی۔ پس اللہ نے مومنوں کو اس گستاخی کے دور کرنے کی ہدایت فرمائی ہے جس سے ہر مسلمان پر واجب ہوگیا کہ اونچی آواز سے بات نہ کرے یعنی بے موقع رفع صوت سے پرہیز چاہئے۔

ایک لطیفہ | یہاں ایک تعجب خیز لطیفہ پیدا ہوتا ہے یعنی ہم مسلمانوں کی عام اور خاص رسمی یا تہوفی مجلسوں میں خواہ وہ مردوں کی ہوں یا عورتوں کی ایسا شور و غوغا ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی حتیٰ کہ کوؤں اور بسیرا لینے والی چڑیوں کی پرشور آوازیں بھی طوطی کی آواز بن جاتی ہیں۔

بخلاف اس کے زمانہ حال کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو نہایت کم سخنی سے کام لیتے ہیں اور دھیمی آواز سے باتیں کرتے ہیں اور کارہائے متعلقہ کو سنجیدگی سے انجام دیتے ہیں اور ان کی انجمنوں میں ایسا سکوت طاری رہتا ہے جیسا شریفوں کی خلوت میں۔ اس کا سبب سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ قانونِ قدرت پر عمل کرکے ترقی کرتے ہیں اور مسلمان بے عملی سے تنزل میں آتے جاتے ہیں افسوس وہ کام کرتے ہیں باتیں نہیں کرتے اور یہ باتیں کرتے ہیں اور کام نہیں کرتے۔ سچ ہے

آں راکہ زباں دہند دیدن نہ دہند
آں راکہ دہند دید خاموش کنند

ریویوز

صبح امید

اس نام سے اردو کا ایک بہترین رسالہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی کی ایڈیٹری میں اکتوبر ۱۹۱۸ء سے شائع ہوتا ہے رسالہ کے مضمون نگار ہندوستان کے بہترین اہل قلم ہیں مثلاً ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ نواب ذوالقدر جنگ۔ مولانا اکبر حسین۔ مولانا حسرت وغیرہ ہم اب تک پانچ رسالے ہماری نظر سے گذرے ہیں جو بلحاظ مضمون وچھپائی وغیرہ اعلیٰ ہیں نواب ذوالقدر جنگ نے "سر سالار جنگ اعظم کے یادگاری واقعات" کے عنوان سے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے جو مسلسل چار نمبر میں ختم ہوا ہے جس کے دیکھنے سے عجیب واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر کا مضمون "مذاق ادب کی قومی کشش" بھی نہایت دلچسپ اور قابل غور ہے۔ پنڈت کشن پرشاد صاحب ایڈیٹر ہندوستانی نے آئین اصلاحات ہند پر ایک مفصل اور دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ بہرحال زبان اردو کا یہ ایک اعلیٰ علمی وسیاسی رسالہ ہے ہم کو امید نہیں بلکہ یقین ہے یہ رسالہ جلد سے جلد پبلک کے دلوں میں گھر کرلے گا۔ ناظرین سے ہم پرزور اپیل کرتے ہیں کہ اس رسالہ کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ قیمت سالانہ (للعہ) فی پرچہ ۶ر

دفتر صبح امید نظیرآباد لکھنؤ سے طلب فرمائیں

نقاد

یہ ایک اردو ادبی رسالہ ہے جو شاہ دلگیر کی ایڈیٹری میں آگرہ سے دوبارہ ماہ جنوری سے شائع ہو رہا ہے۔ ادبی مضمون نہایت قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ یہ رسالہ دوبارہ کافی شہرت حاصل کرے گا۔ قیمت سالانہ (للعمر)

اسوۂ حسنہ

اسوۂ حسنہ دوبارہ بجائے میرٹھ کے دہلی سے شائع ہونے لگا ہے اور اپنی سابقہ روش پر قائم ہے۔

گلزار بادشاہ

یہ اردو کا ایک ضخیم دیوان ہے جو جناب الحاج خطیب تلور بادشاہ صاحب بادشاہ مرحوم کا نتیجہ فکر ہے۔ حاجی صاحب وانمباڑی کے رئیس اور نواب امین جنگ بہادر کے برادر نسبتی تھے۔

آپ کا کلام اخباری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا ہے ہمیں مزید تشریح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

اس کو مرحوم کے خلف رشید خطیب محمد عبد الرشید صاحب نے شائع کیا ہے۔ مدراس میں

خطیب محمد عبد الرشید صاحب گوڈولا سٹریٹ مدراس سے طلب فرمائیے

ثمرۃ الادب کا اپیل

معزز ناظرین الثمرۃ الادب کے نو پرچے شائع ہو چکے اور یہ دسواں نمبر آپ کے
ملاحظہ میں پیش ہے ہمیں امید تھی کہ ہمدردان تعلیم ضرور طلبہ کی ہمت افزائی
فرمائینگے ورمنجملہ انجمن ثمرۃ الادب کے علمی خدمات کے رسالہ کی سرپرستی فرمائیں گے
لیکن ہم افسوس کیساتھ اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ ہمدردان علم نے ہماری
آواز نہ سنی اور ہم کو ابتک اتنے خریدار فراہم نہیں ہوئے جس سے رسالہ موجودہ
حالت میں ایک سال ختم کرتا کیونکہ ابتک خریداروں کی رقم صرف
ہو چکی اور قرضہ پر کام چل رہا ہے۔ ہم طلبہ دارالعلوم ناظرین کی خدمت
میں التماس کرتے ہیں کہ ہماری مدد فرمائیں ورنہ دارالعلوم کے ۴۸ سالہ
عمر میں پہلی بار جو رسالہ شائع ہو رہا ہے اس کو کمی سرمایہ کے باعث
بند ہوتا نہ دیکھیں۔ فقط

کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ

ثمرۃ الادب

خلیفہ منصور عباسی

از مولوی جمیل الرحمن صاحب ایم۔اے پروفیسر دارالعلوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

منصور کی ذاتی خواہشات بہت کم تھین۔ صحرائے عدم مین پیدا ہونے اور پرورش پانے کی وجہ سے سامان عیش ونشاط کی طرف اس کا رجحان بہت ہی کم تھا۔ یہی سامان اس کے بیٹے مہدی کے دربار کی زیب وزینت تھا جو بعد مین عیاشی اور آرام طلبی کا باعث ہوا۔ سفاح کی طرح وہ زن مرید نہ تھا۔ شراب سے اس کو نفرت کلی تھی اس کے دربار مین موسیقی راگ رنگ کو بالکل دخل نہ تھا۔ کیونکہ یہی چیزین عیاشی کی روح رواں ہوتی ہین۔ وہ علم و ہنر کا بڑا مربی تھا۔ عرب قدیم کے بہادری کے افسانے اس کو خاص طور پر پسند تھے۔ چونکہ

وہ آپ بڑا ذہین ذکی اور طباع تھا۔ لہذا صرف علما کی صحبت کو مرغوب خاطر رکھتا تھا وہ حبشی مسخرے ابو دلامہ کی شعروں اور تمسخر آمیز لفظوں کو بھی بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ کچھ خداداد قابلیت اور کچھ مشق نے اوس کو چند ہی دنون مین عرب کے مشہور خطیبون مین سے کر دیا۔ اسی[1] نے سب سے پہلے یونانی زبان کی علمی کتب عربی مین ترجمہ کرائین۔ اس طرح اس کے زمانے مین عربی علم و ادب کو بھی ترقی ہوئی جس کا سب سے بڑا رکن منصور تھا۔

وہ شہنشاہ جس کے غیظ و غضب کے سامنے دنیا جہان کے بادشاہ کانپتے ہوئے سر خم کرتے تھے اور جس کی خوفناک سختی شہرۂ آفاق ہو چکی تھی۔ اپنے محل کے چھت کے نیچے ایک مہربان باپ اور نرم دل آقا تھا وہ صاف اور معقول رائے کی قدر کرتا تھا۔ بشرطیکہ وہ خطرہ سے پاک ہو چنانچہ اس نے ایک ایسے خارجی کو معاف کر دیا تھا۔ جو قتل کیا جانیوالا تھا۔ کیونکہ اس نے خلیفہ کے حکم کی ناانصافی کو ظاہر کر دیا تھا وہ بنو امیہ کے خلفاء معاویہ عبدالملک اور ہشام اور بنو امیہ کے بہادر اور جان نثار خادم حجاج اعظم کی بہت قدر کرتا تھا۔

بنو علی کے بعض طرفدار یہ کہا کرتے تھے کہ اُن کو آنحضرت صلعم سے عقل و فراست ورثہ مین ملی ہے۔ اور اسی بنا پر اُن کی طرف سے خلافت کے دعوے ہوا کرتے تھے۔ اس نے خاصکر ایرانیون مین بہت فروغ پایا۔ بنو عباس کے پہلے دعویدارون اور خلفاء نے بھی ایسی کا دعوے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خیال تھا کہ اس خاندان کے دماغ ایک خاص الٰہی نور سے منور تھے۔ مگر اس خیال کو بہت ترقی

[1] یہ صحیح ہے کہ عباسیون مین یونانی کتب کے اولیت کا تمغہ ملا لیکن اسلام مین اس فخر کو سب سے پہلے خالد بن یزید اموی نے حاصل کیا ہے لہذا اولیت مطلقہ کا تاج خالد بن یزید کے سر پر ہے نہ منصور کے سر پر۔ اوپٹر

نہ ہوئی صرف چند ہی آدمیوں مین محدود رہ گیا۔عرب مسلمان تک بنوعلی مین اس
فضیلت کو تسلیم کرتے تھے اور عباسیون مین اس کا انکار۔منصور خود اسی خیال سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔اور اپنے آپ مین اس فضیلت پر فخر کیا کرتا تھا۔بہرحال وہ
بڑا مستقل مزاج آدمی تھا۔اور جوش مذہبی کا تو اس مین نام تک نہ تھا۔غیر مسلم اشخاص
جب تک خلافت کے لیے خطرہ کے باعث نہ ہوتے تھے وہ اُن کو نہ چھیڑتا تھا۔اسکے
زمانے مین خاص خاص فرقون کے لوگون کو تنگ نہ کیا جاتا تھا جیسا کہ بعد مین مہدی کے
زمانے مین ہونا شروع ہوا۔وہ نئی نئی تحریکون کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتا تھا۔
اس کا عیسائی معالج شراب کا عادی تھا منصور نے اس نفرت انگیز چیز کا خاص
اپنے محل مین مہیا کیا جانا منظور کر لیا۔خلیفہ اپنی معمر ملکہ کو دارالخلافہ ہی مین چھوڑ آیا تھا
اس عیسائی معالج نے اس کے ساتھ وفاداری کی جس کے انعام مین منصور نے چند
خوبصورت لڑکیان اس کو انعام دی۔مگر اس نے یہ کہکر سب واپس کر دی کہ حضرت
عیسیٰ کے مذہب مین یہ ناجائز ہے۔اس واقعہ سے منصور بہت خوش ہوا۔منصور کے
خطوط اور رفرایین زمانے کی رسم کے مطابق قرآن شریف کی آیتون سے بھرے ہوئے
ہوتے تھے۔یہ خصوصیت ان خطبون مین زیادہ نمایان ہوتی تھی جو منصور خلفاء
ماسبق کی تقلید مین ہر جمعہ کو کسی بڑی مسجد مین دیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ اس کو اپنے
خاندان کی رسم کے مطابق فقیہ اور محدث کے فرائض بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔ایسی
چند حدیثین جو اُس نے روایت کی ہین ہم تک پہونچی ہین اُن مین سے ایک یہ ہے کہ
آنحضرت نے فرمایا ہے اگر کسی حاکم کی مالگذاری مقرر کر دی جائے تو جو کچھ وہ حاکم اسکے
علاوہ لیگا وہ حرام ہے مگر بدقسمتی سے منصور کا کوئی حاکم اس خدمت کو ماننے کے لئے
تیار نہ تھا منصور پر الحاد یا کفر کا فتوے نہین لگایا جا سکتا۔مشرق مین اگرچہ مغرب سے کم
یا معاملات مذہبی مین سخت پابندی کی جاتی ہے۔اُس شخص کو جس نے بارہا اپنے قسمی

وعدون کو تو ڑا یہ تسلی تھی کہ خدائے رحیم اس کو ایک پرہیزگار مسلمان ہونے کی وجہ سے بخش دیگا۔ یہ ممکن ہے کہ اس کو یہ خیال بھی ہو کہ خود اس کے آنحضرت کے چچیرے بھائی ہونے کو پرہیزگاری کی طرف منسوب کرے گا یہ ایک خالص عرب خیال تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بار بار حج کے جانے مین سیاسی مقصد کے علاوہ کوئی ذاتی غرض بھی ہو۔ منصور اس خیال سے بھی خدا کی رحمت کا امیدوار ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ مرتدین اور کفار سے برسرپیکار رہتا تھا۔

وہ سرحدی جنگ جو مدت سے خلافت اور باز سلطنتون کے درمیان ہو رہی تھی اور جس کی تیزی کو صرف صلح و آشتی کا قلیل عرصہ کم کرتا تھا۔ منصور کے دنون مین بھی لوٹ مار۔ ملک کو تباہ کرنے اور ایک خاص قلعے یا شہر کی بربادی کی شکل مین جاری رہی منصور نے بعض سلطنتون کے خلاف اپنی سرحد کو حتی الوسع محفوظ کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس نے چند شہرون مین مناسب فوج ایزاد کی۔ اسی لحاظ سے اس نے ملاطیہ اور مصیصا کے قلعون کو دوبارہ فتح کرنا بہت ضروری سمجھا۔ یہ سرحدی قلعے غنیم کے خلاف کارروائی کرنے مین مرکزون کا کام بخوبی دیسکتے تھے اسی طرح شام کے ساحل کے تمام شہرون کی حفاظت کے لئے بھی منصور نے اسی قسم کی تدابیر اختیار کین۔

دوسری سرحد نے بھی منصور کو بہت تنگ کیا ۱۴۵ھ مین وحشی رومی قیصر نے جنوبی کاکشیا پر حملہ کیا اور طفلس پر قبضہ کر کے تمام ملک کو لوٹا۔ اور کتنی ہی فوجون کو شکست دی۔ منصور نے ان کی گوشمالی کے لئے ایک فوج بھیجی مگر اس کے پہنچتے پہنچتے وہ لوگ غائب ہو چکے تھے۔ منصور اب ان کی طرف سے بھی بہت محتاط ہو گیا چنانچہ وہ اپنی اورداور وحشی قومون کی لوٹ مار کو روکنے کی غرض سے سرحد کو مضبوط کرنے لگا۔ اکثر حصے کے باشندے ہمیشہ ان قومون کی لوٹ مار سے خائف رہتے تھے۔ منصور نے اس تمام علاقہ پر قبضہ کیا اور دراور مٹی کے تیل کے چشمون پر ٹیکس لگا دیا۔

بحیرۂ خزر کے جنوبی ساحل کے علاقے اب تک غیر مطیع تھے۔ گیلان کے اہل دیلم قرب جوار کے ملک مین ہمیشہ لوٹ مار مچاتے تھے منصور ان سے بھی ہمیشہ برسرپیکار رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۷۶۰-۶۱ء مین خلیفہ نے کوفے کے مالدار باشندون سے ان اہالی دیلم کے خلاف جنگ کرنے کو کہا۔ قواعد قوانین کی رو سے ہر ایسے مسلمان کو جو ہتھیار اوٹھانے کے قابل ہو ان کفار سے جنگ کرنی چاہیے تھی مگر منصور کے اس حکم کے دینے مین یہ مصلحت تھی کہ وہ لوگ اس کو منظور نکرینگے۔ اور لہذا جنگی خدمات سے بری ہونے کی غرض سے زرکثیر پیش کرینگے۔ گیلان کا مشرقی علاقہ طبرستان (مازندران) جہان پر سلطنت ساسانی کے اعلیٰ عہدہ داران کا ایک خاندان حکومت کر رہا تھا اور جو اب تک زرتشت کے پیرو تھے منصور ہی کے عہد مین خلافت عباسی مین شامل ہوا۔ طبرستان کے قریب ہی کا ایک بوچرا جو اپنی ذمہ داری پر فوج جمع کر کے سپاذ کے خلاف لڑا تھا۔ اس جگہ کا حاکم مقرر ہوا۔ طبرستان کی یہ فتح ابھی آخری نہ تھی۔ کفار کے خلاف یہ جنگ آنروی جیجون جاری رہی اسی طرح ہند کی سرحد پر باہمی جنگ چھڑی رہے منصور کے زمانے مین اور شہرون کے علاوہ قندہار فتح ہوا مگر ان سرحدی علاقون مین اسلامی حکومت کبھی وسیع نہوئی۔ ہم کو یہ علم نہین کہ وہ بیڑا جو منصور نے بصرہ سے سنہ ۷۷۰ء مین ڈاکوؤن کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تھا کہان تک کامیاب ہوا۔ دو سال قبل ان ڈاکوؤن مین سے دو بحر احمر مین داخل ہوئے اور مکہ کی بندرگاہ جدہ کو لوٹ لیا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہین بنو علی کی بغاوت مین عیسیٰ بن موسیٰ نے اپنے آپ کو خاص طور پر نمایان کر دیا تھا۔ انہی خدمات کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو تخت خلافت کا مستحق قرار دیا تھا۔ مگر منصور اپنے بیٹے مہدی کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا اس نے اپنے چچیرے بھائی عیسیٰ بن موسیٰ کو ایک محبت آمیز خط لکھا جس مین یہ لکھا کہ فوج مہدی سے اس قدر مانوس ہو گئی ہے کہ وہ یقیناً اسی کی طرفداری کرے گی۔ اور اس طرح اُس کو اپنا دعویٰ

چھوڑنے کی ترغیب دی۔ اس مین شک نہین کہ مہدی کا دعویٰ سچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوئی ایک ناعاقبت اندیش شاعر نے میرے دربار مین آنحضرت صلعم کا ایک ارشاد پیش کیا جس مین مہدی کے خلیفہ ہونے کی پشینگوئی تھی۔ اُس نے اُسیوقت خلیفہ کے بھائی عباس کو اس کی صداقت پر شاہد قرار دیا۔ ان تمام باتون کے باوجود عیسیٰ نے اپنا دعویٰ ترک نہ کیا۔ اس کو بجا طور پر یقین تھا کہ خلیفہ اور اس کے عہدہ دار اپنے وعدے کے موافق اس کی طرفداری کرینگے۔ اس کے علاوہ وہ خود قسم کھا چکا تھا کہ کبھی اپنے دعوےکو ترک نہ کرے گا۔ آخرکار بہت دھمکیون کے بعد وہ نرم ہوا اور اپنے دعوے کو اس شرط پر ترک کر دیا کہ مہدی کے بعد وہ خلیفہ بنایا جائے۔ یہ شرط شروع ہی سے صرف خیالی تھی۔ کیونکہ مہدی عمر مین عیسیٰ سے کم تھا۔ اور لہذا قدرتی طور پر اُس کے بعد مرا۔ مہدی نے عیسیٰ سے پہلے ہی یہ وعدہ کرا لیا تھا کہ وہ ہادی کے خلاف دعویٰ نہ کریگا۔

انھی دنون مین منصور کے قدیم حریف یعنی اس کے چچا عبداللہ نے انتقال کیا جیسا ہم پہلے دیکھ چکین ہین عبداللہ نے شکست کے بعد اپنے بھائی سلیمان کے پاس بصرہ مین جاکر پناہ لی تھی۔ جب منصور کو یہ معلوم ہوا کہ وہ وہان چھپا ہوا ہے تو اس نے سلیمان سے اسکا مطالبہ کیا۔ مگر سلیمان نے اس کا مطالبہ اسوقت تک منظور نہ کیا جب تک کہ منصور نے یہ قسم نہ کھائی کہ وہ عبداللہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ دیگا۔ پس یہ عہدنامہ جس مین عبداللہ کی حفظ جانی کا وعدہ کیا گیا تھا اور جس کو منصور نے منظور کر لیا تھا۔ مشہور مصنف اور شاعر ابن مقفع کی تصنیف تھا۔ اس مین یہ بھی مذکور تھا کہ اگر منصور نے اس کے خلاف ورزی کی تو وہ خلافت سے برطرف کر دیا جائیگا اور یہ کہ اوس حالت مین اس کی رعایا کی بیعت ٹوٹ جائیگی۔ یہ تمام شرائط منصور کے نزدیک بالکل لایعنی تھین۔ منصور نے ابن مقفع کو ان فقرون ہی کی وجہ سے قتل کرا دیا۔ اور جب ۱۴۰ء سنہ ۷۵۷ء کو عبداللہ اپنے بھتیجے منصور کے پاس آیا تو

منصور نے تمام دعدون کو برطرف کرکے اس کو قید کرلیا اور اس کے ساتھیون کو تہ تیغ کیا۔ بعض بیانات کے مطابق عبداللہ بھی کتنے کی موت مارا گیا۔ مگر یہ بات سمجھ مین نہین آتی کہ اگر عبداللہ کو قید کرنا سلطنت کی حفاظت کے لیے کافی نہ تھا تو منصور نے اس کو قتل کرنے مین اس قدر دیر کیون کی۔ ایک معمر شخص کے لئے سات سال کی قید ہی اس کی موت کا باعث ہو سکتی ہے اسی طرح سے ہم ان روایات پر بھی بھروسہ نہین کر سکتے جس کی رو سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن سفاح کی موت بھی اسی قدر بیرحمی کی تھی۔ کیونکہ منصور کو اپنے اس بے دست وپا بھتیجے سے ڈرنیکا کوئی سبب نہ تھا۔ ان واقعات کی نسبت یہ تمام عجیب وغریب حکایتین ہمین امیرالمومنین کی قابلیت کا یقین دلاتی ہیں[1]۔ برخلاف اس وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ منصور نے کبھی بعض اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کوئی قتل یا خونریزی نہ کی۔ جو بیرحمیان اس سے ظاہر ہوئین وہ صرف وہ تھین جو اس کو انتظام خلافت مین مدد دیتی تھین چنانچہ اس نے عیسٰی کو نصر کے ایک بیٹے کے قتل کرنے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ اس مین شک نہین کہ نصر بنوامیہ کی طرف سے بہت بہادری کے ساتھ لڑا تھا مگر اسکا بیٹا اب کسی خطرہ کا باعث نہ تھا۔

اگرچہ علویین کی شکست کے بعد خلافت منصور کے ہاتھ مین مستحکم ہوگئی تھی مگر پھر بھی دوردراز کے علاقون مین اب تک فساد واقع ہوتے رہتے تھے جن مین سے بعض تو نہایت ہی مخدوش تھے۔ چنانچہ آرمینیا کے اُمرا کو جو ہمیشہ غیر مطیع رہے۔ اب انکے بارہ مین بمشکل اور بالجبر دبانا پڑا۔ ۱۵۰ھ مین خراسان مین ایک اور سخت بغاوت ہوئی۔

---

[1] ان روایات سے اس بات کا یقین تو نہین ہوتا کہ منصور قابل تھا ہان البتہ اس بات کا ضرور یقین ہوتا ہے کہ وہ جھوٹا دغاباز فریبی تھا فقط ایڈیٹر

کہا جاتا ہے کہ اس کا سرغنہ پیشینگوئی بھی کرتا تھا۔ بہرحال یہ بغاوت مذہبی اور سخت کافرانہ تھی۔ بلکہ مورخین تو باغیون کو مسلمانون مین شمار ہی نہین کرتے خاظم جو خراسان مین پیدا اور بڑا ہوا تھا ان کے خلاف بھیجا گیا۔ یہ سپہ سالار اوس وقت تک کچھ نہ کر سکا جب تک کہ اس نے یہ انتظام نہ کر لیا کہ ولی عہد یعنی مہدی کے وزیر جو مشرقی علاقہ کا حاکم تھا بعض افسران فوج کو علحدہ حکم دے کر اس کے انتظام مین خلل انداز نہو۔ یہ کر کے اس نے ۷۶۸ء مین بغاوت کو فرو کیا اور بڑی زبردست فتح حاصل کی اور باغیون کا قتل عام کیا کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۴۰۰۰ اسیرون کو قتل کروایا۔ مگر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہین کہ چودہ برس بعد شارلین نے ۴۵۰۰ سکسن قیدیون کو قتل کیا اور شہزادہ ہارون نے (جو بعد مین خلیفہ ہو گیا تھا) جو یقیناً منصور کے لایق ترین سپہ سالارون یا شارلین سے زیادہ مہذب تھا ۲۹۰۰ بازنطینیو نکو اپنے حکم سے قتل کروایا تو ہمکو یہ تعداد بہت ہی قلیل معلوم ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہمکو اور واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خاظم نہایت سخت آدمی تھا۔ کفار اور خصوصاً ترک اور بازنطینین کے خلاف لڑائیون اور خانہ جنگیون نے ایک بہادر مگر بے رحم قوم پیدا کر دی تھی۔ بغاوت کا سرغنہ منصور کے سامنے حاضر کیا گیا جس کو اس نے قتل کر دیا۔

تھوڑے ہی دنون بعد افریقیہ (یعنی زمانہ حال کے تونس اور طرابلس) مین ایک اور بغاوت ہوئی۔ یہان کے حالات کبھی امن کی صورت نہ پکڑتے تھے اس کی نوعیت بھی مذہبی اور قومی تھی۔ اور باغی بربری اور خارجی تھے۔ وہان کا حاکم جو چند دنون پہلے ہی سندھ سے منتقل ہو کر کے وہان بھیجا گیا تھا ان کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ منصور نے ۷۷۱ء مین یزید بن حاتم کو لشکر جرار کے ساتھ موقع جنگ پر بھیجا اور یہ دکھانے کے لیے کہ بات بہت اہم ہے اپنے آپ یروشلم تک اس کے ساتھ گیا۔ اگلے سال یزید نے بہت بڑی فتح حاصل کی اور فاتحانہ دارالحکومت قیروان مین داخل ہوا اور منصور کی وفات کے

دنوں بعد تک وہ وہاں کا حاکم رہا۔ خلیفہ کی سلطنت اس کے آگے نہ بڑھی۔ مغرب کی طرف کے علاقے بنوامیہ کے زوال کے بعد ہی سے خلافت سے الگ ہو چکے تھے سپین میں خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمن اموی بہت سی مشکلات کے بعد یکہ و تنہا ۷۵۵ء کے موسم بہار میں ۲۵ برس کی عمر میں اس طرف آنکلا اور جلدی ہی ایک خود مختار حکومت قایم کر لی۔ منصور نے اس کے زور کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام ہی رہا۔ منصور کی طرح عبدالرحمن بھی ایک بربری لونڈی کا بیٹا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خلیفہ شجاعت و عظمت کی بہت قدر کرتا تھا خواہ وہ اس کے دشمن ہی ان صفات سے موصوف ہوں۔ چنانچہ وہ اس کو قریش کا شاہین کہا کرتا تھا۔ قریش وہ قبیلہ ہے کہ جس سے بنوامیہ اور عباسی اور بہت سے بڑے بڑے خاندان تعلق رکھتے تھے۔

مذکورۃ الصدر بغاوتوں سے بہت کم اہم وہ بغاوتیں تھیں جو شمالی عرب میں ہوئیں اور جن کو عکبہ نے ۷۶۵ء یا ۶۶ میں فرو کیا اس بغاوت کے فرو کرنے میں عکبہ نے قبیلہ کی دشمنی کی وجہ بہت خونریزی کی۔ منصور نے عکبہ کے پاس اپنا ایک عہدہ دار بھیجا تھا۔ عکبہ چاہتا تھا کہ اس کو کوئی بیش بہا تحفہ دے۔ مگر تحفہ کی بجائے اس نے پچاس قیدی اس کے حوالے کئے اور اس کو ہدایت کی کہ ان کو اپنے ساتھ بصرہ لے جائے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ ان کو قتل کرکے ان کی لاشیں شہر میں آویزاں کرنیوالا ہے۔ اس پر ان کے شہر کے لوگ ان کا خون بہا دینے کو تیار ہو نگے جو کم از کم دس ہزار درہم (تقریباً ۲۰۰ پاونڈ) فی کس ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ تجویز باشندوں کی مزاج اور ایک عقلمند قاضی کیوجہ سے بالکل درہم برہم ہوگئی۔ قاضی نے خلیفہ کو اس کی اطلاع دی جس نے اسکا شکریہ ادا کیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔

منصور کو اپنے خلیفہ بننے کی خبر اس وقت ملی تھی جبکہ وہ سفر حج سے واپس آ رہا تھا۔ اتفاق سے پیغام اجل اُسوقت پہونچا جبکہ مدینہ کی طرف حج کی غرض سے جارہا تھا ۵۷۷۵ء میں وہ حج کرنے کی نیت سے نکلا۔ راستے میں اس کو پیچش ہو گئی جو یقیناً ہاضمہ کی خرابی کیوجہ سے ہوئی تھی اور جو اُس کو اکثر تنگ کیا کرتی تھی صحرائے عرب کے موسم گرما کے آخری حصے کی تپش اور سفر کی تکان منصور جیسے کہن سال شخص کی مرض کو ترقی دینے کے لیئے کافی سے بھی زیادہ تھی وہ ارض مقدس تک تو پہونچ گیا مگر روضہ مبارک کی زیارت اس کی قسمت میں نہ تھی ۷ر اکتوبر ۵۷۷۵ء بروز شنبہ مکہ معظمہ سے صرف ایک گھنٹہ کی مسافت پر بئر میمون پر اس نے انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کی تاریخ وفات اور عمر کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی تاریخ وفات ۴ر اکتوبر ۵۷۷۵ء بروز چہارشنبہ ہے اس کی عمر ساٹھ برس سے کچھ زیادہ ہوئی۔ مگر مورخین کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ مختلف مورخین کی رائے کے مطابق اس کی عمر ۶۳ اور ۶۸ قمری اور ۶۱ اور ۶۶ شمسی برس کے درمیان ہے اس کی وفات کے وقت اُس کا آزاد شدہ غلام ربیع اور ایک نوکر تھا۔ ربیع نے اس کی وفات کی خبر کو کچھ دنوں تک پوشیدہ رکھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ تخت خلافت مہدی کو ملجائے۔ منصور ارض مقدس ہی میں مدفون ہے جو اسکے خاندان کا گہوارا تھا۔ اس کی بعد کی پشتون کا خیال تھا کہ ان کو اس کی قبر کا اصلی محل وقوع معلوم ہے یہ بیان بھی ممکن ہے کہ درست ہو کہ کسی زمانے میں سیکڑوں قبریں صرف اس غرض سے کھود ڈالی گئی تھیں کہ اس کی قبر کا صحیح نام ونشان کسی کو معلوم نہ رہے کیونکہ بہت ممکن تھا کہ کسیدن خاندان بنو عباس کا کوئی دشمن اس جگہ غلبہ پائے۔ اور اس حالت میں یہ بھی دور از قیاس

نہ تھا کہ وہ اس خاندان کے سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ نفرت انگیز ممبر کے نعش کو قبر سے نکال کر اس کو بیعزت کرے جس طرح منصور کے چچا عبداللہ نے بنو امیہ کے ساتھ کیا۔

مشرق مین بہت سے بادشاہ گذرے ہین جو نقض عہد اور ناعاقبت اندیشانہ خود رائی مین منصور کے برابر اور بعض اوقات اس سے بھی بڑھ چڑھکر تھے۔ مگر ان مین سے کوئی ایسا نہ ہوا جس مین ان صفات کے علاوہ عقل و فہم۔ فراست و کیاست منصور جیسے ہو اور جس کی شخصیت نے تمام خاندان پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہو جتنا منصور کی شخصیت کا پڑا۔ فقط

محمد جمیل الرحمٰن ایم۔ اے۔

نیک و بد

از مولوی سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین دارالعلوم

تاریخون مین بزرگان سلف کے حالات اور مہاجرین و انصار کے تذکرے پڑھتے ہین تو حیرت ہوتی ہے کہ اونھون نے دوسرون کی فلاح و بہبود کے لئے کیسی کیسی مصیبتین اوٹھائین دوسرون کو مالا مال کر دیا اور آپ مفلس ہو گئے۔

دوسرون کی جان بچائی اور اپنی جان دیدی۔ اللہ اللہ یہ ہمدردی' یہ ایثار'

وطنسان تھے یا فرشتے خداوندا! اس زمانے مین ویسے لوگ کیون ناپید ہین۔ کیون آج کل عام طور پر بیدردی پھیلی ہوئی ہے نہ اقربا مین محبت ہے، نہ اعزہ مین مروت، نہ شناساؤن مین الفت، نہ عام لوگون مین انسانی ہمدردی۔ جبکو دیکھو وہ اپنی غرض کا بندہ ہے۔ زید کا کام خالد نکالتا ہے مگر اسوقت کہ زید سے بھی اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلنے کی امید ہو۔ منعم جس پر احسان کرتا ہے اُس کو بندۂ زرخرید سمجھ لیتا ہے۔ محسن کے طبع نازک کے خلاف کچھ ہوا کہ آفت آئی۔ فوراً سلوک کا دروازہ بند ہو گیا سچی محبت اور سچی ہمدردی لوگون مین اب کہان رہی۔ وہ کیسے لوگ ہون گے جن کو اس کا کوئی خیال نہ ہوتا تھا کہ کسی نے بُرے وقت اور مصیبت کے زمانہ مین اُن سے اچھا سلوک نہین کیا۔ مگر کسی کی بری حالت اُن سے دیکھی نہین جاتی تھی۔ وہ تا امکان حاجتمندون کی حاجت براری کے لئے مستعد رہتے تھے۔ یہان تک کہ اپنے دشمن اور برائی کرنے والے کے ساتھ بھی خیر سے درگذر نہ کرتے تھے۔

بارور نخل سے سیکھے کوئی احسانکا طریق ۔۔۔ سنگ مارے ہے جو اُس کو وہ ثمر دیتا ہے

یرموک کی لڑائی مین خدیفہ تھوڑا سا پانی لیکر اپنے بھائی کی تلاش مین نکلے کہ وہ کہین مل جائین تو انھین پانی پلائین۔ کچھ دیر کی جستجو مین وہ مل گئے۔ نہایت مجروح تھے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ خدیفہ نے قریب جاکر پوچھا۔ بھائی صاحب! کیا حالت ہے۔ پانی پیو گے؟ کہا ہان۔ اُسی وقت قریب سے آواز آئی۔ آہ پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔ یہ سن کر خدیفہ کے بھائی نے کہا اب آپ ادھر تشریف لیجائے جدھر سے آواز آئی وہ شخص مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے۔ خدیفہ وہان پہنچے تو دیکھا ہشام ابن العاص ہین پوچھا پانی پیجیے گا فرمایا ہان ایسے مین ایک اور آواز قریب سے سنائی دی "پانی پانی" ہشام نے فرمایا جائیے (اشارہ سے)

اُدھر جائے۔ اُس شخص کو پانی پلائے جو پیاس سے بے تاب ہو رہا ہے خدیفہ اُس شخص کے پاس پہنچنے تک اس کی جان نکل چکی تھی۔ وہاں سے ہشام کی طرف پھر جو آئے تو اون کی روح بھی پرواز کر چکی تھی یہاں سے اپنے بھائی کی طرف گئے تو وہ بھی مر چکے تھے۔ پھر تو خدیفہ اس دردناک نظارے پر حسرت و افسوس کرتے ہوئے اپنی جگہ واپس چلے آئے۔

اللہ اللہ یہ ایثار کہ سب کے سب مجروح، نزع کا عالم، پیاس کی حد و انتہا نہین ایسے وقت مین بھی ہر ایک جان بلب کی یہی خواہش تھی کہ میرے عوض دوسرا شخص پانی پیکر پیاس بجھائے۔

شناسا ہو یا بیگانہ انسان ہونے کے اعتبار سے طبع انسانی کا اقتضا ہی کہ ایک دوسرے کی حالت سقیمہ پر رحم کرے۔ پہلے کے زمانہ مین منعم مفلس کو عالم جاہل کو اپنے مال اور اپنے علم سے فائدہ پہنچایا کرتا تھا اور محسن احسان کرکے منفعل ہوتا تھا۔

شرم کرم اگر نگد از زکریم را گرد خجالت از رخ سائل کہ می برد

اس زمانہ کی خود غرضی، بیدردی اور کبر و نخوت کو دیکھتے ہین تو بزرگان سلف کے حالات کرامت سے کم نہین معلوم ہوتے۔ ساری خوبیان مذہب سکھاتا ہے اور مذہب کوئی ہو نیکی کی ہدایت کرتا اور بدی سے ڈراتا ہے مگر مذہبی احکام پر لوگ چل نہین رہے ہین۔ اس لئے دینوی معاملات مین بھی فساد پڑ گیا ہے۔ زندگی کی فکرون مین ہر شخص اپنی موت کو بھولے بیٹھا ہے۔ دوسرون کو مرتے دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایک دن وہ بھی مرے گا۔ لیکن کام ایسے کرتا ہے کہ گویا وہ مرنے کے لئے پیدا ہی نہین ہوا ہے۔ دنیا کے دھندون مین صبح و شام کچھ ایسا محو رہتا ہے کہ دینی فرائض کی طرف کبھی دھیان نہین بٹاتا۔ کوئی دوسرون کو ایذا پہونچا کر اپنی راحت

کی فکر کرتا ہے۔ کوئی دوسرون کو ذلیل کر کے اپنی عزت بڑہانے کی کوشش کرتا ہے کوئی لہولعب مین مصروف ہے کوئی عیش وعشرت مین مشغول۔ ایک مفلس بھوکون مرے مگر ایک زردار کو کیا پروا۔ اُس کا تو یہ خیال ہے کہ وہ کسی مفلس کے ساتھ سلوک کرے گا تو آپ مفلس ہوجائیگا پھر تو پلاؤ کھانے کے عوض خیالی پلاؤ پکانا پڑے گا اگر مفلسون کے رہنے کے لئے جھونپڑے بنوادیگا تو باغ لگاکر سیر و تفریح کا حظ کہان اوٹھائیگا جس زردار کا ایسا خیال ہو تو اُس سے امید رکہنے والا کیا حال ہو۔

زبیدردان امید در خود جستن بدان ماند کہ خار از پاکسے بیرون کشد از نیش عقرب ہا

اکثر لوگون کی بیدردی کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ انسان تو ہین مگر درندون کے سے خصائل ہین۔ یہ کیسی تعجب خیز بات ہے کہ آدمی آدمی سے اس طرح ڈرے جیسے شیر سے۔ اخلاق سیکھتے سیکھتے آتے ہین مگر اخلاق سکھائے تو کون سکھائے اس زمانہ کا تو یہ دستور ہے کہ مالدار مالدار سے، عالم عالم سے اور جاہل جاہل سے ملتا ہے منعم مفلس کی صورت تک نہین دیکھتا اور عالم جاہل کو منہ تک نہین لگاتا پھر ایک جاہل جاہل سے اور مفلس مفلس سے مل کر ایک دوسرے کو کیا نفع پہونچا سکتا ہے۔

ایک حکیم کے یہان دو شخص آئے۔ ایک سے پوچھا کیا کام کرتے ہو جواب دیا کچھ نہین ایک دولتمند سے دوستی ہے۔ اسی کے یہان رہتا ہون اور وہی میرے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا ہے۔ حکیم نے کہا اس کو دوستی نہ کہو۔ مفلس اور دولتمند کی کیا دوستی۔ اگر وہ دولتمند تمہارا سچا دوست ہوتا تو پھر تم اس طرح مفلس کے مفلس نہ رہتے۔ وہ تم کو بھی اپنی طرح دولتمند بنا دیتا۔ دوسرے سے پوچھا تم کیا کرتے ہو؟ کہا کوئی کام تو نہین کرتا کیونکہ تھوڑی سی معاش تم

ہان محلہ کے ایک عالم کے پاس جو میرا دوست ہے اکثر جا بیٹھتا ہون - ادہر اُدہر کی باتین ہوتی رہتی ہین - حکیم نے کہا عالم کی صحبت مین بیٹھنے سے تمہین جب کوئی فائدہ نہین ہوا تو وہ تمہارا دوست نہین اور تم نے جو تحصیل علم کا خیال نہین کیا تو اپنے ساتھ سخت دشمنی کی ہین نہ تم دونون کو کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہون نہ تم دونون ملکر مجھے کوئی نفع پہونچا سکتے ہو - پھراس طرح کی ملاقات سے کیا فائدہ ہ - بہت کم لوگ ہون گے جو خطا کر کے نادم ہوتے ہین -

کیا ہنسی آتی ہو مجھکو حضرت انسان پر　　فعل بد تو خود کرین لعنت کرین شیطان پر

حضرت انسان اشرف المخلوقات ہین - ان کے مقابلہ مین دوسری مخلوق کی خلقت متواضعانہ ہے حضرت انسان کا قد راست و مستقیم اور سارے حیوان اِن کے سامنے ادب سے سر جھکائے ہوئے - نباتات تعظیماً استادہ جمادات انکسارًا سر بزمین افتادہ ساری مخلوق انھین حضرت کی خدمت کے لیئے ہے اور یہ سب کے مخدوم - ان حضرت کو خدائے تعالیٰ نے عقل دی، زبان گویا دی مگر یہ حضرت عقل سے کام لیتے ہین تو فساد کا اور زبان سے کام لیتے ہین تو سختی و درشتی کا - برین عقل و دانش بباید گریست -

انسان پیدا ہوتے ہی صاحب کمال ہو نہین جاتا - بتدریج کمال حاصل کرتا ہے اسی لئے **تخلقوا باخلاق اللہ** کی ہدایت فرمائی گئی ہے - انسانی عقل رکھ کر نیک کو نیک اور بد کو بد سمجھ کر بھی نیک کام نہ کرے تو کیا وہ انسان اور کیا اس کی عقل - اکثر لوگ ہین کہ دنیا ہی مین منہمک ہین - دین کا کچھ خیال نہین افسوس کوئی بندۂ خدا یہ نہین سمجھتا کہ اسے ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے - ہر شخص دنیا ہی کا والہ و شیدا ہے اے انسان ! تو دنیا کے لئے نہین پیدا ہوا ہے - بلکہ دنیا تیرے لئے پیدا کیگئی ہے تو آخرت کے لئے ہے عبادت تیرا کام ہے وما خلقت الجن والانس الا

لیعبدون کے معنی سمجھ اور اوس پر عمل کر۔ یہی عمل تیرے کام آئیگا۔ دنیا مین رہنے تک زن و فرزند دوست و اقربا تیرا ساتھ دیتے ہین مگر قبر مین سوا اعمال کے ساتھ دینے والا کوئی نہین ہے۔ دنیا کی چندروزہ زندگی کے لئے تو دنیا بھر کے مصیبتین اوٹھاتا ہے۔ مگر جہان تجھے ہمیشہ کے لئے رہنا ہے وہان کی کوئی فکر نہین کرتا

اے مغرور انسان! زر و دولت پاکر تو خدا کو، اپنے آپ کو، موت کو غرض سب بھلائے بیٹھا ہے۔ مفلسون کو اپنے مقابلہ مین زمین کے کیڑے سمجھتا ہے۔ اُن کو ذلیل کرتا ہے، ان کے دل دُکھاتا ہے۔ اُن پر ستم ڈھاتا ہے۔ اُن کی ہستی تیری نظرون چیونٹیون سے بڑھکر نہین کہ جس کو چاہا پامال کر دیا۔ جیسا تو انسان ہے ویسے دوسرے بھی انسان ہین کیا مال و حکومت کی وجہ سے تیری شان ایسی بڑھ گئی کہ دوسرے تیرے سامنے حیوان سے بدتر ہو گئے۔ کیا تو ہمیشہ رہیگا اور دوسرے فنا ہوجائینگے۔ تو بھی فانی، سارے انسان فانی، سارا جہان فانی، پھر اے فانی انسان! تجھ مین یہ کبر و نخوت کیون ہے؟ تجھے نہین معلوم کہ کبر و نخوت سے شیطان کا کیا حال ہوا۔ اور فرعون کا کیا حال ہوا۔ اے مغرور آدمی کیا تو بھی انسان کے مقابلہ مین یہ کہہ سکتا ہے کہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین۔ ہرگز نہین ہرگز نہین تو خاک کا پتلا ہے تجھے عجز و تواضع زیبا ہے تیری انسانی خلقت ہے اور ہمدردی تیری فطرت۔ انسان ہوکر انسانیت کو کیون بدنام کرتا ہے۔ ہان تو انسان ہے انسانیت پیدا کر اشرف المخلوقات ہے شرافت پیدا کر۔

اے ظالم انسان! تجھے تو ظلم و ستم ہی مین لذت ملتی ہے واہ ری لذت، اس لذت کا کیا پوچھنا۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

ارے ظالم! تو انسان ہو کر انسان ہی پر ظلم کرتا ہے۔ اپنی راحت کے لئے دوسروں کو تکلیف پہونچاتا ہے۔ اپنے عیش کے لئے جبر و زیادتی سے دوسروں کے حقوق پر تصرف کرتا ہے اپنی عزت بڑہانے کے لئے دوسروں کو ذلیل کرتا ہے۔ کیا تو نے دیکھا یا سنا نہین کہ بڑے بڑے ظالم، مغرور، متکبر کس طرح ذلیل و خوار ہو گئے۔ دنیا بھر کی تاریخین اس کی شاہد ہین۔ اور ہزارون چشم دید واقعات اس کے گواہ۔

جو اب بھی نہ سمجھے تو۔ تو پھر تجھ سے خدا سمجھے۔

اے زبان! تو نیک و بد مین تمیز نہین کرتا! شریف و رذیل کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ افسوس تو دل کو توڑ دیتا ہے۔ تجھے خانۂ خدا کا بھی کچھ پاس نہین تو دل ایذا دیتا ہے اور اس کے عوض بددعا لیتا ہے۔ دیکھ یہ دین لین اچھا نہین جیسی کرنی ویسی بھرنی تجھے بھی دلی صدمہ اُٹھانا ہی پڑے گا۔

اے شریف انسان! تیری فطرت نیک ہے۔ تو بدی کو ناپسند کرتا ہے تو خلاکت مین مبتلا ہے بھی تو اپنی پروا نہین کرتا۔ مگر دوسرون کی مصیبت تجھ سے دیکھی نہین جاتی۔ دوسرون کی فلاح و بہبود کے لئے تو مصیبتین جھیلتا ہے۔ اور اپنے ساتھ بدی کرنے والے کے ساتھ بھی نیکی کرنے سے دریغ نہین کرتا۔

اے کریم النفس انسان۔ اپنے اقبال کے زمانہ مین تو دوسرون کے ساتھ احسان کرتا رہتا ہے سُن! غور سے سُن! غیب سے تجھے مبارکباد دی جا رہی ہے کہ تجھ پر برا وقت نہین آئیگا۔ اے نیک انسان تو بدی سے باز رہتا ہے۔ آپ بھی نیک ہے اور دوسرون سے بھی بھلائی کرتا ہے۔ تیری نیکیان دو جہان مین کام آئینگی فقط

ذہین

اشتات علمیہ

آفتاب

از جناب بابو امرت لال صاحب یم۔اے۔ پروفیسر دار العلوم

چھوٹے بڑے جتنے اجرام فلکی ہمکو نظر آتے ہین وہ دو قسمون پر منقسم ہوسکتے ہین (۱) منور بالذات یعنی وہ اجرام فلکی جو اپنی ذاتی روشنی سے چمکتے ہین اور (۲) منور بالغیر یعنی وہ اجرام فلکی جن مین ذاتی روشنی نہین ہے۔ بلکہ آفتاب سے روشنی اون پر پڑتی ہے اور منعکس ہوکر ہم کو نظر آتی ہے۔

جو بذات خود روشنی رکھتے ہین۔ اُن مین آفتاب سب سے بڑا اور ثوابت چھوٹے معلوم ہوتے ہین۔ اور جن پر آفتاب کی روشنی منعکس ہوتی ہے اُن مین چاند سب سے بڑا اور سیارے چھوٹے معلوم ہوتے ہین۔ "معلوم ہوتے ہین" مصلحتاً لکھا گیا۔ کیونکہ آفتاب بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اور ثوابت چھوٹے۔ لیکن اکثر ثوابت آفتاب سے بدرجہا بڑے ہین، شاید ہی کوئی تارہ آفتاب سے چھوٹا ہو۔ اگر آفتاب بڑا معلوم ہوتا ہے تو اُس کے حجم کی وجہ سے نہین بلکہ صرف اوس کی قربت کی وجہ سے ہے۔

علمائے ہیئت نے آفتاب کا فاصلہ نو کرور انتیس لاکھہ میل (۹۲۹۰۰۰۰۰) کے قریب دریافت کیا ہے، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آفتاب کا فاصلہ کرۂ زمین سے (یا کرۂ زمین کا فاصلہ آفتاب سے) ہر وقت مساوی نہین رہتا یعنی کرۂ زمین آفتاب کے گرد دائرے مین حرکت نہین کرتا بلکہ اوس شکل مخروطی مین حرکت کرتا ہے جو کہ غلطی سے یا کسی نامعلوم وجہ سے بیضوی کہلاتا ہے۔ اس شکل کے دو مرکز ہوتے ہین جب مرکزون کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا ہے تو شکل لمبی ہوجاتی ہے اور جب فاصلہ

بالکل نہ ہو یعنی ایک ہی نقطہ پر دونون مرکز ہون تو شکل دائرہ بن جاتا ہے ۔

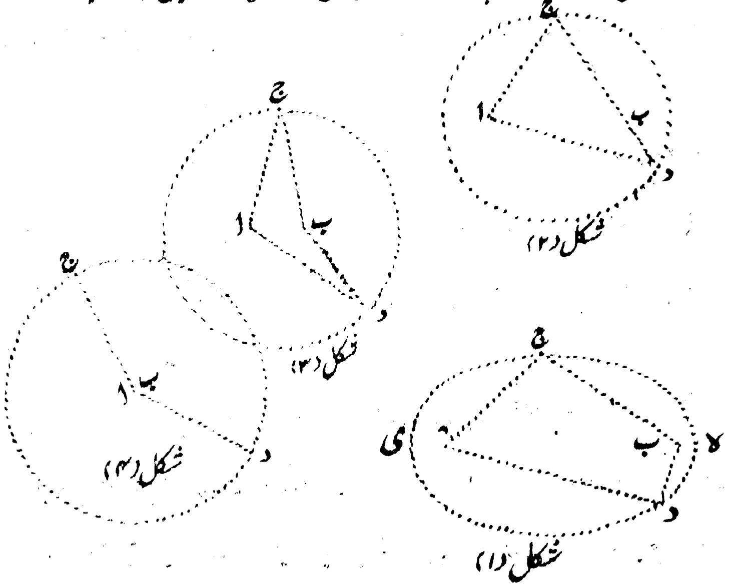

ایک ہی پیمانہ کی چار شکلین کھینچی گئی ہین۔ شکل اول مین مرکزون کا فاصلہ سب سے زیادہ ہے
شکل دوم مین کم کر دیا گیا۔ سوم مین اور بھی کم اور چہارم مین مرکز ا و ب ایک ہی نقطہ پر
آگئے ہین۔ اس لئے یہ چوتھی شکل دائرہ ہے اور باقی تین بیضوی۔ ان شکلون کی خاصیت
یہ ہے کہ محیط پر اگر کوئی نقطہ لیا جائے تو دونون مرکزون سے فاصلے کے جملے مین تغیر
نہین ہوتا یعنی نقطہ ج و د کسی مقام پر کیون نہ فرض کئے جاوین ا ج + ب ج =
ا د + ب د ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے شکل بیضوی کے ایک مرکز پر آفتاب ہے اور
دوسرا خالی۔ خواہ مخواہ کبھی تو کرۂ زمین آفتاب کے قریب آجاتا ہے اور کبھی فاصلہ پر
چلا جاتا ہے، جب بہت قریب آجاتا ہے تو قربت کی وجہ سے آفتاب بڑا نظر آنے لگتا ہے
اور جب فاصلہ پر چلا جاتا ہے تو چھوٹا نظر آنے لگتا ہے، لیکن ان دونون شکلون مین
اس قدر کم فرق ہے کہ کسی بہت ہی نازک آلے کی مدد کے بغیر یہ فرق دریافت کرنا ممکن نہین
آفتاب کا سب سے زیادہ فاصلہ (یعنی ۳ جولائی کو جبکہ فاصلے کی وجہ سے

آفتاب کا قرص سب سے چھوٹا نظر آتا ہے اور قرص کا قطر ۳۱ دقیقے ۳۱ ثانیے ہوتا ہے) نو کرور چھیالیس لاکھ (۹۴۶۰۰۰۰۰) میل ہے اور سب سے کم فاصلہ (یعنی یکم جنوری کو جبکہ قربت کی وجہ سے آفتاب بڑا نظر آتا ہے اور قرص کا قطر ۳۲ دقیقے ۳۵ ثانیے ہوتا ہے) نو کرور گیارہ لاکھ (۹۱۱۰۰۰۰۰) میل ہے، اوسط فاصلہ نو کرور انتیس لاکھ (۹۲۹۰۰۰۰۰) میل ہے اور اس وقت قرص کا قطر ۳۱ دقیقے ۳۲ و ۲ ثانیے ہوتا ہے، کرۂ زمین اوس اوسط فاصلے پر ۲ر اپریل اور ۳ر اکتوبر کو آیا کرتا ہے۔

کاغذ پر صرف اس فاصلے کے عدد کے لکھ دینے سے فاصلے کا اندازہ ہو جانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہذا کسی دوسرے طریقہ سے اس فاصلے کی عظمت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آج کل ریل تو قریب قریب سب ملکون مین پھیل گئی ہے۔ اور اس کی رفتار سے بھی سب پیرو جوان واقف ہین، ہمارے ملک مین دو قسم کی ریل چلتی ہین۔ جن گاڑیون مین صرف مال لادا جاتا ہے وہ آہستہ چلتی ہین اور مسافرون کی گاڑی تیز چلتی ہے۔ مسافرون کی گاڑیان بھی دو قسم کی ہوتی ہین جو ڈاک گاڑھی کہلاتی ہین وہ تیز رفتار ہوتی ہین اور چھوٹے مقامون پر نہین ٹہیرتین اس ڈاک گاڑہی کی اوسط رفتار فی گھنٹہ تیس (۳۰) میل ہوتی ہے،، اگر کرۂ زمین سے آفتاب تک ریل بچھا کر اس قسم کی ڈاک گاڑہی چلانی ممکن ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ کتنے عرصے مین مسافر آفتاب تک پہنچ جائے گا۔ اگر ریل شب و روز یکسان رفتار (یعنے ۳۰ میل فی گھنٹہ) سے چلی جائے اور کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہ ٹہیرے تو مسافر تین سو تریپن (۳۵۳) سال اور (۹۵) پچانوے دن مین منزل مقصود یعنی آفتاب تک پہنچ جائے گا، یعنی اگر اکبر بادشاہ نے ہیمو بقال پر پانی پت کے میدان مین فتح یاب ہو کر ریل کے ذریعے آفتاب کے کسی بادشاہ کو خط روانہ کیا ہوتا تو یہ خط

آفتاب مین اُسوقت پہنچتا ہے جبکہ ہمارے موجودہ شہنشاہ اعلیحضرت جارج پنجم دام اقبالہ کے جلوس کی تیاری انگلستان مین ہو رہی تھی، اور خط کے ساتھ اگر کسی سفیر کو روانہ کیا تو تو کم از کم بارہ پشتین ریل ہی مین گزر جاتین،، اب کچھ سمجھ مین آیا ہوگا کہ آفتاب کا فاصلہ کتنا ہے۔ اور گو یہ فاصلہ اس قدر زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن ثوابت کے فاصلے کے بالمقابل بہت ہی کم ہے۔۔ روشنی اسقدر تیز چلتی ہے کہ آفتاب سے کرۂ زمین تک روشنی کی شعاعون کو پہنچنے مین (۴۹۷) ثانیے لگ جاتے ہین یعنی روشنی فی ثانیہ قریب ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل چلتی ہے۔ آفتاب کو قطع نظر کر کے سب سے نزدیک کے تارۂ بروج قنطورس کے ستارہ سے کرۂ زمین تک روشنی پہنچنے مین ۴ء۴ سال کے قریب لگ جاتے ہین یعنی کرۂ زمین سے آفتاب کا فاصلہ جس قدر ہے سب سے نزدیک کا تارہ اس سے پونے تین لاکھ (صحیح عدد ۲۷۹۳۸۳) گنے سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ یہ تو سب سے قریب کے تارے کا فاصلہ ہوا۔ اکثر ایسے ثوابت ہین جن سے کرۂ زمین تک روشنی پہنچنے مین دو ہزار سال لگ جاتے ہین،، اس سے ثوابت کے فاصلے کا کچھ اندازہ ملسکتا ہے۔ تارون کے فاصلے اکثر روشنی کی رفتار کے زمانے سے تعبیر کرتے ہین مثلاً کہتے ہین کہ تارۂ دبران ۲ء۱۲ سال کے فاصلے پر ہے یعنی تارۂ دبران سے کرۂ زمین تک روشنی ۱۲ سال ۸ ماہ مین پہنچتی ہے یا کہ قطب تارہ ۴۷½ سال کے فاصلے پر ہے۔ الخ

اب آفتاب کے فاصلے کا کچھ اندازہ ملگیا اور یہ بھی ہمکو معلوم ہوا کہ دور کی چیز چھوٹی نظر آتی ہے تو اتنے فاصلے کی چیز بھی چھوٹی معلوم ہوتی ہوگی، کہ آفتاب جبکہ اتنے فاصلے پر ہے تو اُس کا حجم بھی بہت بڑا ہوگا۔ ظاہر اگو آفتاب ایک طباق سا

Centauri. al

نظر آتا ہے۔ لیکن اگر دوربین کی عینک لگاکر دیکھین تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ دراصل ایک کرہ ہے، علمار کے پیمالیش سے اس کرے کا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار (۸۶۶۰۰۰) میل معلوم ہوا ہے۔ یعنی اگر کرۂ زمین کے حجم کے متعدد گولے باہم مس کرتے ہوئے ایک قطار مستقیم مین جمائے جاوین تو (۱۰۹) کرے جمانے پر بھی آفتاب کے قطر مین کچھ جگہ باقی رہ جائے گی۔ یا فرض کرو کہ آفتاب ایک ڈبہ ہے اُس کے اندر خلا ہے اس خلا مین اگر کرۂ زمین اور اس کے گرد گھومتا ہوا چاند بھردین تو چاند کا فاصلہ ڈبے کی سطح سے قریب قریب اتنا ہی ہوگا جتنا کہ کرۂ زمین سے، یعنی (پانچوین شکل مین) اگر دائرہ ا ب ج آفتاب کا قرص ہو اور ی پر کرۂ زمین ہو تو دائرہ د ہ ط پر چاند متحرک نظر آوے گا۔ نقطہ ی سے د کا فاصلہ اور دائرہ د ہ ط سے ا ب ج فاصلہ قریب قریب برابر نظر آتا ہے۔

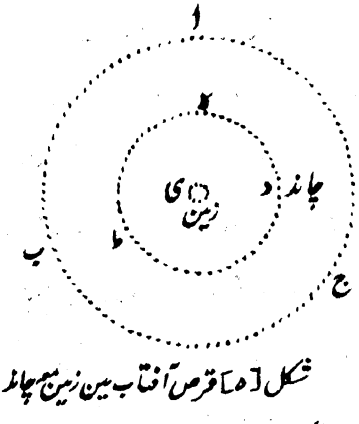

شکل [۵] قرص آفتاب مین زمین مع چاند

اگر زمین کے گرد خط استوا پر ریل چلانی ممکن ہو اور ریل فی گھنٹہ تیس میل چلے تو دورہ کرنے کے لئے ۳۴ دن ۱۳ گھنٹے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر آفتاب کے گرد اسی طرح اسی رفتار سے دورہ کرنا چاہین تو دس سال چار ماہ سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوگا۔ یا اگر فرض کیا جائے کہ کمہار ایک ہاتھ مین گیلی مٹی کا گولا لئے ہوئے ہے۔ اور اسمین سے توڑ توڑ کر چھوٹی چھوٹی گولیان بناتا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آفتاب کو توڑ توڑ کر کرۂ زمین کی حجم کی چھوٹی گولیان بنائی جاوین تو کم وبیش تیرہ لاکھ آٹھ ہزار تین سو (۱۳۰۸۳۰۰) گولیان بن جائینگی۔ یا اگر آفتاب کو ایک بڑے فٹ بال سے

تشبیہ دین تو کرۂ زمین کو ایک رائی یا سرسون کے برابر تصور کرنا ہوگا۔

علماء نے نہ صرف آفتاب فاصلہ اور حجم ہی دریافت کرلیا ہے بلکہ وزن بھی دریافت کرلیا ہے۔ اگر ایک ایسی بڑی میزان ملے کہ اوس کے ایک پلڑے پر آفتاب کو رکھدین اور دوسرے پلڑے پر کرۂ زمین کے ہموزن گولے بطور باٹ رکھتے جاوین تو تین لاکھ تینتیس ہزار گولے چڑھانے پر بھی آفتاب کا پلڑا جھکا رہے گا۔

پہلے تو بیان کیا گیا کہ آفتاب کا حجم تیرہ لاکھ کرۂ زمین کے حجم سے کچھ زیادہ ہے اور اب کہا گیا کہ وزن مین صرف تین لاکھ تینتیس ہزار کرۂ زمین کے برابر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین کا مادہ آفتاب کے مادہ سے زیادہ کثیف ہے۔ آفتاب کی کثافت تناسب ۴ ر ا پر ہے یعنی اگر آفتاب خالص کشیدہ پانی کا گولا ہوتا تو جسقدر وزن ہونا چاہیئے تھا اُس سے ۴ ر ا چند زیادہ وزنی ہے۔ اسی طور پر زمین کی کثافت تناسب ۸ ۵ ر ۵ ہے۔ اس لئے کرۂ زمین کا مادہ آفتاب کے مادہ سے (۵۸ ر ۵ ۸ ۹ ر ۳) قریب چہار چند وزنی ہے۔ یا کہ سائنس کے اصطلاح مین آفتاب کی کثافت تناسب بمقابلہ کرۂ زمین ۸ ۹ ر ۳ ہے۔

مادے کی خاصیت یہ بھی ہے کہ ایک مادہ دوسرے کو اپنی جانب کشش کرتا ہے اگر ہم ایک پتھر اپنے ہاتھ مین اُٹھالین تو پتھر کرۂ زمین کو اور کرۂ زمین پتھر کو اپنی اپنی جانب کشش کرے گا۔ اب اگر پتھر کو چھوڑ دین تو اصولاً دونون ایک دوسرے کی جانب حرکت کرنے لگین گے۔ اور جب باہم ٹکرا کر ساکن ہو جاوین تو پتھر کا مادہ × جو فاصلہ پتھر نے طے کیا = کرۂ زمین کا مادہ × جو فاصلہ کرۂ زمین نے طے کیا۔ لیکن چونکہ پتھر کے مقابلہ مین کرۂ زمین کے مادہ کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اس لئے جو فاصلہ کہ کرۂ زمین نے طے کیا اس قدر کم ہوگا کہ ہمارے پیمانہ سے ناپا ہی نہین جا سکتا بہ الفاظ دیگر پتھر متحرک اور کرۂ زمین ساکن معلوم ہوگا۔ یا کہ ہماری روزانہ گفتگو کی اصطلاح مین

پتھر گر پڑیگا - اس قوت کو **کشش ثقل** اور اس قوت کے پیمانے کو **وزن** کہتے ہیں - اگر پتھر کو کرۂ زمین کے مرکز سے دوچند فاصلے پر لیجاویں یعنی اگر قریب[لہ] (۴۰۰۰) ہزار میل بلند کسی مقام پر لیجاویں تو اوس مقام پر پتھر کا وزن ابتدائی وزن کا $\frac{1}{2\times2}$ = $\frac{1}{4}$ یعنی ایک ربع رہ جاوے گا - اسی طرح اگر آٹھ ہزار (۸۰۰۰) میل بلند کسی مقام پر لے جاویں یعنی مرکز سے فاصلہ سہ چند کر دیا جائے تو وزن $\frac{1}{3\times3}$ = $\frac{1}{9}$ رہ جاویگا -

اگر فرض کیا جائے کہ اس پتھر میں اس قدر جرمیت ہو کہ اُس کا وزن زمین کی سطح پر ایک سیر ہو تو اُسے آفتاب کی سطح پر منتقل کرنے پر اُس کا وزن زیادہ ہو جاوے گا کیونکہ چونکہ آفتاب کی جرمیت زمین کی جرمیت سے بہت زیادہ ہے - اس لئے کشش ثقل بھی زیادہ ہوئی - لیکن آفتاب کے مرکز سے اس کی سطح کا فاصلہ ۴۳۳۰۰۰ چار لاکھ تینتیس ہزار میل ہے اور زمین کے مرکز سے سطح کا فاصلہ چار ہزار میل سے کم ہے - اس لئے چونکہ آفتاب کا فاصلہ بہت زیادہ ہے - اس لئے آفتاب کی سطح پر وزن کم ہو جائے گا - اس کمی وبیشی کے مجموعے سے حساب لگایا گیا ہے کہ اس ایک سیر پتھر کا وزن آفتاب کی سطح پر ستائیس (۲۷) سیر سے کچھ زیادہ ہو جاتا ہے -

کرۂ زمین کے نباتات وحیوانات کی نشو ونما کا انحصار آفتاب کی روشنی وحرارت پر ہے - اس لئے ہماری نظروں میں جملہ اجرام فلکی میں آفتاب کی قدر ومنزلت سب سے زیادہ ہے - آفتاب کو اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جاتا ہے یہ ایک مکمل کرہ ہے یعنی سیاروں کی طرح شمال وجنوب کی جانب دبا ہوا نہیں ہے - اس کرہ کی سطح پر ہمکو سوا شعلے کے اور کچھ نظر نہیں آتا - گویا ایک شعلے کا کرہ ہے - آفتاب کے اندر کا حصہ

[لہ] کرۂ زمین کا اوسط قطر (۷۹۱۸) میل اس لئے مرکز سے سطح کا اوسط فاصلہ (۳۹۵۹) میل ہوا - اس عدد کے لئے قریب چار ہزار لکھا گیا ہے -

ممکن ہے کہ منجمد ہو یا مائع۔ لیکن یقینی طور پر ہم کو اس کا علم نہیں، قیاس تو یہی کہتا ہے کہ نہ منجمد ہے اور نہ مائع بلکہ گیس ہی گیس ہے۔ جس طرح باہر کا حصہ روشن گیس ہے اسی طرح اندر کا حصہ تاریک گیس ہوگا۔ کیونکہ حکیموں نے متعدد مشاہدوں سے ثابت کیا ہے کہ گیس پر اگر زیادہ دباؤ ڈالا جائے تو گیس سے مائع بن جاتا ہے۔ لیکن اس عمل کے لئے ایک خاص درجہ حرارت یا اُس سے کم ہونا لازمی ہے، اس خاص درجۂ حرارت کو کریٹیکل ٹمپریچر[۵۱] کہتے ہیں۔ اُس درجۂ حرارت سے زاید درجہ حرارت پر گیس پر دباؤ ڈالکر مائع بنانا ناممکن ہے۔ چونکہ آفتاب کا درجہ حرارت اس کریٹیکل ٹمپریچر سے بدرجہا زائد ہے۔ اس لئے آفتاب میں کتنا ہی زیادہ دباؤ کیوں نہ ہو مائع کا وجود ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اور جبکہ مائع ہی نہیں بن سکتا تو منجمد یا ٹھوس کا وجود بھی ناممکن ہے۔

جس طرح کرۂ زمین کے گرد کرۂ باد ہے اسی طرح آفتاب کے گرد ایک لطیف کرۂ منور گیس کا ہے، انگریزی میں اس کرۂ منور گیس کو کرومواسفیر[۵۲] کہتے ہیں، اس کی ضخامت پانچ چھ ہزار میل سے زاید نہیں معلوم ہوتی۔ جس طرح کرۂ زمین کے کرۂ باد میں پانی کا بخار ملا ہوا ہے۔ اور کبھی کبھی بخارات منجمد ہو کر ابر کی شکل میں ہمکو نظر بھی آجاتا ہے۔ اسی طرح آفتاب کے کرۂ منور گیس میں دھاتوں کے بخارات اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور گاہے گاہے ابر کی شکل میں ہمکو نظر بھی آجاتے ہیں۔ کرۂ منور گیس کے نیچے کے روشن حصے کو اصطلاح میں فوٹواسفیر[۵۳] یعنی کرۂ نور کہتے ہیں گاہے گاہے اس کرۂ نور میں طوفان آتا ہے تو سیاہ داغ یا کلف نظر آنے لگتے ہیں۔

---

[۵۱] Critical temperature

چاند کے سیاہ داغ تو سب نے دیکھے ہین لیکن آفتاب کے سیاہ داغ خالی آنکھ سے نظر نہین آتے ۔ دوربین سے یا جب داغ بڑے ہون تو کانچ پر کاجل لگا کر دیکھنے سے نظر آجاتے ہین " ان دونون داغون مین فرق یہ ہے کہ چاند کے داغ تو مستقل ہین یعنی اپنی جگہ سے حرکت نہین کرتے ۔ کیونکہ دراصل چاند مین بلند پہاڑ ہین اور اُن پہاڑون کا سایہ سیاہ نظر آتا ہے ، لیکن آفتاب کے داغ کرۂ نور (فوٹوسفیر) مین طوفان کے وقت بڑے بڑے ورطون[۵۱] کی شکل مین دکھائی دیتے ہین جو دراصل سیاہ نہین بلکہ دھندلے ہوتے ہین ۔ لیکن اپنے قریب کے بہت ہی زیادہ روشن سطح کے مقابل مین سیاہ نظر آتے ہین ۔ ظاہر ہے کہ گیس کی سطح پر ورطہ مستقل نہین ہوسکتا ۔ ان داغون کی روزآنہ پیمایش سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی تو یہ بڑھتے جاتے ہین اور کبھی گھٹتے گھٹتے نظرون سے غائب ہوجاتے ہین اور پھر نئے داغ پیدا ہوتے ہین ۔

روزآنہ ایک خاص رخ مین اُن کی رفتار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کرۂ آفتاب اپنے محور پر بھی حرکت کرتا ہے ۔ لیکن چونکہ ابر کی طرح اُڑنے والی چیزون سے حرکت کی پیمایش کیجاتی ہے ۔ اس لئے صحیح طور پر دورے کا وقت نہین معلوم ہوتا ۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ آفتاب اپنے محور پر ۲۵ سے ۲۸ یوم مین دورہ کرتا ہے ۔

ان طوفانی ورطون کی وسعت کی پیمایش بھی کی گئی ہے ۔ یہ اتنے بڑے ہوتے ہین کہ اگر ایک چھوٹے ورطے مین کرۂ زمین آجاوے تو اس طرح غائب ہوجاوے کہ جیسے ایک اچھی خاصی باؤلی مین ایک فٹ بال کے مساوی پتھر ڈوب کر غائب ہوجاتا ہے دوربین کی ایجاد کے بعد پہلے پہل جس ورطے کی پیمایش ہوئی اُس کا رقبہ پچاس ہزار

[۵۱] ۔ ورطہ بھنبور ۔

مربع میل سے کچھ زاید تھا۔ اس کے بعد اکثر ڈیڑھ دو لاکھ مربع میل کے ورطون کی پیدایش ہوئی ہے۔

اہل یوروپ کا دعوےٰ ہے کہ دوربین کی ایجاد کے بعد یوروپ مین ان داغون کا اکتشاف ہوا۔ لیکن ہندوستان کی ویدون مین آفتاب کی تعریف مین بارہا ان داغون کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کم از کم پانچ ہزار سال قبل (اور اگر یوروپ کے علما کی رائے صحیح ہو تو بھی ۳۵۰۰ سال قبل) ویدون کی مسلسل تالیف ہوئی۔ اس سے نہین معلوم کتنے زمانے پہلے کے یہ کلام ہین۔

آفتاب کے مقابلے مین چاند کا حجم بہت چھوٹا ہے۔ لیکن چونکہ چاند بہت قریب ہے۔ اس لئے یہ دونون قریب قریب برابر حجم کے نظر آتے ہین۔ یعنی دونون کے قرص مساوی معلوم ہوتے ہین۔ جب کرۂ زمین اور آفتاب کے درمیان چاند آجاتا ہے تو چاند آفتاب کو ڈھنک لیتا ہے۔ اس فعل کو آفتاب کا گہن یا کسوف کہتے ہین۔ اکثر ایسا موقع بھی ہوتا ہے کہ چاند آفتاب کو پورے طور پر ڈھنک لیتا ہے۔ اسوقت آفتاب کی شعاعین زمین تک نہین پہنچتین اس لئے ہمارے اردگرد اندھیرا ہوجاتا ہے۔ اور آفتاب کے گرد کی ایسی چیزین نظر آنے لگتی ہین جو کہ روشنی کے وقت نظر نہین آتین۔ اُسوقت آفتاب کے کنارون پر بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آتے ہین۔ اُن کو آفتاب کی پرامیننس[۱] یا مشعل کہتے ہین۔ ایک مرتبہ ان کا وجود دریافت ہونے کے بعد ایسی ترکیب دریافت ہوگئی ہے کہ جس وقت چاہین آلے کے ذریعہ سے نظر آنے لگین، لیکن صرف ایسی ہی مشعل مین صاف نظر آتے ہین جو کنارون پر

---

[۱] Prominance.

ہوتے ہین، قرص آفتاب کے وسط مشعلین نہین نظر آتین ، ان مشعلون کی بلندی
کی آسانی سے پیمایش ہوجاتی ہے ۔ کیونکہ چونکہ آفتاب کے قرص کے قطر کی لمبائی

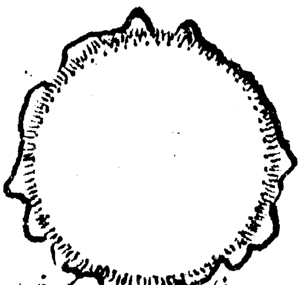

شکل [۶] آفتاب کی مشعل

معلوم ہے ۔ اس لئے صرف قرص سے
مقابلہ کرنے سے اس کی بلندی معلوم
ہوجاتی ہے ۔ بیس پچیس ۲۵ ہزار میل
بلند مشعلین تو ہر وقت متعدد نظر
آتی ہین ۔ ایک مرتبہ ، ۷ اکتوبر سنہ ۱۸۸۰ء کو
ایک مشعل چالیس ہزار میل بلند نظر آئی ۔ چونکہ چالیس ہزار میل کوئی ایسی غیر معمولی
بلندی نہین ہے ۔ اس لئے اُسپر خاص توجہ نہین کی گئی ۔ لیکن تقریباً ادھ گھنٹے مین
اس کی بلندی دوچند ہوگئی ۔ اب تو رسدگاہون مین کھلبلی پڑگئی اور سب دوربینین
آفتاب ہی پر جھک پڑین ۔ اس کے بعد ایک گھنٹے تک شعلہ بڑھتا ہی گیا ۔ حتیٰ کہ
کل ڈیڑھ گھنٹے مین چالیس ہزار سے ساڑھے تین لاکھہ میل بلند ہوگیا ، یعنی شعلے کی
رفتار جانب سمت الراس فی ثانیہ ۴۳ ر ۷ ۵ میل ہوئی ۔ یہ وہ رفتار ہے جس کا
قیاس کرنا بھی ہمارے لئے دشوار ہے ۔ کیونکہ عملی طور پر تیز سے تیز رفتار جو ہم
بذریعہ آلہ پیدا کرسکتے ہین رائفل[۵] بندوق کی گولی کی ہوتی ہے ۔ اور اس گولی کی رفتار
فی ثانیہ نصف میل سے زاید نہین ہوتی ۔ اس شعلے کی رفتار رائفل کے گولی کی رفتار
سے کم از کم ۱۱۵ چند زاید ہوئی ۔ اس کے بعد شعلے کے اوپر کا حصہ ٹوٹ کر جدا
ہوگیا ۔ اور چلتے چلتے نظرون سے غائب ہوگیا ۔ ذرا غور تو کرو کہ ساڑھے تین لاکھہ
میل بلند شعلہ کتنا بڑا ہے ۔ اگر کرۂ زمین کے سطح پر اتنا بڑا شعلہ ہو بلکہ اُس کا صرف ½

۵ Rifle.

دو ثلث بھی ہو تو اُس شعلہ سے چاند جل جائے گا۔ کیونکہ چاند کا فاصلہ صرف دو لاکھ
اونتالیس ۳۹ ہزار میل ہے۔ اس شعلے مین اگر کرۂ زمین کے حجم کے ہزارون گولے آجاوین
تو جل کر خاک ہو جاوین۔ یہان تو صرف شعلے کی بلندی معلوم ہوئی۔ اس کی وسعت
کا رقبہ بھی اسی مناسبت سے ہوگا۔ بہرحال ان بیانون سے آفتاب کی عظمت کا
کچھ اندازہ مل سکتا ہے۔

ہماری کل حرارت کا منبع آفتاب ہے۔ آفتاب ہی کی حرارت سے تمام نباتات
و حیوانات کی زندگی قایم ہے۔ خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آفتاب مین حرارت کی
مقدار کس قدر ہے۔ آفتاب سے چارون طرف حرارت منتشر ہو رہی ہے۔ اس جملہ
مقدار کا کس قدر حصہ کرۂ زمین مین پیوست ہو جاتا ہے۔ آفتاب سے نو کرور ۲۹ لاکھ
میل کے فاصلے پر کرۂ زمین حرکت کر رہا ہے اور کرۂ زمین کا حجم بھی اس فاصلے
کے مقابلہ مین بہت کم ہے۔ ریاضی دان علما نے حساب لگایا ہے کہ آفتاب سے
جو مقدار حرارت چارون طرف منتشر ہو رہی ہے اوس کا قریب دو سو تیس کرور
ان حصہ ($\frac{۱}{۲۳........}$) کرۂ زمین جذب کرتا ہے۔ اتنی ہی حرارت سے
روئے زمین کے کل کاروبار چل رہے ہین۔ بلکہ اس کا بہت بڑا حصہ تو فضول
ضایع ہو جاتا ہے۔ ہمارے مفید کام مین مستعمل نہین ہوتا۔ اگر ایک بھٹی کے سامنے
چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو جاوین تو حرارت سے جلد پر گرمی محسوس ہوتی ہے۔
لیکن دو چار قدم پیچھے ہٹ جانے پر اتنی گرمی نہین معلوم ہوتی۔ اب آفتاب کی حرارت
کو دیکھو کہ کرورون میل کے فاصلے پر جبکہ شعاعین عموداً پڑتی ہین تو تھوڑے ہی
عرصے مین بیتاب ہو جاتے ہین۔ روئے زمین پر جتنے مفردات پائے جاتے ہین
اُن مین سونا، چاندی، تانبا، جست، سیسا، رانگ۔ پارہ۔ لوہا وغیرہ دھات کہلاتے
ہین۔ ان مین صرف پارہ مایع اور باقی سب منجمد شکل مین پائے جاتے ہین۔ بھٹی

کی حرارت سے اکثر دھاتین گل کر مائع شکل کی ہو جاتے ہین۔ لیکن مشکل سے بعض
ایسی دھاتین بھی ہین مثلاً پلاٹینم[۵۱] وغیرہ جن کو معمولی بھٹی مین گلانا تو درکنار نرم بھی
نہین کر سکتے، لیکن آفتاب کے کرۂ منور گیس و کرۂ نور مین روئے زمین کی
سب دھاتین بخار کی شکل مین موجود ہین، لہذا ذرا غور سے اتنا ہماری سمجھ مین آجاتا ہے
کہ آفتاب کے درجۂ حرارت کا ہم قیاس بھی نہین کر سکتے۔ بعض حکیمون نے لکھا ہے
کہ آفتاب کا درجہ حرارت دس ہزار صدی کا ہے۔ لیکن بالکل فرضی طور پر
ایک دوسرے صاحب کی رائے ہے کہ آفتاب کا درجہ حرارت بیس ہزار درجہ
ہے۔ اور تیسرے صاحب نے لکھا ہے ۵۰۰۰۰ پچاس ہزار۔ ان عددون ہی سے
ظاہر ہے کہ سب نے خیالی پلاؤ پکائے ہین۔ اور اپنی اپنی ہمت کے موافق عدد
کم و بیش کر دئے ہین ایک ریاضی دان نے آفتاب کی مقدار حرارت کا اندازہ لگایا ہے
وہ کہتے ہین کہ اگر آفتاب کے گرد ۴۳ فٹ موٹی برف کی تہ رکھوا دی جائے
تو آفتاب کی اندرونی حرارت سے ایک منٹ مین یہ برف گلکر پانی ہو جایگی۔

چونکہ کرۂ باد کرۂ زمین کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور کرۂ زمین کے ساتھ ہی
متحرک ہے۔ اس لئے کرۂ باد کو کرۂ زمین کا جز قرار دینا مناسب ہے۔ اسی طرح
آفتاب کے کرۂ منور گیس کے گرد ایک بادامی شکل کا بہت ہی لطیف غلاف
نظر آتا ہے، یہ غلاف ہر وقت نظر نہین آتا بلکہ صرف پورے گہن کے وقت۔ جبکہ
آفتاب کا روشن قرص چاند کے سیاہ پردے سے پورے طور پر ڈھنک جاتا ہے
اسوقت نظر آنے لگتا ہے۔ جونہی پردہ ہٹا اور آفتاب کی شعاع آنکھ تک پہنچی اور
فوراً یہ لطیف غلاف نظرون سے غائب ہو گیا۔ اس غلاف کو رونا[۵۲] یا تاج یا دستار

---

[۵۱] Platinum.
[۵۲] Corona.

کہتے ہین۔ لیکن اس دستارہ کے گرد ایک اور بھی لطیف نور کا غلاف نظر آتا ہے ۔ ما زمانہ قدیم سے لوگون نے اس غلاف پر غور کیا لیکن آفتاب سے اس کا تعلق سمجھ مین نہ آیا آج کل بہتون کا خیال ہے کہ یہ دراصل آفتاب کا جزء ہے گو بہت ہی لطیف ہے اور اس قدر لطیف ہے کہ بے مادہ صرف نور ہی نور ہے۔ جس سطح مین کرۂ زمین آفتاب کے گرد متحرک ہے اس سطح سے یہ غلاف عموداً واقع ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی (۱۶۰) ایکسو ساٹھ کرور میل اور سب سے زیادہ چوڑائی بیس کرور میل ہے اور اس کی شکل بادامی ہے۔ چونکہ آفتاب سے کرۂ زمین کا اوسط فاصلہ صرف نو کرور میل ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ چوڑائی کے سمت مین سالانہ دو مرتبہ کرۂ زمین آفتاب کے اس لطیف غلاف مین داخل ہوجاتا ہے اوسوقت ہم کو اس کی روشنی نظر نہین آتی۔ لیکن جب کرۂ زمین اس کے سامنے آجاتا ہے تو غروب کے بعد یا طلوع کے قبل صاف نظر آتی ہے۔

فرض کرو کہ کاغذ کی سطح، آفتاب کے گرد، کرۂ زمین کی حرکت کے دائرے یعنی مدار کی سطح ہے، اور آفتاب کا یہ بادامی غلافِ نور، کاغذ کی سطح سے عموداً واقع ہے تو کاغذ کی سطح پر آفتاب کے لطیف نور کا قرص کٹ کر د ہ ط شکل، کی شکل مین نظر آوے گا۔ د سے ہ کا فاصلہ اگر بیس کروڑ میل ہو تو ظاہر ہے کہ کرۂ زمین کا دائرہ دو مرتبہ اس قرص کے اندر آجائیگا، یعنی جب کرۂ زمین درمیان پر ہو اوسوقت یہ نور بالکل نظر نہ آوے گا۔ لیکن جب کرۂ زمین ع یا ط پر ہو اسوقت افق سے قریب قریب ساٹھ درجے بلندی تک مخروطی شکل مشعل جیسی

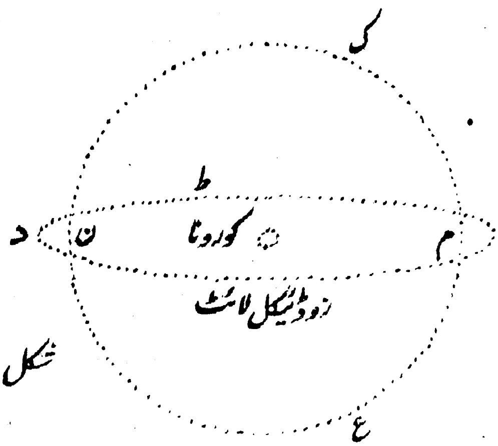

شکل [۷]

مین صاف نظر آئیگا۔ کسی روز جبکہ مطلع صاف ہو۔ اندھیری رات ہو تو غروب کے بعد غور سے دیکھو تمکو

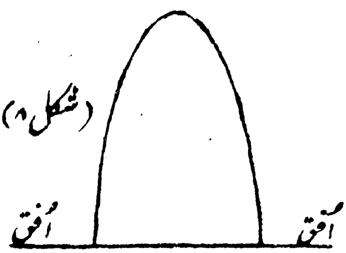

(شکل ۸)

مغرب مین جس نقطے پر کہ آفتاب غروب ہوا ہے اُسکے اوپر ہی اس شکل کی روشنی نظر آوے گی اسکو انگریزی مین زوڈیکل لائٹ[ہ] کہتی ہین شکل مین کاغذ کی سطح سے اسی (۸۰) گرو میل بلند اور اسیقدر عمیق یہ روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

ایسی لطیف چیز کو جسے مادہ نہین کہہ سکتے بلکہ صرف نور ہی نور ہے۔ آفتاب کا جزو قرار دینا واقعی فرضی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے علمار نے ابھی اس بیان کو صحیح قبول نہین کیا ہے۔ بعضون نے قبول کر لیا ہے اور بعضون کے پاس ابھی زیر غور ہے اس مضمون مین اس کا بیان کر دینا شاید قبل از وقت ہو لیکن چونکہ دلچسپی سے خالی نہین ہے اس لئے لکھہ دیا گیا۔ ہمارے ناظرین سے بھی استدعا ہے کہ وہ بھی اسپر خیال کرین۔ اور اگر ممکن ہو تو اپنی کوئی رائے قایم کرین۔

ہ Zodiacal light.

ہلال

آفتاب کے گرد جتنے سیارے متحرک ہین اُن ہین سلسلہ ہین کرۂ زمین تیسرا ہے
یعنی اول ودوم سیارون کے حرکت کے مدار کرۂ زمین کے مدار کے اندر ہین۔
اس لئے یہ دونون سیارے (عطارد وزہرہ) سیارات اسفل کہلاتے ہین
جن سیارات کا مدار کرۂ زمین کے مدار کے باہر ہے اون کو سیارات اعلےٰ کہتے
ہین۔ شکل (۹) سے ظاہر ہوگا کہ سیارہ اسفل کا پورہ فرص کرۂ زمین سے نظر
نہین آسکتا۔ جس طرح چاند ہمکو ہلال کی شکل مین نظر آتا ہے اسی طرح اس سیارہ کے
بہی تشکلات نظر آتے ہین۔ جس موقع پر یہ سیارہ پورے دائرے کی شکل مین
نظر آنا چاہیئے۔ اُس وقت آفتاب سے اُس کی قربت اس قدر ہوتی ہے کہ اسکا
طلوع وغروب آفتاب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کو نظر نہین آتا۔ یعنے
گو وہ ہماری نظرون کے سامنے موجود رہتا ہے۔ لیکن آفتاب کی روشنی کی وجہ سے
نظر نہین آتا۔ جب تک اُس کا فاصلہ آفتاب سے اس قدر نہو کہ آفتاب تو
غروب ہوجائے اور سیارہ اُفق کے اوپر نظر آنے کے لائق ہو یا سیارہ اُفق
کے اوپر آجائے اور آفتاب کا طلوع نہوا ہو۔ تب تک نظر نہین آسکتا۔ سیارات
اعلیٰ کی طرح سیارات اسفل دائرۃ البروج مین آفتاب سے زیادہ فاصلہ پر
حرکت نہین کرسکتے۔ چھوٹے دائرہ مین آفتاب کے گرد متحرک معلوم ہوتے ہین۔

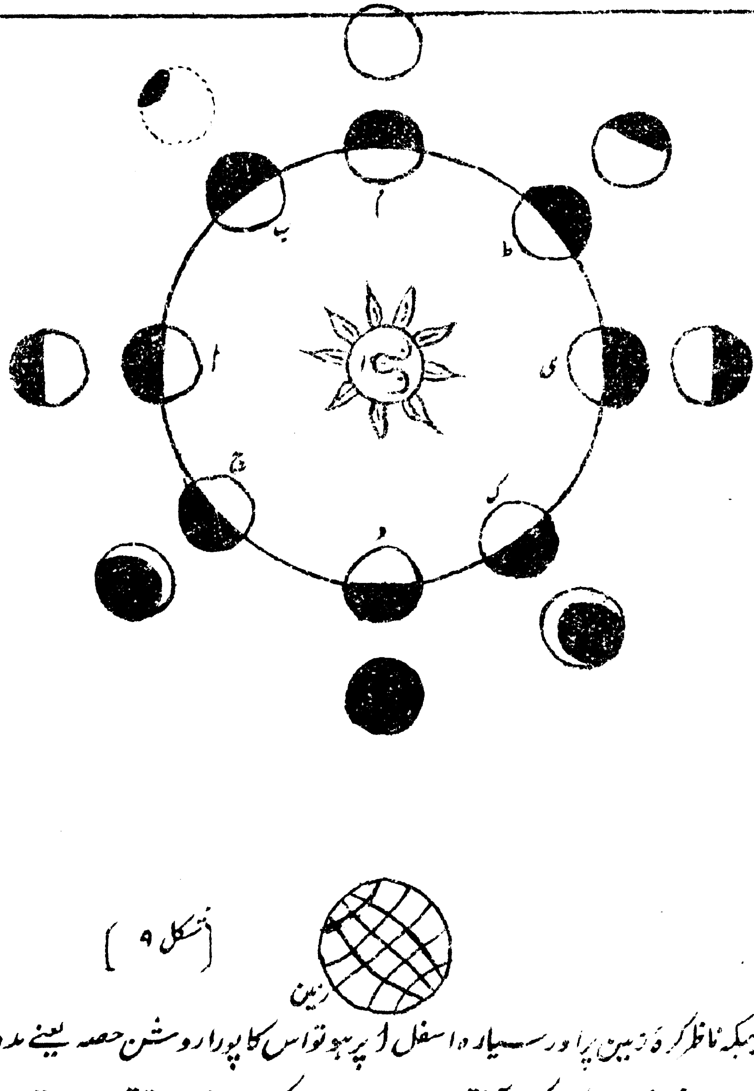

(شکل ۹)

جبکہ ناظر کرۂ زمین پر اور سیارۂ اسفل ا پر ہو تو اس کا پورا روشن حصہ یعنے مدور قرص نظر آنا چاہیے۔ لیکن آفتاب اور سیارہ ایک ہی خط مستقیم مین واقع ہین اس لیے وقت واحد مین طلوع و غروب ہوتا ہے۔ جب سیارہ د یا ہ پر ہو تو نصف حصہ نظر آتا ہے ط و ل ک پر ہلال نظر آتا ہے اور ی پر بالکل نظر نہین آتا۔ اکثر ایسی حالت مین آفتاب کے قرص پر سیارہ اسفل کا قرص صاف حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی یون نظر آتا ہے گویا آفتاب کے روشن سطح پر

ایک سیارہ مدور کیڑا رینگ رہا ہے۔ اسے اُس سیارہ اسفل کا گہن (   ) کہتے ہین لیکن چونکہ سیارہ اسفل اور زمین کے مدارات کے درمیان چند درجون کا میل ہے۔ اس لئے ایسا موقع ہر مرتبہ نہین ہوتا بلکہ کبھی ایک مرتبہ نظر آتا ہے۔

آفتاب کے گرد سب سے نزدیک عطارد اُس کے بعد زہرہ پھر کرۂ زمین ہے۔ اس عطارہ اور زہرہ ہمیشہ ایسے ہلالی شکل مین نظر آتے ہین۔

استقامت ورجعت

اگر کرۂ زمین ن پر ساکن فرض کر لیا جائے اور سیارہ اسفل ا ب ج د ہ ط ی ک پر حرکت کرتا ہو تو ج د ہ ط ی پر حرکت کرتے وقت ایک رُخ مین اور ی ک ا ب ج پر حرکت کرتے وقت دوسرے رخ مین حرکت کرتا ہوا نظر آوے گا۔ سیارہ اسفل آسمان مین آفتاب کے گرد نقاط۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ مین متحرک نظر آوے گا۔ اسلئے ہم کو بجائے خط مستقیم کے حلقون مین متحرک معلوم ہوگا۔ جب سیارہ ہم کو مغرب سے مشرق کی جانب متحرک نظر آوے تو اُسے حرکت **استقامت** اور جب اوس کے برعکس مشرق سے مغرب کے جانب متحرک نظر آوے اُسے **رجعت** کہتے ہین۔ ان دونون حرکتون کے درمیان کچھ عرصے تک سیارہ ساکن معلوم ہوتا ہے۔ ایسے سکون کو **اقامت** کہتے ہین۔

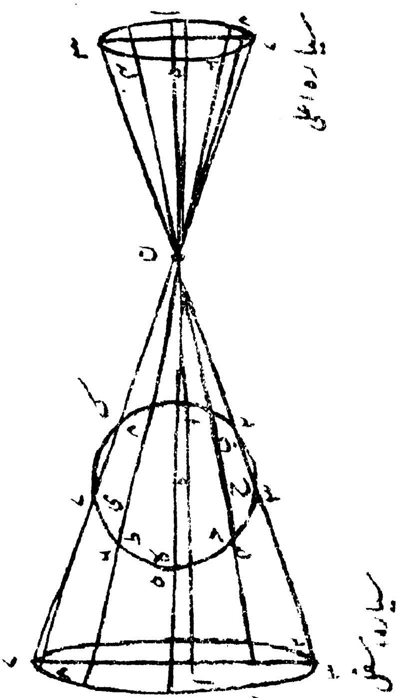

سیارہ اعلیٰ کے لئے فرض کرو کہ ا ب ج د ہ ط ی ک کرۂ زمین کا مدار ہے اور ن کوئی سیارہ اعلیٰ ہے۔ زمین پر سے ناظر کو اسمان مین نقاط ۱-۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ پر سیارہ اعلیٰ نظر آوے گا۔ اسطرح سیارہ اعلیٰ بھی سیارہ اسفل کی طرح بجاے خط مستقیم کے حلقون مین متحرک نظر آویگا۔

عطارد

آفتاب کے گرد جتنے سیارے متحرک ہین اُن مین عطارد سب سے قریب ہے اس کے بعد زہرہ پھر کرۂ زمین پھر مریخ پھر مشتری پھر زحل یہ سیارے تو زمانۂ قدیم سے ہم کو معلوم تھے دوربین کے ایجاد کے بعد دو اور سیارے معلوم ہوے

جو کہ خالی آنکھہ نظر نہین آتے یعنی یورنیس و نیپچون ٭ علاوہ ازین مریخ اور مشتری کے درمیان بہت چھوٹے سینکڑون سیارے نظر آئے جو کہ نجیمات کہلاتے ہین - قیاس چاہتا ہے کہ شاید یہان کوئی بڑا سیارہ تھا کسی زمانہ مین کسی وجہ سے ٹوٹ کر اس کے ٹکڑے ہو گئے ہین - اور اب اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسی مدار پر یا اوس کے قریب متحرک ہین -

اکثر سیارون کے گرد چھوٹے سیارے حرکت کرتے ہین اور وہ بڑے سیارہ کے **توابع** یا **قمر** کہلاتے ہین -

عطارد جس بیضوی شکل مین متحرک ہے اُس کے مرکز ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہین یعنی عطارد کا مدار مثل شکل (۱) چپٹا ہے اس کے نقطہ ا پر آفتاب ہے - جب عطارد نقطہ ک پر پہنچتا ہے تو اُس کا فاصلہ بمقابلہ نقطہ ی کے بہت زیادہ ہو جاتا ہے - یعنی عطارد کا سب سے زیادہ فاصلہ چار کروڑ (۴۳) لاکھہ میل اور سب سے کم فاصلہ دو کروڑ چھیاسی لاکھہ (۲۸۶۰۰۰۰۰) میل ہے - اس کا اوسط فاصلہ تین کروڑ ساٹھہ لاکھہ (۳۶۰۰۰۰۰۰) میل ہے - عطارد آفتاب کے گرد ہمارے ۸۷٫۹۶۹ دنون مین ایک مرتبہ دورہ کر لیتا ہے اور اسی زمانہ مین اپنے محور پر ایک مرتبہ گھوم آتا ہے - اس لئے عطارد مین دن اور رات نہین ہوتے بلکہ نصف کرہ پر ہمیشہ روشنی اور دیگر نصف کرہ پر ہمیشہ تاریکی رہتی ہے - عطارد کے باشندے کو آفتاب ساکن نظر آتا ہے نہ اس کو روزانہ حرکت نظر آتی ہے نہ سالانہ - جو لوگ کہ روشن حصے مین آباد ہین وہ ایک خاص مقام پر آفتاب مستقل طور پر دیکھتے ہین - بیشک جو تاریک حصہ مین آباد ہین وہ ستارون کو متحرک دیکھتے ہین کہ ہمارے ۸۸ دنون کے زمانہ مین ایک مرتبہ دورہ کر کے اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہین -

اس کے شمال وجنوب کے جانب کچھ دبا ہوا معلوم ہوتا ہے - اس کا قطر
۳۰۳۰ میل ہے یعنی کرۂ زمین کے قطر کا قریب ۳/۸ ہے - اس کی کثافت
متناسبہ بمقابلہ آب کشیدہ ۶٫۸۵ ہے - چونکہ کرۂ زمین کی کثافت متناسبہ
۵٫۵۸ ہے اس لئے کرۂ زمین سے بقدر ۶٫۸۵/۵٫۵۸ = ۱٫۲۲۷ زیادہ کثیف ہے۔
چونکہ عطارد کا مدار کرۂ زمین کے مدار کے اندر واقع ہے یعنی چونکہ عطارد سیارہ
اسفل ہے اس لئے اُس کا پورہ روشن قرص ہمکو کبھی نظر نہین آتا - ہمیشہ ہلال کی
شکل مین نظر آتا ہے - بیشک جب خالی آنکھ اُسے دیکھتے ہین تو معمولی ستارہ
کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے - لیکن دوربین سے ہمیشہ ہلال کی شکل مین نظر آتا ہے
لیکن کبھی زیادہ چمکدار بڑا ستارہ سا نظر آتا ہے - کبھی کم اور چھوٹا ستارہ سا -
اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کرۂ زمین سے زیادہ فاصلہ پر چلا جاتا ہے اور کبھی قریب
آجاتا ہے - علاوہ ازین وہ حصہ جس پر آفتاب کی روشنی منعکس ہوتی ہے کبھی
زیادہ نظر آتی ہے کبھی کم اس لئے اُس کے روشنی مین بھی تغیر نظر آتا ہے -
جب کوئی سیارہ شکل بیضوی مین حرکت کرتا ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ جب سیارہ
آفتاب کے قریب آجاتا ہے تو اُس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور فاصلہ پر رفتار کم
ہو جاتی ہے - عطارد کی رفتار مین بھی اسی طرح بہت فرق ہو جاتا ہے ٭ جب یہ
(شکل ۱ - جبکہ ا پر آفتاب ہو) نقطہ ی پر آتا ہے اُس وقت اس کی رفتار فی ثانیہ
۳۵ میل ہوتی ہے اور جب نقطہ ک پر تب رفتار فی ثانیہ ۲۳ میل ہوتی ہے -
اس کی اوسط رفتار ۲۹ میل فی ثانیہ ہے ٭
گو ظاہرا ۳۵ میل فی ثانیہ کی رفتار بہت ہی زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن
لیکن دراصل یہ رفتار عطارد کے لئے زیادہ نہین ہے - رفتار کے ساتھ جسم متحرک
کے حجم کا بھی لحاظ کرنا لازمی ہے - چونکہ عطارد کا قطر (۳۰۳۰) میل ہے اس لئے

اپنے قطر کے برابر فاصلہ طے کرنے مین اُسے ۳۰ میل کے حساب سے بہی ایک منٹ ۲۶ ثانیہ سے بہی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

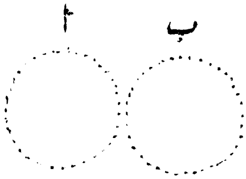

[شکل ۱۱]

اگر کسی کرہ کو ا سے ب تک (شکل ۱۱) حرکت کرنے مین ۲۶ ثانیہ لگ جاوین تو ایسی حرکت کو تیز نہین کہہ سکتے۔ بلکہ اگر ایسے متحرک کرہ کو غور سے دیکہو تو حرکت محسوس بہی نہین ہوتی۔ اس کے مقابلہ مین ایک آدمی کی رفتار پر غور کرو۔ آدمی کی موٹائی یا قطر اگر ایک فٹ فرض کر لیا جائے (جو کہ شاید بہت موٹے آدمی کی ہوتی ہے) اور اگر وہ فی گھنٹہ ۴ میل چلتا ہو (اور اس رفتار کو تیز رفتار بہی نہین کہتے) تو فی ثانیہ ۵۰۸۶ فٹ رفتار ہوئی یعنی ایک فٹ طے کرنے مین ۱۷ر لگتے ہین۔ یعنے چار میل فی گھنٹہ چلنے والا ایک فٹ موٹا آدمی عطارد سے $\frac{۸۶}{۱۷}$ = ۵۰۶ پانسو چہ چند حرکت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ۳۰ میل فی ثانیہ کی رفتار بہت کم ہوئی۔

چونکہ عطارد کرۂ زمین کے مقابلہ مین آفتاب سے قریب تر ہے۔ اس لئے عطارد سے آفتاب کا قرص بڑا نظر آتا ہے۔ اور حرارت بہی اسی مناسبت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کرۂ زمین سے آفتاب جتنا بڑا نظر آتا ہے اگر اُسے آفتاب کے قرص کا معیار قرار دین تو اُس حالت مین جبکہ عطارد آفتاب سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ پر ہو آفتاب کا قرص رقبہ مین ۴½ چند بڑا اور جب عطارد آفتاب سے قریب سے قریب نقطہ پر ہو تو قرص رقبہ مین ۱۰½ چند بڑا نظر آویگا یعنی اگر کرۂ زمین سے آفتاب کا قرص ا (شکل ۱۲) کے برابر نظر آتا ہو تو جب عطارد نقطہ ہ (شکل ۱) پر ہو تو عطارد کے باشندون کو آفتاب کا قرص ب (شکل ۱۲)

کے برابر نظر آوے گا۔ اور جب عطارد نقطۂ ی (شکل ا) پر ہو تو باشندون کو آفتاب کا قرص ج (شکل ۱۲) کے برابر نظر آوے گا۔ بیشک یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ عطارد مین بھی آبادی ہے گو اس کا ثبوت نہین۔ اور اگر آبادی ہو بھی تو انسان ہماری شکل و قوت کے نہین ہو سکتے۔ عطارد کے روشن حصہ کے باشندون کو آفتاب متحرک نہین نظر آتا بلکہ ایک ہی نقطہ پر ساکن نظر آتا ہے۔ اور چونکہ عطارد کا فاصلہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے اس لئے اُن کو ہمارے ۴۴ دن تک آفتاب کا قرص بڑہتا ہوا اور پھر ۴۴ دن تک گھٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کرۂ زمین پر خط استوا کے قریب گرمیون مین جب آفتاب نصف النہار کے قریب ہو تو دو چار گھنٹون کی حرارت سے انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ لیکن عطارد کے باشندہ کے متعلق قیاس کرو کہ آفتاب

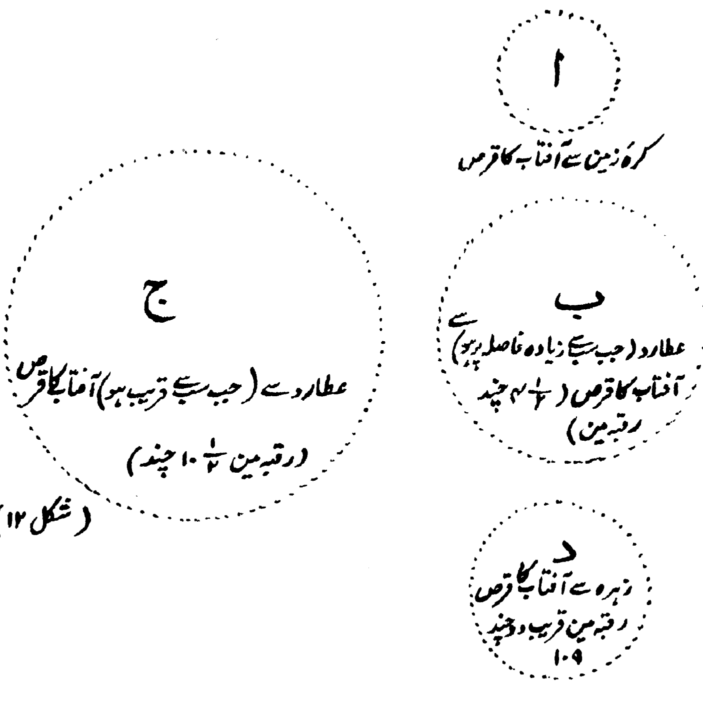

(شکل ۱۲)

اپنی جگہ سے حرکت ہی نہین کرتا۔ بلکہ قرص اور قرص کے ساتھ حرارت کی تیزی اور
روشنی کی جھلک ہمارے حرارت کی تیزی اور روشنی کی جھلک کے مقابلہ مین
۴ ½ چند سے ۱۰ ½ چند تک گھٹتی بڑہتی رہتی ہے۔ تو اونکی کیا حالت ہوئی ہوگی۔
۔ایسی حالت مین جب یہ کہا جاتا ہے کہ
عطارد مین حیوانات اور نباتات کا زندہ رہنا ناممکن ہے تو یہ سمجھہ لینا چاہیئے
کہ اُس قسم کے حیوانات اور نباتات کی زندگی ناممکن ہے جن سے ہم آشنا ہین۔
خدا تعالے نے اُس موقع کے لئے موزون حیوانات اور نباتات بھی بنائے ہونگے
اور ایسے نباتات وحیوانات کا نشو و نما ناممکن نہین ہوسکتا۔

عطارد کے جس حصہ پر تاریکی ہے وہ حصہ بہت ہی ٹھنڈا ہوگا۔ برف جما ہوا
ہوگا۔ ہمارے قطبین پر جو حالت ہے وہ حالت ہوگی یا اُس سے بھی زیادہ
سرد ہوگا۔ عطارد کے گرد کرۂ باد اور کرۂ باد مین بخارات کے وجود کا ثبوت ملگیا ہے
اُس کے سطح پر روشنی اس قدر زیادہ منعکس ہوتی ہے کہ پہاڑ وغیرہ نشیب و فراز
کا یقینی طور پر ثبوت نہین ملتا۔

جس طرح ہمارے کرۂ زمین کے گرد قمر حرکت کر رہا ہے۔ اسی طرح قیاس چاہتا ہے
کہ عطارد کے گرد بھی قمر ہو لیکن ابھی تک قمر کا وجود معلوم نہین ہوا۔ اگر اور بھی تیز
دوربین بن جاوین تو نہین معلوم کیا نظر آتا ہے۔

کرۂ زمین سے عطارد کا فاصلہ ہمیشہ یکسان نہین رہتا۔ زیادہ سے زیادہ فاصلہ
۱۳،۹۰۰۰۰۰ میل ہونا ممکن ہے اور کم سے کم فاصلہ
۴،۸۰۰۰۰۰ میل ہوتا ہے۔ یعنی ان دونون فاصلون مین مناسبت
۲،۸۸۵ : ۱ کی ہے۔ اس لئے عطارد کبھی بہت بڑا نظر آتا ہے۔ اور
کبھی چھوٹا۔

زہرہ

عطارد کے بعد زہرہ آفتاب کے گرد حرکت کرتا ہے۔ زہرہ بھی سیارہ اسفل ہے
اس لیے اس کا قرص ہم کو کبھی پورا نظر نہین آتا۔ ہمیشہ ہلال کی شکل مین نظر آتا ہی
زہرہ کو کبھی شام کا ستارہ اور کبھی صبح کا ستارہ کہتے ہین۔ کبھی کبھی انہین اسقدر
زیادہ روشنی ہوتی ہے کہ صاف سایہ پڑتا ہے۔ اس کی روشنی مین کمی وبیشی کی
وجہ صرف اُس کے روشن حصہ کا کم وبیش ہونا نہین ہے۔ بلکہ اوس کے ساتھ
قربت و فاصلہ کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

فرض کرو کہ (شکل ۹) م پر زہرہ ہو تو نصف دائرہ نظر آوے گا اور ب و ج پر
قریب ⅓ دائرہ نظر آوے گا۔ لیکن گو روشن سطح زیادہ ہوگی فاصلہ بھی
زیادہ ہوگا۔ نقاط۔ ط و ل ث پر نقطہ د سے کم حصہ نظر آوے گا۔ لیکن قربت کی
وجہ سے زیادہ روشن نظر آوے گا۔ نقاط ط و ل ث کو سب سے زیادہ روشنی
کے نقاط کہتے ہین جب زہرہ م پر ہو اور نصف دائرہ نظر آوے اوس کے ۳۵ دن
بعد ط کے قریب اور نقطہ د پر پہنچنے سے ۳۵ دن قبل ل ث کے قریب زہرہ ایسے
نقاط پر پہنچ جاتا ہے جہان اوس کی سب سے زیادہ روشنی ہوتی ہے۔ زہرہ کا مدار
عطارد کے مدار کی طرح چپٹا نہین بلکہ قریب قریب دائرہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکا
آفتاب سے سب سے زیادہ فاصلہ چھ کروڑ پچھتر لاکھ (۶۷۵۰۰۰۰۰) میل
اور سب سے کم فاصلہ چھ کروڑ چھیاسٹھ لاکھ (۶۶۶۰۰۰۰۰) میل ہے اور
اوسط فاصلہ (۶۷۲۰۰۰۰۰) میل ہے۔

زہرہ کرۂ زمین سے جب قریب سے قریب نقطہ پر ہو تو (۲۳۶۰۰۰۰۰)
دو کروڑ چھتیس لاکھ میل کا فاصلہ ہونا ممکن ہے اور جب زائد سے زائد فاصلہ

ہو تو سولہ کروڑ اکیس لاکھ (۱۶۲۱۰۰۰۰۰) میل ہونا ممکن ہے۔ یعنی قریب
سات چند فاصلہ ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کبھی تو زہرہ اول درجہ کے ستارہ سے
بھی بہت روشن نظر آتا ہے اور صاف سایہ پڑتا ہے اور کبھی ماند ہو جاتا ہے۔
زہرہ آفتاب کے گرد ہمارے ۷ر۲۲۴ دن مین دورہ کرتا ہے او عطارد
کی طرح اسی زمانہ مین ایک مرتبہ محور پر گھوم جاتا ہے۔ اس لئے ایک رُخ ہمیشہ
آفتاب کی جانب اور دوسرا ہمیشہ آفتاب سے بعید رہتا ہے۔ اُس کے گرد بھی
کرۂ باد اور کرۂ باد مین بخارات آبی موجود ہے۔ آفتاب زمین سے جس قدر بڑا نظر آتا ہے
زہرہ سے قریب وہ چند (۹ - ۱۶۹) بڑا نظر آتا ہے (شکل ۱۲د) اور حرارت
بھی اوسی مناسبت سے داخل ہوتی ہے۔ نصف زہرہ پر باشندون کو آفتاب
متحرک نہین نظر آتا۔ اور نصف دیگر پر آفتاب ہی نہین نظر آتا صرف ستارے۔
۷ر۲۲۴ دن مین ایک مرتبہ دورہ کرتے ہین۔ اس لئے اگر زہرہ مین حیوانات
و نباتات ہون تو وہ کرۂ زمین کے حیوانات و نباتات کیسے نہین ہو سکتے۔ زہرہ کا
حجم کرۂ زمین کے حجم سے کچھ چھوٹا ہے یعنی کرۂ زمین کا قطر ۷۹۱۸ میل ہے۔ اور
زہرہ کا قطر ۷۷۰۰ میل اس کی کثافت متناسبہ بمقابلہ کرۂ زمین ۸۵ر ہے
بمقابل آب کشیدہ ۸۵ر۴ ہے۔ مدار پر حرکت فی ثانیہ ۲۲ میل کے قریب ہے
لیکن چونکہ اس کا قطر ۷۷۰۰ میل ہے اس لئے اپنے قطر کے برابر فاصلہ طے کرنے
مین اسکو ۵ منٹ ۵ ثانیہ لگ جاتے ہین۔ اس لئے عطارد کے مقابلہ مین چار چند
سُست کہنا چاہیئے یا کہ چار میل فی گھنٹہ چلنے والا ایک فٹ موٹا آدمی زہرہ سے
(۲۰۵۹) چند تیز چلتا ہے۔ عطارد کی طرح زہرہ کے ساتھ کوئی قمر ابھی تک دریافت نہین ہوا۔

کرۂ زمین

زمین کا بیان عموماً اس قسم کے بیان کے ساتھ نہین کیا جاتا۔ لیکن اس موقع پر کرۂ زمین کا صرف اس قدر بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہون کہ جس قدر بہ حیثیت رکن نظام شمسی لازمی ہے۔ آفتاب سے کرۂ زمین کے فاصلہ کا ذکر آفتاب کے بیان مین آچکا ہے۔ اسکا قطر قطبین کے جانب ۷۹۰۰ میل اور خط استوار کے جانب ۷۹۲۶ میل ہے۔ آفتاب کے گرد کرۂ زمین ۳۶۵٫۲۶ دن مین گھوم آتا ہے اور اپنے محور پر ۲۳ گھنٹہ ۵۶ دقیقہ ۴ ثانیہ مین ایک مرتبہ گھوم آتا ہے۔ اس کی رفتار مدار پر قریب ۱۹ میل فی ثانیہ ہے۔ یعنی اپنی قطر کے برابر فاصلہ طے کرنے مین اُسے چھ دقیقہ ۲ ثانیہ لگتے ہین یا چار میل فی گھنٹہ چلنے والا ایک فٹ موٹا آدمی کرۂ زمین سے ۳۵۴۴ چند تیز چلتا ہے۔ اس کے محور اور سطح مدار مین ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ کا میل ہے۔ اس لئے آفتاب کبھی خط استوار سے ½ ۲۳ درجہ شمال اور کبھی اسی قدر جنوب کی جانب طلوع و غروب ہوتے نظر آتا ہے۔ کسی زمانے مین کرۂ زمین مین اس قدر حرارت تھی کہ حیوانات کے بود و باش کے قابل نہ تھا۔ اب بھی اندر حرارت موجود ہے گاہے گاہے کوہ آتش فشان سے پگھلا ہوا مادہ نکلتا ہے۔ کوئی ایسا زمانہ آوے گا جبکہ یہ سیارہ سرد ہوکر انسان و حیوان کے زندگی کے قابل نہ رہیگا۔ خیر اُسوقت دیکھا جائیگا۔ ابھی چند کروڑ سال تک اس قسم کے تبدیلی کی امید نہین۔ اس کی کثافت متناسبہ ۵٫۵۸ ہے۔

قمر

جوکہ مرکز کرۂ زمین سے دو لاکھ اونتالیس ہزار میل (۲۳۹۰۰۰) کے فاصلہ پر

۲۷،۳۲۲ دنون مین دوره کرتا ہے۔ قمر مین روشنی نہین۔ آفتاب کی روشنی
اوس پر منعکس ہوکر ہمکو نظر آتی ہے۔ یہ ایک بہت چھوٹا کرہ ہے۔ اس کا قطر
صرف ۲۱۶۰ میل ہے اور اس کی کثافت متناسب ۳،۵ ہے یا کرۂ زمین کے
مقابلہ مین ۰،۶۲ چند کثافت ہے۔ نزدیکی کی وجہ سے دوربین سے صاف نظر
آتا ہے کہ کسی زمانہ مین قمر مین بڑے بڑے کوہ آتش فشان تھے اب سرد ہو گئے
ہین۔ اون کے بلند پہاڑون کا سایہ صاف نظر آتا ہے انہین سایون کو کوئی بڑھیا
کے چرخا کاتنے کے شکل مین کوئی ہرن کی شکل مین کوئی کسی شکل مین دیکھتے ہین
اس کی قربت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کا قرص قریب قریب آفتاب کے قرص
کے برابر نظر آتا ہے۔ جب قمر ہمارے اور آفتاب کے درمیان آجاتا ہے تو اسے
آفتاب کا گہن کہتے ہین۔ چونکہ آفتاب کے سامنے کرۂ زمین ہے اس لئے کرۂ
زمین کا سایہ پڑنا لازمی ہے۔ کبھی قمر اس سایہ مین آجاتا ہے اور آفتاب کے
شعاع اس پر نہین پڑتے تو اسے چاند کا گہن کہتے ہین۔ چاند چونکہ شکل بیضوی مین
زمین کے گرد حرکت کرتا ہے۔ اس لئے کبھی قریب جاتا ہے کبھی دور چلا جاتا ہے
اس لئے اس کا قرص بھی کبھی چھوٹا نظر آتا ہے کبھی بڑا۔ کرۂ زمین سے سب سے
کم فاصلہ دو لاکھ اکیس ہزار میل ۲۲۱۰۰۰ اور سب سے زیادہ فاصلہ
۲۵۳۰۰۰ میل ممکن ہے۔ خالی آنکھ سے ہم کو جتنے اجرام فلکی نظر آتے ہین ان مین
قمر سب سے چھوٹا ہے۔ اگر کرۂ زمین کو توڑ کر اس کے پچاس مساوی حصے کئے
جاوین تو ہر ایک حصہ قمر کے برابر ہوگا۔ لیکن وزن مین کرۂ زمین اسی (۸۰) قمر کے
مساوی ہے۔ حکیمون نے چاند کی روشنی کا (عکس کا۔ کیونکہ اصلی روشنی ہے ہی
نہین) یہی حساب لگایا ہے۔ جب کرہ باد مین گرد و غبار نہو یا ابر نہو تو چودھوین
رات کے چاند مین جتنی روشنی نظر آتی ہے اگر اس کا آفتاب کے روشنی سے مقابلہ

کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معمولی دہوپ چہ لاکہ پورے چاند کے روشنی کے مساوی ہے یا کہ اگر صاف شفاف کرۂ باد ہوا اور آسمان پر چہ لاکہ پورے چاند ہون تو ایسی روشنی ہوگی جیسی کہ دن کے وقت ہوتی ہے ۔

باقی آیندہ

"جبل مروہ"

اور

قرآن مجید کا ایک جدید معجزہ

از مولانا مناظر الحسن صاحب

صفا و مروہ سرزمین حرم کی دو مشہور پہاڑیاں ہین۔ عہد قدیم یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اس پر حج کے مخصوص نسک ادا کئے جاتے ہین حجاج ان دونو کے درمیان سعی کرتے اور ان پر خداوند قدوس کی یکتائی و تقدیس کا اقرار و اعلان کرتے ہین،

عرب جب جہالت کی تاریکیون مین مبتلا ہوا تو جاہل بت پرستون نے ان مقدس پہاڑیون پر، دو بت نصب کر دئے۔ صفا پر اساف دیوتا اور مروہ پر نائلہ دیوی کے بت تھے۔ جاہلیت مین دستور تھا کہ ان پہاڑون کے درمیان سعی کرنے والا ان بتون کو چہوتا۔ اور ان سے برکت حاصل کرتا تھا۔

حتیٰ کہ ابوقبیس کے دامن سے اسلام کا مہرہ درخشان چہرہ افروز ہوا، جس کی تیز و نوربار شعاعون نے گمراہیون کے سیاہ بادلون کی دھجیان اڑا دین،

صحرائے ابراہیم مین پھر توحید کا پرچم لہرانے لگا ، امت مسلمہ نے چہرہ سے نقاب الٹا اورجہان بھوت وجن ، دیوی ، دیوتا کی عبادتین جاری تھین اس زمین کو اپنی توحیدی مسجدون سے پاک کردیا ان کی تمام عبادتین جن مین عموماً دیوتاؤن کا حصہ ضرور ہوتا تھا محض رب واحد قدیر کے لئے مخصوص ہوگئین ۔

ایسی حالت مین دلون کے اندر یہ شبہ پیدا ہوا کہ صفا ومرواہ کا طواف کہین شرک وگناہ تو نہین کہ وہان کا طواف تواساف ونائلہ کی وجہ سے کیا جاتا تھا جو یقیناً ایک مشرکانہ فعل تھا ۔ قرآن مجید اسی شبہ کا ازالہ کرتا ہے

ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما ومن تطوع خیراً فان اللہ شاکر علیم ؁	صفا ومروہ یقیناً خدا کی ادب گاہین ہین پس جو بیت اللہ کا حج کرے ، یا عمرہ باندھے اس کے لئے کوئی مضائقہ نہین ہے کہ ان دونون پہاڑون کا بھی طواف کرے اور جو شخص کسی نیکی کو انجام دے گا تو اللہ تعالیٰ شاکر اور جاننے والا ہے ۔

اس آیت سے لوگون کی تشفی ہوگئی کہ یہ خیال محض غلط ہے کہ وہ بتون کی عبادتگاہ ہے ، بلکہ دراصل وہ خدا کی پرستش کا مقام ہے ، اس لئے بلا کسی دغدغہ اس کا طواف کرنا چاہئے ۔ اب اس آیت کے بعد خداوند قدوس ارشاد فرماتا ہے ۔

انّ الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون ؁	جو لوگ چھپاتے ہین ہماری ان کھلی ہوئی اور ہدایت کی باتون کو جس مین ہم نے آثار ابد اسکے کہ کتاب مین ان کو بیان کرچکا ہون یہ وہ لوگ ہین کہ خدا ان پر لعنت کرتا ہے ۔ اور

لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہین۔

اس آیت سے، ذیل کے نتائج پیدا ہوتے ہین۔

(۱) کچھ لوگ ایسے ہین کہ خدا کے نشانیون کو اور ہدایتون کو چھپاتے ہین۔

(۲) وہ نشانیان بیان ہوچکی ہین۔

(۳) اس کا تذکرہ خدا نے اپنی کسی کتاب مین کیا ہے۔

مفسرین پریشان ہین کہ وہ کون لوگ ہین جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ اور وہ کونسی باتین تھین جو چھپائی گئین۔ اسی طرح خدا نے اپنی کسی کتاب مین ان کا تذکرہ کیا ہے۔ یہی سوالات ہین۔ جن کے جوابات مختلف مفسرین کی طرف سے مختلف لفظون مین ملتے ہین۔

ابن عباس وقتادہ رضی اللہ تعالی عنہم کا قول یہ ہے کہ یہود و نصارے ہین اور وہ باتین جن کو ان لوگون نے چھپایا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشینگوئیان ہین۔ اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ کتاب سے مراد تورات یا تورات وانجیل دونون ہین۔

لیکن یہان وقت یہ پیدا ہوتی ہے گو بلاشبہ یہود و نصارے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیون مین تحریف کی اسے چھپایا اور یقیناً اس کا تذکرہ تورات مین موجود تھا اور بعض مقامات مین اب بھی اس کا کچھ حصہ ہے مگر اس تذکرہ کو صفا و مروہ سے کیا تعلق۔ کس قدر عجیب ہے کہ ابھی تو صفا و مروہ کا تذکرہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیون کا بیان

شروع ہوگیا ؟ حقیقت یہ ہے کہ نظم قرآنی پر یہ ایک سخت شبہ وارد ہوتا ہے۔ عام مفسرین چونکہ ترتیب آیات سے چندان دلچسپی نہین رکھتے۔ اس لئے بغیر کسی تعرض کے اس مقام سے گذر گئے ہین، اور جن لوگون نے ربط دینے کی کوشش بھی کی ہے، وہ قابل ذکر نہین۔

حال مین کتاب مطابع البرہان علی ان سیدنا اسمعیل ہو القربان" میری نظر سے گذری مصنف کتاب نے ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ایک بسیط بحث کی ہے اور آجکل مین اس کا ترجمہ اردو مین کر رہا ہون مصنف موصوف نے اپنے اس رسالہ مین ایسے جدید اکتشافات درج کئے ہین۔ جن مین پڑھ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خصوصًا ان آیتون کا باہمی ارتباط کچھ اس طرح واضح ہوگیا ہے کہ مین اسے قرآن مجید کا ایک جدید معجزہ، اور صداقت اسلام کی پر روز دلیل سمجھتا ہون،

مصنف ممدوح کا بھی یہی خیال ہے کہ اس آیت کا تعلق یہود و نصاریے سے ہے، اور آئت مین کتاب سے بھی مراد توراۃ ہی ہے۔ لیکن وہ چیز جسکی طرف قرآن مجید نے اس مقام مین اشارہ کیا ہے کہ یہود اسے چھپاتے ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیان نہین ہین۔ بلکہ اس مین ان کی ایک دوسری شرارت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کا تعلق براہ راست انھین پہاڑون سے ہے۔ خداوند تعالی اسی پر تنبیہ کرتا ہے۔ اس مضمون مین مجھے اسوقت صرف اسی قدر دکھانا ہے کہ یہودیون نے کن مخفی کارروائیون اور اندرونی عیاریون کے ذریعہ سے اصل واقعہ پر پردہ ڈالنا چاہا ہے کیونکہ اسی کے بعد ان آیتون کا باہمی ارتباط خود بخود ارباب نظر کے سامنے آجائیگا۔

بات یہ ہے کہ ایک مدت تک خداوند قدوس کی رحمت عامہ عہدہ نبوت پر تھی اسرائیلی کو ہدایت و رشد، مذہب و دینیات کا پہرا یعقوب کی اولادوں میں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا رہا۔ زمانہ دراز تک مصلحین دینی اسی خاندان سے اٹھتے رہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ فضیلت و امتیاز تھا، جیپر اسرائیلیوں کو اپنی سارے جسم اور روح کے ساتھ رب قدیر کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا۔ بجائے تکبر وغرور ناز و شوریدہ سری انکو سزاوار تھا کہ اس امانت الٰہیہ کی پوری پوری حفاظت و اشاعت کرتے، لیکن آہ! کہ اس ناسمجھ قوم نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ خدا کی اس گرانمایہ نعمت کی اس نے سخت بے قدری کی۔ محض خلاف توقع اس امتیاز کو انہوں نے اپنی افتخار و سربلندی، علو، و کبر کا آلہ بنا لیا۔ خدا نے انھیں دنیا کی خدمت کرنے، بنی نوع انسانی کی بھی خواہی کے لئے پیدا کیا تھا مگر بجائے اس کے غیر اسرائیلی قوموں کی انھوں نے تحقیر و تذلیل شروع کی۔ حالانکہ تورات کے احکام و فرامین کو وہ خود پامال کر چکے تھے۔ ان میں آسمانی شریعت کی کوئی نمود موجود نہ تھی۔ لیکن زبان سے اپنی تقدس و اتقا کا دعوے کرتے، اور دوسروں کو ابدی عذابوں کا مستحق قرار دیکران کی اہانت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ علی الخصوص اپنے بنی اعمام یعنی بنی اسمٰعیل سے انھیں خاص عداوت تھی۔ ان بیچاروں کو ابراہیم کی لونڈی کی نسل سے بتا کر اپنی شرافت و فضیلت کے مدعی بنتے تھے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس جذبۂ امتیاز نے آخر میں یہ شکل اختیار کی کہ تورات میں اسمٰعیل علیہ السلام کی جو فضیلتیں مذکور تھیں وہ انپر گراں گذرنے لگیں۔ چونکہ تورات کی تعلیم و تعلم کا سررشتہ انھیں کے ہاتھ تھا۔ اور حسب ضرورت اسمیں عموماً رد و بدل کرتے ہی رہتے تھے اس لئے انہوں نے اسماعیلی فضائل پر بھی جلکر تحریف کی قینچیاں چلا دیں۔ اسرائیلی تحریفات کے اس سلسلہ میں ایک اہم تحریف وہ بھی ہے جس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے ہے۔

مختلف طریقون سے اس بدنیت قوم نے واقعہ کے اصلی چہرہ کو بگاڑنا چاہا۔ مثلاً اصلی توراۃ مین تھا کہ ابراہیم نے اسمعیل کو قربانی کے لیئے پیش کیا۔ انہون نے بجائے اسمعیل کے اسحاق علیہ السلام کا نام داخل کردیا۔ علاوہ تبدیل نام اور بھی جن قرینون سے پتہ چل سکتا تھا کہ یہ نام تحریفی طور پر داخل کیا گیا ہے۔ یہودیون نے اس مین پورا تصرف کیا جس کی پوری تفصیل مولانائے ممدوح کے اصل رسالہ مین ملسکتی ہے۔ مجھے اسوقت اور امور سے بحث نہین ہے بلکہ محض اس تحریف کی قلعی کھولنی منظور ہے۔ جس کے بعد مندرجہ بالا آیتون کا مطلب اور باہمی ربط واضح ہوسکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل مقصود کو شروع کیا جائے عام ناظرین کی آسانی کے لئے پہلے توراۃ کی عبارت کا پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ بائبل مین یہ واقعہ ان لفظون مین مذکور ہے۔

" اس کے بعد یون ہوا کہ خدا نے ابرام کو آزمایا اور اس سے کہا کہ اے ابراہیم وہ بولا تو دیکھ مین حاضر ہون تب اُس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اکلوتے جسے تو پیار کرتا ہے (اسحٰق) کو لے اور زمین موریا مین جا اور اسے وہان پہاڑ پر جو مین تجھے بتاؤن گا سوختنی قربانی کے لئے چڑھا (کتاب پیدایش باب ۲۲) اس عبارت مین علاوہ اسکے کہ بجائے اسمعیل علیہ السلام کے اسحاق علیہ السلام کا نام داخل کیا گیا ہے، جس کی تحقیق مولانا نے اپنے رسالہ مین کی ہے۔ ایک اور لفظ بدلا گیا ہے یعنی خدا کا یہ کہنا کہ زمین موریا مین جا،" اس میں موریا کا لفظ محرف ہے۔

کیونکہ اس مقام پر جو اصلی لفظ تھا۔ اگر یہود اس کو اپنی حقیقی شکل وصورت پر چھوڑ دیتے تو ان کی تحریف کا راز فوراً طشت از بام ہوجاتا۔ جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا بہرحال یہودیون نے بعض خاص مناسبتون سے مدد لیکر اصل لفظ کو بدل دیا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر اس مقام کا پتا دین کہ کہان ہے۔ چونکہ انہون نے

اسحاق علیہ السلام کا نام داخل کیا تھا۔ اس لئے یہ بھی ضرور تھا کہ وہ اس کو ایسے مقام
مین واقع ہونا چاہیئے جس کا تعلق اسحاق علیہ السلام سے ممکن بھی ہو۔

اس سوال کے جواب مین یہودیون نے دعوی کر لیا۔ کہ موریا ہیکل مقدس
اس مقام کا نام ہے۔ جہان پر قربانگاہ ہے۔ تحقیق و تدقیق سے عام لوگون کو کیا
بحث تھی۔ مذہبی پیشواؤن نے کہدیا، اور لوگون نے مان لیا۔

لیکن جب عیسائیون کا دور شروع ہوا تو انہون نے یہودیون کو جھٹلایا، اور
اپنی فضیلت جتانے کے لئے دعوے کر لیا کہ یہ وہان واقع ہے۔ جہان پر
مسیح کو صلیب دی گئی۔

اسوقت تک یہ دونون فرقے اپنے دعوٰن پر قایم و مصر ہین۔ لیکن چونکہ
نفس الامر مین یہ دونون دعوے باطل تھے۔ اس لئے آخر یہ راز کھل کر رہا۔ دوسرون
نے نہین۔ بلکہ خود اسی جماعت کے آئمہ اور سربرآوردہ لوگون نے صاف لفظون مین
اعلان کر دیا کہ دونون جھوٹے ہین۔ اور دونون غلط کہتے ہین۔

جے۔ ڈبلو۔ کولنسز (J. W. Colenso) جو مشہور عیسائی عالم
ہے۔ یہودیون کے دعوے کے متعلق لکھتا ہے، سلیمان (یعنی جنہون نے ہیکل مقدس کو
بنایا) کے زمانے سے لیکر اسوقت تک انبیاء کے جسقدر صحیفے اور گیت ہین سب مین
اس پہاڑ کا نام جس پر ہیکل مقدس واقع ہے صیہون بتایا گیا ہے کہ ان مین کوئی
نہین جو اسکا نام موریا بتاتا ہو،،

اس کے بعد ایک دوسری دلیل بھی اس نے لکھی ہے۔ مین ذرا تشریح
کے ساتھ اسے بیان کرتا ہون۔

اصل یہ ہے کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو قربانی
کے لئے پیش کیا اس کے متعلق تورات مین ایک جملہ یہ بھی ہے "جب ابراہیم نے

اپنی آنکھہ اوٹھاکے اس جگہہ کو (یعنی مقام قربانی کو) دور سے دیکھا،، باب ۲۲ آیت ۵)
اس جملہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مقام قربانی کو بیرسبع سے آنیوالا دور سے دیکھہ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات ہیکل مقدس کی پہاڑ پر کسی طرح صادق نہین آسکتی۔ کیونکہ بیرسبع کی طرف سے ہیکل مقدس کی طرف آنیوالا گویا جانب شرقی سے آرہا ہے۔ کولنزو لکھتا ہے کہ ”۔ اور جانب شرقی سے آنیوالا مسافر ہیکل کو دور سے نہین دیکھہ سکتا۔ بلکہ وہ وادی ہنوم مین جب تک داخل نہ ہوگا ہیکل کے پہاڑ پر اس کی نظر نہین پڑ سکتی۔ اور جب وادی ہنوم مین آجائیگا۔ تو پھر ہیکل کو دور سے نہین بلکہ اوپر سے دیکھے گا ،،
کولنزو اسی دلیل کے درمیان مین لکھتا ہے کہ ” باقی یہودیون کا فقط نام رکھدینا، یہ کوئی دلیل نہین ہوسکتی ،، بہرحال اس کا خیال ہے کہ ،، ابراہیم نے اس مقام کو دور سے دیکھا ،، یہ صفت ہیکل مقدس کے پہاڑ مین نہین پائی جاتی۔ اور اس بنا پر یہودیون کا دعوی غلط معلوم ہوتا ہے۔
اسی طرح ایک دوسرا عالم استانلی یہود و نصارے دونون کے دعوؤن کے متعلق رقم طراز ہے ،،
”ابراہیم علیہ السلام بیرسبع کے خیمون سے صبح کے وقت اس مقام کی طرف چل پڑے ،، جدہر جانیکا انہین خدا نے حکم دیا تھا ،،
اس کے بعد لکھتا ہے ،، اس مقام کے متعلق یہودیون کا یہ کہنا کہ وہ یروشلم کوہ موریا تھا۔ نہایت ہی بعید ہے ،، اور اس سے بہی زیادہ بدترین خیال عیسائیونکا ہے کہ یہ وہ مقام تھا کہ جہان پر قبر مقدس کا کنیسہ ہے۔
ان دونون فرقون کی تکذیب کے بعد ۔ استانلی صاحب نے ایک حملہ بلاوجہ مسلمانون پر کردیا۔ آپ لکھتے ہین کہ ان سب سے دورازکار دعوی مسلمانون کا ہی

کہ وہ اس مقام کو جبل عرفات پر بتاتے ہین ''

مین نہین سمجھتا کہ اسٹانلی صاحب نے مسلمانون کی کس کتاب مین اس دعوے کو پایا - بہرحال جہان تک مجھے علم ہے اسوقت تک کسی مسلمان نے دعوی نہین کیا - اسٹانلی صاحب اس کے بعد اپنی راے ان لفظون مین ارقام فرماتے ہین ،

'' ہمارے نزدیک زیادہ اقرب الی التحقیق یہ ہے کہ اس مقام کو کوہ جریزیم تلاش کیا جائے '' اس دعوے کی ثبوت مین اپنے جو دلیل پیش کی ہے وہ صرف اسقدر ہے -

'' کیونکہ جریزیم کی شکل قربان گاہ کے لیے بہت مناسب وموزون ہے ''

بات یہ ہے کہ دراصل یہ دعوی یہودیون کے فرقہ سماریہ کا ہے - جن سے نصارے بہ نسبت اور یہودیون کے ایک خاص قسم کا حسن ظن رکھتے ہین اسٹانلی صاحب نے بھی مجبور ہوکر اپنی اس حسن ظن کو سامنے رکھکر یہ فیصلہ لکھدیا - ورنہ ہر شخص سمجھہ سکتا ہے کہ کسی مقام کا قربان گاہ کے لئے موزون ہونا کیا اس کی دلیل ہوسکتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسی مقام پر اپنی قربانی پیش کی تھی - بہرکیف ہمکو اسٹانلی کی حسن ظن سے کوئی بحث نہین اور نہ اون کے فیصلہ سے - بلکہ دکھانا یہ ہے کہ یہودیون نے اصل لفظ کو موڑ دیا بنا تو دیا - لیکن یہ نہ بتا سکے کہ مقام ہے کہان پر - اور خدا کا شکر ہے کہ اس معاملہ مین انہون نے جو کارروائی کی تھی اسکو ہم نے نہین بلکہ خود انکے پیشواؤن نے عالم آشکارا کردیا - فالحمد للہ -

اور ان علمار کی تحقیق سے سب سے بڑا فائدہ ہم مسلمانون کو یہ پہونچگیا کہ اصلی لفظ کی تحقیق کے لئے ایک میدان سامنے آگیا - جب یہودیون اور عیسائیونکا

دعوے غلط ثابت ہوا۔ تو اب ہم کو خود ڈھونڈھنا چاہیے۔ کہ یہ مقام کہاں ہے؟ انشاء اللہ اس کے بعد لفظ کی اصلی صورت بھی سامنے آجائے گی۔

توراۃ مین یہ لفظ مختلف مقامات مین پایا جاتا ہے۔ منجملہ اس کے قاضیونکی صحیفہ مین ایک جگہ اس کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے "جب یربعل جدعون ہے ساری جماعت سمیت جو اس کے ساتھ تھے صبح سویرے اٹھا اور حرود کے کنوئین کے پاس خیمے کھڑے۔

اور مدیانیون کا لشکر ان کے اتر طرف کوہ موریا کے متصل وادی مین تھا" باب ۷ آیت ۱)

قاضیون کی اس عبارت سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ موریا مدیانیون کی لشکرگاہ اور پڑاؤ کے پاس واقع ہے۔

اب صرف اتنی بات تحقیق طلب ہے کہ مدیانیون کن لوگونکا نام ہے۔ کہ اسکے بعد خود مقام کی جغرافی تعین ہو جائیگی۔

سیل صاحب جنہون نے قرآن مجید کا انگریزی زبان مین ترجمہ کیا۔ ہے کہتے ہین، ،،کہ مدیان سرزمین حجاز کے اس شہر کا نام تھا، جو کوہ سینا سے جنوب شرق کیطرف بحیرۂ قلزم پر واقع تھا۔ اور بطلیموس نے اپنی جغرافیہ مین جس شہر کا نام مریانہ بتایا ہے یقیناً یہ وہی شہر ہے۔،،

سیل صاحب کی اس تصریح سے معلوم ہو گیا کہ مدیانی عرب ہی کا دوسرا نام ہے اور علاوہ سیل صاحب خود بائبل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے قاضیون ہی مین ہے۔ ،، تب بنی اسرائیل نے جدعون کو کہا کہ تو ہم پر حکومت کر تو اور تیرا بیٹا۔ اور تیرا پوتا بھی، کیونکہ تو نے ہمین مدیان کے ہاتھ سے چھڑایا۔ تب جدعون نے کہا کہ نہ مین، نہ میرا بیٹا، تم پر حکومت کرے گا۔ اور جدعون نے انھین کہا کہ مین تم سے ایک سوال

کرتا ہون اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص تم مین سے اپنی لوٹ کے کرنپھول مجھے دے کہ ان کے کرنپھول سونے کے تھے اس لئے کہ وے اسمعیلی تھے ،، قاضیون باب ۸ آیت ۲۴ تا ۲۶ -

اس عبارت نے واضح کر دیا کہ مدیانی بنی اسمعیل کا نام تھا - بلکہ توراۃ مین اس سے بھی زیادہ تصریح موجود ہے - کتاب پیدایش مین جہان برادران یوسف کا تذکرہ ہے اس مقام کی عبارت یہ ہے -

،، اور دیکھا کہ اسمعیلیون کا ایک قافلہ جلعاد سے گرم مصالح اور روغن بلسان اور مر اونٹون پر لادے ہوئے آتا ہے کہ انھین مصر کو لیجاوین - تب یہودا نے اپنے بھائیون سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مارڈالین اور اوس کا خون چھپاوین تو کیا نفع ہوگا - اور اسے اسمعیلیون کے ہاتھ بیچ ڈالین اور اس پر اپنا ہاتھ نہ ڈالین کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا گوشت ہے - اور اسوقت مدیانی سوداگر ادہر سے گذرے سو انہون نے یوسف کو کھینچکے کنوین سے باہر نکالا - اور اسمعیلیون کے ہاتھ بیس روپیہ کو بیچا، اور وے یوسف کو مصر لائے (پیدایش باب ۳۷ - آیت ۲۵ تا ۲۹ -

باقی آیندہ

شکریہ ہم عالیجناب نواب محمد عمرخان صاحب وفاکا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہین کہ نواب صاحب نے ہماری اپیل پر توجہ فرماکر اپنے طرف سے چار نادار طلبہ کے نام رسالہ جاری فرمایا -

---

سلہ یہ اس کا بدلہ ہے کہ اسرائیلی اسمعیلیون کو کنیزک زادہ کہتے تھے - اللہ تعالی نے اونکے ہاتھ یوسف علیہ السلام کو بکوایا -

خطبۂ صدارت

ذیل مین خطبۂ صدارت جناب مولوی مرزا مہدی خانصاحب کوکب اے آر ۔ایس
یم ۔یم ۔آر ۔اے ۔ایس ۔ایف ۔جی ۔ایس ۔درج کیا جاتا ہے جس کو صاحب مذکور نے
انجمن طلبہ دارالعلوم کے سالانہ جلسہ مین دیا تھا ۔خطبۂ ہذا بہت سے مفید معلومات
اور نصایح پر مشتمل ہے ۔

معزز اعضائے انجمن و طلباب مدرسہ دارالعلوم و حضار مجلس ـ اول مین اجزائے جلسہ
اور حامیان تعلیم کا شکریہ ادا کرتا ہون جنھون نے آج مجھے صدارت جلسہ کا شرف بخشا ہے
اور بلا تمہید مقدمہ اپنی تقریر شروع کرتا ہون ۔ یہ بات مخفی نہین کہ مدرسہ دارالعلوم اس
سرکار ابد قرار مین وہ پہلا مدرسہ ہے جس نے دائرہ تعلیم کی توسیع مین مرکز کا کام دیا ۔اور
اور جملہ علمی تحریکات کی شعاعین اسی نورافشان مرکز سے ہر طرف پھیل کر پرتوافگن ہوئین ۔
مجھے اس سے دلچسپی کی ایک خاص وجہ ہے ۔ شاید ۱۲۸۳ھ یا ۱۲۸۴ھ تھا ۔جبکہ
میرے والد مرحوم نے جبکہ وہ نواب سر سالار جنگ مرحوم اول کے معتمد پیشی اور تعلیمات
کے پہلے معتمد تھے ۔اس کی ترقی کے طرف بہت سعی و کوشش کے ساتھ توجہ کی ۔مجھے
اس قدر تو یاد ہے کہ جب اونھون نے اس مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ مین لیا تو اسکا
ماہانہ خرچ تقریباً ستراسو روپئے تھا ۔اور رجب ۱۲۸۸ھ مین انکا انتقال ہوا تو اس کا
خرچ چھ ہزار روپیے ہوگیا تھا ۔ مین فقط اپنے حافظہ کے بھروسہ پر عرض کرتا ہون
کیونکہ میرا سن اوسوقت اٹھارہ یا انیس سے زیادہ نہ تھا ۔شاید ان اعداد مین کوئی غلطی
ہو ۔مگر اسمین کوئی شک نہین کہ اس کے مصارف انکی پانچسال کی معتمدی کے زمانہ مین
پانچ گنے ہوگئے تھے ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسٹر کیری مدرس انگریزی کے بعد مسٹر شافر مدرس اول انگریزی

مقرر ہوئے۔ اور صیغۂ عربی مین مولوی سید وجہ الدین صاحب جیسے فاضل و عالم کا انتخاب ہوا۔ مولوی محمد حنیف صاحب بھی منجملہ اساتذۂ عربی کے ایک مدرس تھے اور علم تجوید یعنی قرائت کے لیئے ایک نئی جائداد نکالکر مولوی میر حیدر علی صاحب مرحوم کا اس پر تقرر ہوا۔ اور اسی زمانہ مین مولوی حافظ صدر الاسلام خان مرحوم نواب افتخار الملک بہادر صدر المہام متفرقات کے معتمد مقرر ہوئے۔

نواب سر سالار جنگ مرحوم اول نے بہت سے لایق افراد بیرون ملک سے بلواکر اس ملک کے نونہالون کی تربیت کے لئے مقرر فرمایا۔ جس کا نتیجہ آج ہم مشاہدہ کرتے ہین کہ کیسے کیسے لایق افراد اس مدرسہ سے نکلکر اپنی عمر کو سرکار کی خیرخواہی مین صرف کیا۔ اگر اس وزیر باتدبیر کے مقرر کردہ اصول پر کام چلتا تو آج ہماری علمی اور اقتصادی حیثیت کچھ اور ہی ہوجاتی۔

یہ انکی دور اندیشی اور پیش بینی تھی کہ انگریزی تعلیم بھی اسی مدرسہ مین آغاز ہوئی جو آج اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ لوگ ہمہ تن اس کی طرف جھک پڑے ہین۔ لیکن اس مدرسہ مین جو بنیاد عربی و فارسی کی پڑی تھی اس سے صدہا طلباء فیض یاب ہوئے۔ اور تعلیم و تعلم کی جو کساد بازاری اسوقت تھی۔ اب بفضل خدا اور ہماری سرکار کی فیاضی سے دور ہوگئی ہے۔ مگر اب تک جو تعلیم کا اصلی مقصود ہے حسب دلخواہ حاصل نہین ہوا ہے۔ اس مین فقط سرکاری امداد سے کام چل نہین سکتا ہے۔ اور اہل ملک کو چاہیئے کہ علم کی قدر کرین اور سرکار کا ہاتھ بٹائین اور خود بھی ہر قسم کی امداد سے دریغ نکرین۔ ایک ہاتھ سے تالی نہین بج سکتی ہے۔ بقول شاعر۔

تاکہ از جانب معشوق نباشد کششے — کوشش عاشق بیچارہ بجائی نرسد

ہم کو تعاون یعنی باہمی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کی مدد کے لیئے صمیم قلب سے آمادہ نہو جائین ترقی و کامیابی کی امید نہین کیجا سکتی ہے۔

افسوس ہے کہ لوگون نے تعلیم کے مقصد کو صرف حصول ملازمت خیال کرلیا ہے اور محض علم کے لیئے علم کو حاصل نہین کرتے ہین - اور جب اس مین انھین کامیابی نہین ہوتی ہے تو اظہار ناراضی کرتے ہین - لیکن سرکاری ملازمت کا دائرہ نہایت محدود ہے - باوجود اس کے بھی اگر پچاس سال کو قبل کے دفاتر کے عملہ کی تعداد کا اسوقت کے اعداد کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو اس سے دہ چند اضافہ ہو گیا ہے نئے دفاتر اور نئے سررشتے قایم ہوئے ہین - اور اہل ملک برابر ملازم ہوتے رہتے ہین - مگر یہ ایک محدود موقع ہے - لوگون کو چاہیئے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے آبائی پیشیون کی طرف متوجہ ہون اور انھین ترقی دین -

زمینداروں - جاگیرداروں اور مرفہ الحال زراعت پیشہ لوگون کو چاہیئے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد اصول زراعت و فلاحت کی طرف متوجہ ہون - مواشی کی ترقی اور انکی نگہداشت کو اپنی وجہ معیشت گردانین - جب اس کے فوائد ظاہر ہونے لگین گے تو عام رعایا بھی انکی تقلید کرے گی - اور ملک مین مرفہ الحالی عام ہو جائے گی -

یا انجنیرنگ کو لیجیے جس سے علاوہ ملازمت سرکاری کے کتنے لوگ گتہ لیکر یا اور سیڑہی سے اپنی وجہ معاش مہیا کر سکین گے - اسی طرح سے صیغۂ طبابت کو لیجیے جو اس ملک مین ڈاکٹری اور یونانی اور دیدک طریقون پر مشتمل ہے - اس ایک صیغہ مین توسیع اور تحصیل معاش کی بہت کچہ گنجایش ہے - چنانچہ گذشتہ انفلوئنزا نے اطبا کی کمی کا حال بخوبی ظاہر کردیا - صنعت و حرفت کا میدان اسقدر وسیع اور اسقدر پرمنفعت ہے کہ اس مین ہزارون مصروف اور مستفید ہو سکتے ہین - لیکن ان سب مین ابتدائی تعلیم ٹھیک ہونی چاہیئے کہ وہ بنیاد ہے - جب بنیاد مستحکم ہو گی تو اوپر کی عمارت بھی مستحکم ہو گی - از بنائے خانہ باید دید استحکام را -

مین نے اپنے استاد پروفیسر ہکسلی کے ایک لکچر مین سنا کہ فرماتے تھے -

(ہم یعنی معلمین) لوگوں کو ابتداءِ علم کے الف با کی تعلیم دیتے ہین - اور انکی اصلی تعلیم دنیا کی یونیورسٹی مین ہوتی ہے - جہان اپنے تجربہ سے کام کرنا ہوگا - اس یونیورسٹی مین اگر کوئی کامیاب ہوا تو ہمیشہ کے لئے کامیاب رہیگا - اور اگر ایک وقت فیل ہوگیا تو پھر اس کی کامیابی کی کوئی امید نہین وہ ہمیشہ کے لئے فیل رہے گا"

یہ مقولہ بالکل صحیح ہے - اس مین اعتراض کی مطلق گنجایش نہین - پس چاہیئے کہ ہم اپنی ابتدائی تعلیم کے مدارج کو نہایت تندہی سے طے کرلین - اور اپنے آبائی پیشہ کی طرف یا ایسے مضامین کی طرف متوجہ ہوجائین جنکی طرف طبیعت راغب ومایل ہے کیونکہ کامیابی اسی مین ہے - یہ بات یاد رہے کہ کوئی پیشہ ذلیل نہین ہے - اور ذلیل وہ پیشہ ہے جس مین خوشامد کرنی پڑتی ہے -

تعلیم کے لئے عمدہ معلمون کا ہونا لازمی ہے - اگر معلمون کی تنخواہین بیش قرار نہون تو اقل درجہ اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ مرفہ الحالی اور فراغ بالی کے ساتھ اپنا پورا وقت تعلیم مین صرف کرسکین - اور اون کا وقعت بھی قایم رہ سکے سچ ہے کہ علما وحکما سے سابق تعلیم کی اجرت نہین لیتے تھے - لیکن ان کے لئے وظایف مقرر تھے - لیکن اب وہ زمانہ نہین - ان کے لئے مثل سایرین کے وجہ معیشت کی طرف سے آسایش وآرام کا ملنا لازمی ہے - اور بقول سعدی علیہ الرحمہ -

شب چو عقد نماز بر بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

انکے دماغ کو پریشان کردیگا -

حامیان انجمن کا ہم سب کو بلکہ تمام ملک کو شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھون نے تعلیم کی طرف توجہ مبذول فرماکر ملک مین ایک ہیجان پیدا کردیا ہے - جس سے آیندہ بہت عمدہ نتایج ظاہر ہونگے جو اصول سرکار کو مشورہ دینے کا اختیار کیا گیا ہے

اس سے سرکار بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کیونکہ جس طرح سے یہ لوگ وقت اور ضرورت وقت کا احساس کرتے ہین ارباب حل وعقد تعلیمات کو وہ باتین کم سوجھتی ہین۔ اسی لئے دنشادرهم فی الامر کا حکم ہمیشہ کے لئے قابل تعمیل رہیگا۔

یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ فی زمانا ہذا معتمدی تعلیمات پر مسٹر حیدری صاحب جیسے علم دوست اور راس مسعود صاحب جیسے ناظم۔ جن کی رگ رگ ریشے ریشے مین تعلیم کا مادہ اور جن کی خمیر مین تعلیم کا مایہ موجود ہے زمام تعلیم کو ہاتھ مین لئے ہوئے ہین۔ اور یہ ایک فال نیک ہے۔ جس سے امید کیجاتی ہے کہ جو تحریکین اس انجمن کی طرف سے ان کے پاس وقتاً فوقتاً پیش کیجائین وہ ان پر غور و خوض کرین۔ اور سرکار مین پیش کرکے ان کے اجرا کی منظوری حاصل کرین۔ مگر ہم کو محض ان کے بھروسہ پر بیٹھنا نچاہیئے بلکہ اپنی کوشش کو بھی جاری رکھین اور انکا اور سرکار کا ہاتھ بٹانا چاہیئے کیونکہ جو کام متفقہ کوشش سے ہوتا ہے وہ منفرداً کرنے سے کامیابی کی صورت سے محروم رہتا ہے۔

ہمارے ہمسایہ ریاست میسور مین۔ جو اس کی نصف بھی نہین۔ تعلیم کی حالت ملاحظہ فرمائین تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ باوجود ہماری سرکار کی فیاضی کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے جس قسم کے افراد کی ضرورت ہے وہ یہان مفقود ہین۔ باہر سے جو اشخاص بلوائے گئے ہین ان مین شاذو نادر ایسے لوگ ہین جن مین اس ملک کی تعلیم مین ترقی دینے کا عمدہ تجربہ یا سلیقہ ہو۔ ہم کو چاہیئے کہ جاپان کا طریقہ اختیار کرین۔ جہان خصوصاً تعلیم صنائع و حرفت کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ خاص فنون و صنائع کی تعلیم کے لئے یورپ و امریکہ سے مستند ماہرین فن بیش قرار تنخواہ پر بلائے گئے۔

بدین شرط کہ چار یا پانچ سال مین بحیثیت مناسبت فن یا صنعت وہ اپنے شاگردون کو اس طرح اوس کام سے واقف کر دینگے کہ اس کے بعد ان استادون کی محتاجی نہ رہے۔ اور خود ان کامون کو چلا سکین اور اپنی تعلیم دیسکین۔ اور ان کی تنخواہ کا ثلث بطور گرو کار امانت رکھا گیا۔ طرفہ یہ کہ بعد مدت معینہ کسی استاد کی ثلث تنخواہ قابل ضبطی نہ ہی۔ اور سب نے بخوشی اپنے فرائض کو انجام دیا اور انعام پایا۔ بعضون کو باضافہ تنخواہ وہین رکھ لیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی طالب العلم بھی اسی شوق و انہاک سے تحصیل مین مصروف رہے اور خود ماہر فن بنگئے مگر اس کا راز یہ تھا کہ ان ماہرین کا انتخاب متدین اور وطن پرست اشخاص کے سپرد تھا۔ اور شرائط کی پابندی مین ارباب حل و عقد نے کسیطرح کی سفارش یا رعایت کا لحاظ نہین کیا۔ اگر میرے الفاظ پر غور فرمایئن تو معلوم ہوگا کہ مین کیا عرض کر رہا ہون۔ سفارش سے ھی خرابیان پیدا ہوتی ہین۔

نصاب اور طرز و طریقہ تعلیم مین بہت کچھ ترمیم کی جگہ ہے اگر ہم اسی طریقہ کو جو بنام نیشنل ایجوکیشن مشہور ہو رہا ہے اور جس کی بنیاد سالگذشتہ مدارس مین ڈالی گئی اور بنگالہ مین بھی اس کی تقلید شروع ہو گئی ہے اگر بحیثیت مناسبت ملک کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہان بھی جاری کیا جائے تو بہت کچھ ترقی و کامیابی کی امید ہے۔ تعلیم اور طریقہ تعلیم مین۔ مثل دوسری سب چیزون کے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس زمانہ مین انگلستان مین بھی ترمیم کی روح پھینکنے کے ساتھ ردوبدل مین الجھی ہوئی ہے۔ اور پرانے طرز تعلیم کو قابل ترمیم خیال کیا جارہا ہے۔ غرض تضیع وقت کا بہت زیادہ خیال پیش نظر ہے۔ جس سرعت کے ساتھ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ اگر ہم اس کے ہمقدم

نہو سکیں تو بیشک اس میدان مین پیچھے رہ جائین گے۔ ہمارے ہندو بھائیون نے اس امر کو بھانپ لیا اور ہندو یونیورسٹی قایم ہوگئی اور نہایت تیزی کے ساتھ اوس کا کام چل رہا ہے۔ افسوس ہے کہ علیگڈہ مین یونیورسٹی کا خیال اوس سے قبل پیدا ہوا تھا۔ مگر وہ ابتک کل مقصود سے اپنا دامن خالی دیکھ رہے ہین۔ ہم کو اپنے ہندو بھائیون کی تقلید کرنے مین کوئی شرم نہین کرنی چاہیئے۔

نصاب تعلیم مین صنعت وحرفت کا شریک ہونا نہایت اہم ہے۔ اکثر طبایع کو اس طرف ایک طبعی رغبت ہے۔ اگر سرکار اس طرف اس سے زیادہ توجہ فرمائی اور اپنی خسروانہ فیاضی کو ہماری ترقی کے لئے زیادہ کردے تو اس سے بہت سے علم کے پیاسے یہان سے سیراب ہونگے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف کامون اور پیشون کی تعلیم سے مختلف طبقات رعایا کے لئے اقسام کے ذرایع معاش پیدا ہونگے۔ جس سے رعایا اور عموماً ناس مین قناعت کا مادہ پیدا ہوگا اور امنیت عامہ ہمیشہ قایم رہے گی۔ ہمارے ابناے وطن مین ہر قسم کی تعلیم کا مادہ موجود ہے۔ اسی مدرسہ دارالعلوم سے کیسے کیسے افراد مدبر و لایق پیدا ہوئے۔ جو باہر والون سے کسی طرح میزان لیاقت وکارروائی مین کم نہ تھے۔ جوہر سب مین موجود تھا مگر جب ان کو موقع ملا وہ جوہر خود بخود ظاہر ہوگئے۔ تربیت و تعلیم بھی وہ اکسیر ہے جو انسان کے جوہر کو چمکا دیتی ہے۔

جرمنی مین ابتدائی تعلیم کے بعد یا ساتھ ہی ساتھ طالب علمون کے آبائی پیشونکی تعلیم دیجاتی ہے۔ بعد تعلیم ابتدائی اگر کسی کو کسی خاص شعبہ علم یا فن سے دلچسپی ہوتی ہے تو وہ خود اوسے سیکھتا ہے۔ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد

ان کو اپنے آبائی پیشہ مین مصروف ہونے سے کوئی عار نہین۔ اگر کوئی موقع اتفاقی ملگیا تو وہ کسی مطلوبہ کام مین مصروف ہوجاتا ہے۔ مین ایک مثال پیش کرتا ہون جس سے مین خوب واقف ہون۔ تقریباً بیس سال قبل گورنر صاحب بمبئی کا بینڈ ماسٹر مرگیا اوس کی جگہ کے لیے اشتہار دیا گیا کہ اگر ہندوستان مین کوئی ماہر فن موسیقی ملجائے تو پھر ولایت سے بلوانے کی ضرورت نہ ہے۔ تنخواہ چھ سو روپئے تھی۔ بمبئی مین کوئی نہ ملا۔ لیکن سکندرآباد مین بدیم پیل کمپنی کی دوکان مین ایک درزی کا مددگار جو لباس کے کترنے مین ماہر تھا اور دو سو روپئے ماہوار پاتا تھا اور جرمن تھا۔ اس نے اشتہار دیکھتے ہی اپنا ڈپلوما (سند) جو ڈاکٹر آف موزیک کا تھا اپنی درخواست کے ساتھ بمبئی بھیجدیا اور فوراً مامور کر لیا گیا۔ یہ کیا تھا؟ اس نے اپنے آبائی پیشہ خیاطی کے علاوہ موسیقی مین اعلے ڈگری حاصل کی تھی جو ایم۔ اے کی ہم درجہ ہے موقع ملتے ہی اس نے اپنی سند پیش کی اور کامیاب ہوگیا۔ میری غرض یہ ہے کہ کوئی پیشہ معیوب نہین۔ کمال ہر چیز مین حاصل ہوسکتا ہے۔ علم کو یا تو شوق و رغبت قلبی سے سیکھنا چاہیے یعنی محض علم کی غرض سے یا تحصیل معاش کے لئے مقدم الذکر اولی مستحسن ہے اور ایسے لوگون کو موقع مل ہی جاتا ہے۔ جہان وہ اپنے جوہر دکھاتے ہین اور اون کو کمال بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ انکی شوق کی چیز بنجاتا ہے جس مین کمال کا حاصل ہونا لازمی ہے۔

باقی آیندہ